ڈاکٹر عارف صدیقی میرے ایک مہربان ہیں' ڈاکٹر صاحب مینجمنٹ کورسز کراتے ہیں اور زندگی کامیابی اور ترقی پر لیکچر دیتے ہیں اور مجھے اکثر اوقات شاندار فقرے' محاورے اور کوٹیشنز ایس ایم ایس کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چند روز قبل مجھے اپنی کتاب بھجوائی' میں اس کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا تو مجھے اس میں ایک دلچسپ حکایت نظر آئی اور میں بڑی دیر تک اس حکایت کو انجوائے کرتا رہا۔ حکایت کچھ یوں تھی افریقہ کے کسی جنگل میں ایک بوڑھا شیر کسی ہرن کے پیچھے لپکا' ہرن نے شیر دیکھا تو وہ سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا' شیر ہرن کے پیچھے تھا اور ہرن شیر کے آگے' اس بھاگ دوڑ کے دوران ہرن نے کلانچ بھری اور شیر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا' شیر اس ناکامی پر مغموم ہو گیا اور آہستہ آہستہ اپنے کچھار کی طرف واپس چل پڑا' ایک نوجوان شیر چٹان پر کھڑا ہو کر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا' جب بوڑھا شیر چٹان کے قریب پہنچا تو جوان شیر نے طنزیہ قہقہہ لگایا اور بوڑھے شیر کو مخاطب کر کے بولا" چچا حضور آپ بوڑھے ہو چکے ہیں' آپ اب یہ بھاگ دوڑ بند کر دیں اور کسی غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کریں" بوڑھے شیر نے اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھا' جھرجھری لے کر اپنے لمبے بال جھٹکے اور نرم آواز میں بولا "یہ دو جانوروں کے درمیان مقابلہ نہیں تھا اور یہ ہرن کی فتح اور میری شکست بھی نہیں تھی' یہ دراصل دو مقاصد کا مقابلہ تھا' میں بھوک مٹانے کیلئے ہرن کے پیچھے بھاگ رہا تھا جبکہ ہرن اپنی جان بچانے کیلئے دوڑ رہا تھا' اس کا مقصد میرے مقصد سے بڑا تھا چنانچہ وہ جیت گیا اور میں ہار گیا" ڈاکٹر صاحب نے یہ مثال مینجمنٹ کی سائنس کو سامنے رکھتے ہوئے دی تھی اور ان کا مقصد شیر اور ہرن کے مقاصد کو "ایڈینٹی فائی" کر کے یہ بتانا تھا کہ زندگی میں صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے مقصد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

کامیابی اور ناکامی کیا ہے؟ یہ سوال اس وقت انسان کے ذہن میں اٹھا تھا جب وہ سردی اور گرمی سے بچنے کیلئے جسم پر پتے باندھتا تھا' کچا گوشت کھاتا تھا اور اس کے اور جانوروں کے لیونگ سٹینڈرڈ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ انسان پی فور کمپیوٹر کھول کر بیٹھا ہے' وہ موبائل کی ٹچ سکرین پر انگلی سے دنیا جہاں کی اطلاعات تک پہنچ جاتا ہے' وہ آنکھ سے انسانی بدن کے اندر چھپے راز جان لیتا ہے اور وہ احتیاطاً آب زم زم تک کو ابال کر پینے کی کوشش کرتا ہے' غار کے انسان نے کمپیوٹر ایج تک پہنچنے کیلئے بے تحاشا سفر طے کیا اور اس سفر کے دوران اسے اپنے زیادہ تر سوالوں کا جواب مل گیا لیکن اس کا ایک سوال آج تک جواب کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور یہ سوال ہے "کامیابی اور ناکامی کیا ہے" انسان آج تک اس کا کوئی حتمی جواب تلاش نہیں کر سکا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ کامیابی اور ناکامی کے معیار بدل جاتے ہیں' کبھی انسانی تمدن میں طاقتور انسان کو کامیاب سمجھا جاتا تھا' جو شخص دس بیس لوگوں سے تنہا لڑ سکتا تھا اور جو پورے قبیلے پر اپنی طاقت کی دھاک بٹھا دیتا تھا وہ کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ کبھی جس شخص کے پاس زیادہ جانور ہوتے تھے' جو زیادہ زمین جائیداد اور مال و دولت کا مالک ہوتا تھا وہ کامیاب تصور کیا جاتا تھا اور کبھی وہ لوگ کامیاب سمجھے جاتے تھے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بے وقوف بنا لیتے تھے یا جو وقت کی بہترین چیزوں' اجناس' عورتوں اور غلاموں پر قابض ہو جاتے تھے' کبھی علم' دانش اور عقل کامیابی کا معیار بن جاتی تھی' لوگ کبھی فرعون کو کامیاب سمجھتے تھے اور کبھی کامیابی کا پلڑا حضرت موسیٰؑ کی طرف جھک جاتا تھا' کبھی عزیز مصر کامیاب ٹھہرایا جاتا تھا اور کبھی حضرت یوسفؑ کو کامیاب سمجھا جاتا تھا' کبھی سینٹ پیٹر کو کامیاب سمجھا جاتا تھا اور کبھی دنیا بل گیٹس کو وکٹری سٹینڈ پر کھڑا کر دیتی تھی چنانچہ انسان معاشرت کے مختلف ادوار میں کامیابی اور ناکامی کے معیاروں کے بارے میں کنفیوژن کا شکار رہا' شکار ہے اور شائد شکار رہے گا کیونکہ وقت کے ہر دور کا ایک معیار کامیابی ہوتا ہے اور معاشرے کے ہر طبقے' ہر نظریے اور ہر کمیونٹی کی کامیابی اور ناکامی کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے اور یہ معیار بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی کامیابی کا ایک معیار تھا اور ان کے مزار کے متولیوں کا دوسرا معیار ہے' حضرت داتا گنج بخشؒ' حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ اور حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ جس چیز کو کامیابی کہتے تھے آج وہ کامیابی ان کے گدی نشینوں کی نظر میں زمینی حقائق سے منافی ہے لہٰذا کہنے کا مطلب ہے انسان آج تک کامیابی اور ناکامی کا کوئی متفقہ لائحہ عمل' فارمولہ یا پالیسی طے نہیں کر سکا لیکن اس حقیقت کے باوجود ڈاکٹر عارف صدیقی کی بات درست ہے جب تک کوئی انسان اپنا مقصد طے نہیں کرتا وہ کامیابی کی لذت سے محروم رہتا ہے لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا انسان اپنا مقصد طے کر سکتا ہے؟ اور اگر کر سکتا ہے تو وہ کیسے کر سکتا ہے؟۔

آپ کیلئے شاید یہ بات حیران کن ہو گی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ ایسی صلاحیتیں دی ہیں جن سے دوسرے

جانداروں کی اکثریت محروم ہے' ان پانچ چیزوں میں پہلے نمبر پر ابلاغ ہے' انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خیالات' احساسات' نظریات' افکار' حالات اور سوچ کو دوسروں تک منتقل کرنے کا آرٹ دیا ہے انسان کے مقابلے میں دوسری 99 فیصد مخلوقات بھوک' جنس اور خوف کے علاوہ اپنا کوئی احساس دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتیں۔ انسان کی دوسری خوبی منصوبہ بندی ہے' انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو ایک سیکنڈ سے لے کر ہزاروں سال تک کی پلاننگ کر سکتا ہے' اللہ نے یہ خوبی کسی دوسرے جاندار کو نہیں بخشی۔ انسان کی تیسری منفرد خوبی قوت فیصلہ ہے' انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جس کے پاس فیصلے کی غیر محدود قوت ہے جبکہ باقی مخلوقات کی قوت فیصلہ بھوک' جنس اور بقاء سے آگے نہیں بڑھتی۔ انسان کی چوتھی خوبی تبدیلی ہے' انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو اپنے آپ' اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کو بدل سکتا ہے' انسان کو اللہ تعالیٰ نے "چینج" کرنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے اور انسان کی پانچویں منفرد خوبی مزہ ہے' انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو انجوائے کرتا ہے' جو پلیژر فیل کر سکتا ہے۔ دنیا میں صرف تین جاندار ہیں جو جنسی تعلقات کو انجوائے کرتے ہیں' یہ جاندار انسان' بن مانس اور ڈالفن مچھلی ہیں' ان کے علاوہ کوئی جاندار جنس کو بھی انجوائے نہیں کرتا' یہ پانچ خوبیاں جب ایک جگہ جمع ہوتی ہیں تو ان سے ایک نیا احساس جنم لیتا ہے اور اس احساس کو شعور کہا جاتا ہے چنانچہ دنیا کا جو شخص اپنی ان پانچ خوبیوں کو استعمال نہیں کرتا' وہ شخص جو ابلاغ میں مہارت حاصل نہیں کرتا' جو اپنی زندگی اپنے روز و شب کی پلاننگ نہیں کرتا' جو اپنے حالات' اپنی صورتحال تبدیل کرنیکی کوشش نہیں کرتا' جو اپنی زندگی کیلئے بڑے بڑے فیصلے نہیں کرتا اور جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو انجوائے نہیں کرتا وہ باشعور نہیں کہلا سکتا اور اس انسان اور کھونٹے سے بندھی گائے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ہم اب کامیابی کی طرف واپس آتے ہیں' دنیا میں کوئی شخص اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک وہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد طے نہیں کرتا اور مقصد اس وقت تک طے نہیں ہوتا جب تک اسے اپنی ان پانچ خوبیوں کا علم نہیں ہوتا' جو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات میں سے صرف اسے عطا کی ہیں یعنی جب تک انسان کو اپنے احساسات کا ابلاغ نہیں ہوتا' جب تک وہ منصوبہ بندی کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا' جب تک وہ اپنی قوت فیصلہ کو تحریک نہیں دیتا' جب تک اسے اپنی تبدیل کرنے کی صلاحیت کا احساس نہیں ہوتا اور جب تک اسے اپنی انجوائے کرنے کی خوبی کا ادراک نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اپنی زندگی کیلئے کوئی بڑا' اچھا اور مضبوط مقصد طے نہیں کر سکتا اور یہ وہ خامی ہے جس کا ہم سترہ کروڑ لوگ شکار ہیں' ہماری زندگی بے مقصدیت کا شکار ہے اور اس بے مقصدیت کی وجہ قدرت کی عطا کردہ وہ خوبیاں ہیں جن کو ہم نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا جنگل ہے جس میں اگر ہمارے پاس کوئی مقصد نہ ہو تو ہم اپنے سے بڑے کسی جانور کے مقصد کا ایندھن بن جاتے ہیں' دنیا ہمارا سوپ بنا کر پی جاتی ہے اور اس کے بعد مارچ کی دھوپ میں بیٹھ کر اپنی گردن پر خارش کرتی ہے' ڈکار لیتی ہے اور ٹانگیں لمبی کر کے انجوائے کرتی ہے۔ یہ دنیا ایک ایسا جنگل ہے جس میں جن ہرنوں کا کوئی مقصد نہ ہو وہ کسی بوڑھے' بیمار اور کاہل شیروں کا لنچ بن جاتی ہیں چنانچہ اگر آپ اس جنگل میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو زندگی کا کوئی ایسا مقصد اپنا لیں جو شیروں کے جبڑوں اور پنجوں سے مضبوط ہو ورنہ آپ کسی دن کسی مضبوط جانور کا ڈکار بن جائیں گے۔

باقی سب خیریت ہے!

لاہور کا ایک کاروباری شخص دیوالیہ ہو گیا‘ وہ معاشی دباؤ میں آیا تو اس کے عزیز رشتے دار‘ دوست احباب اور کاروباری ساتھی ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا‘ اس وقت اسے کسی روشن خیال عالم دین نے سمجھایا‘ انسان پر غربت‘ افلاس اور بھوک کے عالم میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے چنانچہ تم حالات کے ساتھ مفاہمت کا کوئی راستہ نکال لو‘ وہ صاحب بات سمجھ گئے چنانچہ انہوں نے لاہور شہر میں چھوٹے پیمانے پر شراب کی سپلائی شروع کر دی‘ وہ نیک نیت‘ محنتی اور ثابت قدم تھے لہٰذا قدرت نے ان کے کاروبار میں ”برکت“ ڈال دی اور وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے‘ اس دوران انہوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کیلئے شراب کے ساتھ چند وغیرہ وغیرہ قسم کے لوازمات بھی سپلائی کرنا شروع کر دیئے جس کے بعد ان کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے اور وہ جلد ہی لاہور شہر کے بڑے ”بزنس ٹائی کون“ بن گئے جس کے بعد وہ اپنے آپ کو حاجی صاحب مشروبات والے کہلانے لگے‘ حاجی صاحب کے پاس دولت آئی تو ان کے گرد نئے دوستوں کا میلہ لگ گیا‘ ایک دن نئے دوستوں کی محفل میں ان کا ایک پرانا دوست بھی آ گیا‘ پرانے دوست نے ان کی آن بان اور شان دیکھی تو اس نے ان سے پوچھا ”حاجی صاحب آپ کا نیا کاروبار کیسا چل رہا ہے“ حاجی صاحب نے سب سے پہلے اس خدا کا شکر ادا کیا جس نے انہیں کسی غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچائے رکھا اور اس کے بعد کھل کر اپنے کاروبار کی تعریف کرنے لگے‘ حاجی صاحب کا دوست ذرا شریفانہ قسم کا تھا‘ اس کو جب حاجی صاحب کے کاروبار کی تفصیل معلوم ہوئی تو وہ شرمسار ہو گیا اور شرمندگی کے عالم میں حاجی صاحب سے پوچھا ”کیا آپ اس کاروبار سے مکمل طور پر مطمئن ہیں“ حاجی صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور اس کے بعد بولے ”ویسے تو اللہ کا بڑا کرم ہے‘ اللہ نے رزق میں وسعت دے رکھی ہے‘ شہر میں عزت اور دھاک بھی ہے لیکن بس ایک مسئلہ ہے!“ دوست نے پوچھا ”وہ کیا“ حاجی صاحب نظریں جھکا کر بولے ”بس لوگ کبھی کبھی بے شرم اور بے غیرت کہہ دیتے ہیں‘ باقی سب خیریت ہے“۔

میں نے 15 فروری کو جمہوریت‘ سسٹم‘ روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی بقا کیلئے منصوبہ بنایا تھا اور سوچا تھا کہ میں حکومت پر تنقید نہیں کروں گا‘ میں حکومت کے ہر سفاکانہ‘ بے رحمانہ اور سنگدلانہ اقدام پر خاموش رہوں گا اور حکومت خواہ پنجاب میں گورنر راج لگوا دے‘ موبائل عدالتیں بنا دے یا پھر وزراء کیلئے پچاس کروڑ روپے کی نئی بلٹ پروف گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کر لے‘ میں حماقت اور فضول خرچی کی ہر گھڑی میں حکومت کا ساتھ دوں گا‘ میں حکومت کی وعدہ خلافیوں اور چالاکیوں پر بھی واہ واہ کروں گا اور میں حکومت کے ان اقدامات کی بھی تعریف کروں گا جن کے بارے میں مجھے یقین ہو گا یہ کل کے دن ”ری ورس“ ہو جائیں گے اور جب کبھی حکومت ہم کو ٹھوکر مارنے لگے گی تو میں اس وقت بھی تالیاں بجاؤں گا لیکن میں ناکام ہو گیا۔ میں اس کے بعد فوراً تائب ہو گیا اور میں نے خود کو اپنی ”اصلاح“ تک محدود رکھنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ دنیا کے تمام بڑے فلاسفی کہتے ہیں انسان اگر اپنی اصلاح کر لے تو پوری دنیا بدل سکتی ہے یوں میں پندرہ دن تک مسلسل اپنی اصلاح کرتا رہا لیکن 28 فروری تک پہنچ کر میں بے بس ہو گیا اور مجھے محسوس ہونے لگا میں بھی ایک ایسی ہی ٹیڑھی ہڈی ہوں جو ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن سیدھی نہیں ہو سکتی چنانچہ میں نے دوبارہ اپنے آپ کو راہ راست پر لانے کا فیصلہ کر لیا‘ میں اب جنگلی اور غیر تہذیب یافتہ ٹارزن کی طرح واپس تو آ رہا ہوں لیکن جہاں تک روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے 13 دنوں کا تعلق ہے تو یہ میری زندگی کا شاندار ترین دور تھا‘ میں ان 13 دنوں میں ٹینشن‘ فرسٹریشن اور ڈپریشن سے آزاد رہا اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا انسان اگر شمر کی آنکھ سے دیکھے تو اسے کربلا کے شہید بھی حکومت کی رٹ دکھائی دیتے ہیں‘ مجھے پہلی بار معلوم ہوا اگر انسان اپنے جسم میں میر جعفر اور میر صادق کا ضمیر پیدا کر لے تو وہ بہت آسودہ ہو جاتا ہے۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا اگر انسان فرعون کے دربار سے منسلک ہو جائے تو اسے حضرت موسیٰ کا کلمہ حق قانون شکنی محسوس ہوتا ہے اور اسے نمرود کی آگ آزاد اور خود مختار عدلیہ کا فیصلہ دکھائی دیتی ہے‘ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس طرح انسان کی زندگی بڑی سکھی ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کو کافی کے کپ‘ ہوانا کے سگار اور پیرس کی خوشبو کی طرح انجوائے کرتا ہے لیکن اس سارے کھیل میں ایک چھوٹا سا‘ معمولی سا مسئلہ ہے اور یہ وہی مسئلہ ہے جو حاجی صاحب مشروب والے کو درپیش تھا۔

آپ ان حاجی صاحبان کی کارروائیاں ملاحظہ کر لیجئے کل لاہور میں سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر حملہ ہوا اور حاجی صاحبان کل سے اس حملے کو پاکستانی دہشت گردوں کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں‘ ان لوگوں کو [illegible]

اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ اسے ممبئی حملوں کا ردعمل قرار دے سکیں' یا اتنا ہی اعتراف کر لیں کہ بھارتی ایجنسیوں نے بدلہ لینے کیلئے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ایک خطرناک کھیل کا ٹریلر ہے' اصل فلم ابھی چلنا باقی ہے' ہم فرض کر لیں یہ لوگ بھارتی نہیں تھے اور یہ پاکستان کے نان سٹیٹ ایکٹرز ہیں تو پھر یہ مزید تشویشناک صورتحال ہے کیونکہ میاں شہباز شریف کے دور میں پنجاب دہشت گردی سے محفوظ رہا تھا' اس دور میں ڈیرہ اسماعیل خان اور میانوالی میں دو تین واقعات ہوئے تھے لیکن یہ فرقہ وارانہ دہشت گردی تھی جبکہ سنٹرل پنجاب بالخصوص لاہور دہشت گردی سے محفوظ رہا تھا' اس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک آپ میاں شہباز شریف سے سو اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ماننا پڑے گا وہ ایک اچھے منتظم اور اچھے ٹیم لیڈر ہیں چنانچہ انہوں نے اہم پوسٹوں پر ایماندار اور ان تھک افسر لگا دیئے تھے اور ان افسروں کی کوششوں سے پنجاب محفوظ رہا' دوسرا میاں برادران شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ڈرونز حملوں' فاٹا میں امریکی اثرورسوخ اور فوجی آپریشن کے خلاف ہیں' وہ سوات کے مسئلے کا پُرامن حل بھی چاہتے ہیں چنانچہ شدت پسندوں نے پنجاب کو ٹارگٹ نہیں کیا لیکن جونہی پنجاب کی حکومت ختم ہوئی تو نان سٹیٹ ایکٹرز کیلئے اسلام آباد اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہا اور انہوں نے لاہور میں بھی کارروائیاں شروع کر دیں لہٰذا یہ کارروائی اگر را کی ہے تو صورتحال تشویشناک ہے اور اگر یہ پاکستان کے نان سٹیٹ ایکٹرز ہیں تو بھی صورتحال انتہائی خوفناک ہے اور اگر پنجاب میں اختیارات کی توسیع اسی طرح جاری رہی تو شمالی وزیرستان اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہے گا لیکن میرا خیال ہے حکومت اس معاملے میں سنجیدگی دکھانے کی بجائے اپنے حاجی صاحبان سے کام چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

بزنس ڈیل

1970ء کی دہائی میں دو نوجوان صحافی لاہور کے لکشمی چوک کے ایک سینما میں فلم دیکھنے گئے' ان کے پاس پیسے کم تھے چنانچہ انہوں نے کیشئر کو اپنا تعارف کرایا اور اسے ایک بزنس ڈیل کی آفر کی' انہوں نے اس سے کہا اگر سینما کی انتظامیہ انہیں ٹکٹ میں رعایت دے دے تو وہ واپس جا کر فلم کے حق میں مضمون لکھ دیں گے مگر کیشئر نے اس ''بزنس ڈیل'' سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں صحافیوں اور کیشئر کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور کیشئر نے ان کی رقم کھڑکی سے باہر پھینک دی' یہ سلوک دیکھ کر ایک صحافی کا خون کھول گیا اور اس نے چلا کر کیشئر سے کہا ''تم نے قائداعظم کو گالی کیوں دی؟'' کیشئر نے حیران ہو کر جواب دیا ''میں نے قائداعظم کو کب گالی دی'' صحافی فوراً پیچھے مڑا اور قطار میں کھڑے سینکڑوں لوگوں سے مخاطب ہو کر اعلان کیا ''کیشئر قائداعظم کو گالیاں دے رہا ہے'' یہ سننے کی دیر تھی قطار میں کھڑے تماش بین انقلابی بن گئے اور انہوں نے سب سے پہلے سینما کی انتظامیہ کے خلاف نعرے لگائے' پھر پتھر اور اینٹیں اٹھائیں اور سینما پر حملہ کر دیا' تھوڑی دیر میں سینما کی انتظامیہ میدان سے بھاگ گئی' ہال میں موجود لوگ بھی باہر آئے اور ہجوم میں شامل ہو گئے' راہگیر بھی انقلابیوں کے ساتھ مل گئے اور یوں ذرا سی دیر میں ہجوم نے سینما کو آگ لگا دی۔

مجھے یہ واقعہ 25 فروری 2009ء کے بعد بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے کیونکہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد چند نامعلوم افراد نے لیاقت باغ راولپنڈی میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی یادگار پر لگے پوسٹرز پھاڑ دیئے اور ان کی تصویر فریم سمیت نیچے گرا دی' یہ سانحہ رات تک ''تم نے قائداعظم کو گالی دی'' جیسی واردات میں تبدیل ہو گیا اور پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے درمیان تصادم شروع ہو گیا' راولپنڈی میں جیالے اور متوالے ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو گئے' سندھ کے اندر ہنگامے پھوٹ پڑے اور کراچی شہر میں میاں نواز شریف کے خلاف نعرے لگنے لگے' اگلے دن پاکستان مسلم لیگ ن کے چیئرمین راجہ ظفر الحق محترمہ کی یادگار پر پھول چڑھانے گئے تو بعض نامعلوم افراد نے ان کی گاڑی پر حملہ کر دیا اور گاڑی کے شیشے توڑ کر فرار ہو گئے' میاں نواز شریف اور انکے ساتھیوں نے محترمہ کی یادگار پر حملے کی مذمت بھی کی اور مجرموں کو سامنے لانے کا مطالبہ بھی کیا' اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نے بھی راجہ ظفر الحق کی گاڑی پر حملے کو افسوسناک قرار دیا اور اعلان کیا ''یہ حملہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے نہیں کیا تھا'' یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے محترمہ کی یادگار اور راجہ ظفر الحق کی گاڑی پر پھر کس نے حملہ کیا تھا؟ اسی طرح 25 فروری کی سہ پہر لاہور' اسلام آباد اور راولپنڈی میں سرکاری اور نجی املاک پر بھی حملے ہوئے تھے اور ان حملوں میں بھی اچھی خاصی توڑ پھوڑ ہوئی تھی' بینک بھی لوٹے گئے تھے' اے ٹی ایم مشینیں بھی توڑی گئی تھیں اور گاڑیاں بھی جلائی گئیں تھیں مگر آج تک ان حملہ کرنے والوں کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا' یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے یہ حملے کس نے کئے تھے؟ اس کے بارے میں تاحال کوئی رپورٹ سامنے نہیں آ سکی' شاید اس کی وجہ مشیر داخلہ رحمٰن ملک ہوں' ملک صاحب کیونکہ ایران کے دورے پر ہیں اور وہ آج کل ایرانی صدر احمدی نژاد کو دہشت گردوں سے نمٹنے کے نسخے بتا رہے ہیں لہٰذا حکومت ابھی تک ان سانحوں کے مجرموں کا تعین نہیں کر سکی' مجھے یقین ہے ملک صاحب واپس تشریف لا کر ان سانحوں کی ذمہ داری کسی نہ کسی نان سٹیٹ ایکٹر کے کھاتے میں ڈال دیں گے اور یوں دونوں پارٹیوں کے درمیان مفاہمت کا عمل شروع ہو جائے گا لیکن مفاہمت کے اس عمل سے پہلے یہ طے ہے کوئی ہے جو ملک میں ''تم نے محترمہ کو گالی دی'' جیسی فضا پیدا کر رہا ہے اور اس کی کوشش ہے پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان تصادم میں اضافہ ہو تاکہ معاملات اس نہج پر پہنچ جائیں جہاں سے انہیں واپس لانا ممکن نہ رہے' یہ ''کوئی'' اس قدر مضبوط ہے کہ اس نے کراچی میں ایم کیو ایم سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی محبت میں ایک شاندار ریلی بھی نکلوا دی اور میاں صاحب کو کراچی کا دورہ ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا' مجھے اندیشہ ہے یہ ''کوئی'' آئندہ دنوں میں دونوں پارٹیوں کے درمیان کھلنے والا تازہ تازہ ''بیک ڈور'' بھی بند کرا دے گا اور یوں جمہوریت اور سیاست کے خواب ٹوٹ کر سڑکوں پر بکھر جائیں گے اور ملک ایک بار پھر 12 اکتوبر 1999ء کی پوزیشن پر آ جائے گا۔

یہاں پر ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے اس ساری صورتحال کا اصل مجرم کون ہے؟ ہم اگر جانبداری کا پورا پورا مظاہرہ بھی کر لیں تو بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ صورتحال پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نے پیدا کی تھی' اگر پارٹی کی قیادت 9 مارچ 2008ء کے مری ڈکلیئریشن سے دائیں بائیں نہ ہوتی' پارٹی قیادت 12 مئی کے اعلان سے پیچھے نہ ہٹتی' پارٹی قیادت 5 اور 7 اگست کے تحریری معاہدے نہ توڑتی اور اگر حکومت سپریم

کورٹ سے 25 فروری کا فیصلہ ''ہولڈ'' کرنے کی درخواست کر دیتی تو یہ صورتحال پیدا نہ ہوتی اور یہ بھی حقیقت ہے ہم میاں نواز شریف کی جتنی بھی کردار کشی کر لیں' ہم انہیں جتنا چاہیں ضدی اور انا پرست کہہ لیں لیکن ہمیں ماننا پڑے گا میاں نواز شریف اپنے موقف پر کھڑے ہیں' انہوں نے 18 فروری 2008ء کے الیکشنز سے پہلے جو موقف اختیار کیا تھا وہ آج بھی اس پر قائم ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں پاکستان پیپلز پارٹی اپنا موقف تبدیل کرتی رہی اور آج حالت یہ ہو گئی ہے پاکستان پیپلز پارٹی کے اپنے کارکن اور اپنے لیڈرز شرمندہ شرمندہ پھر رہے ہیں' آج سے پندرہ دن قبل وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے پانچ صحافیوں کو لنچ پر بلایا تھا میں بھی ان خوش نصیب صحافیوں میں شامل تھا' ہم نے شاہ محمود قریشی سے پنجاب کی صورتحال کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بڑے یقین سے جواب دیا تھا'' ہم پنجاب میں مسلم لیگ ن کے مینڈیٹ کا احترام کریں گے'' ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا'' اگر پنجاب میں مسلم لیگ ن کی حکومت توڑ دی گئی تو؟'' شاہ محمود قریشی نے فوراً جواب دیا'' یہ ایک کمپلیٹ ڈزاسٹر ہو گا اور شاید اس کے بعد سسٹم بچانا ممکن نہ ہو'' وزیر اعظم اور پاکستان پیپلز پارٹی کی سینئر قیادت کے خیالات بھی یہی تھے لیکن پھر پنجاب کی حکومت بھی ختم ہوئی اور پنجاب میں گورنر راج بھی لگا چنانچہ آج پارٹی کی سینئر قیادت کیلئے پارٹی کا دفاع مشکل ہو گیا ہے اور وہ تمام وزراء جو دس دس گاڑیوں کا پروٹوکول لے رہے ہیں وہ میڈیا سے غائب ہیں اور سردار نبیل گبول اور فوزیہ وہاب جیسے خودکش حملہ آور بارودی جیکٹیں پہن کر میڈیا کے سامنے کھڑے ہیں مگر ان کی زبان بھی ان کی آنکھوں اور چہرے کا ساتھ نہیں دیتی' ہمیں یہ حقیقت بھی ماننا پڑے گی پارٹی قیادت اپنے سینئر رہنماؤں کو'' سائز'' میں رکھنے کیلئے میاں نواز شریف کو استعمال کرتی رہی تھی' 28 فروری کو میں نے رائے ونڈ میں میاں نواز شریف کا لائیو انٹرویو کیا تھا' اس انٹرویو کے دوران میں نے ان سے پوچھا'' مری ڈکلیریشن کے بعد آصف علی زرداری نے آپ سے درخواست کی تھی آپ مخدوم امین فہیم کو وزارت عظمٰی کا امیدوار تسلیم کرنے سے انکار کر دیں' آپ نے چھوٹے بھائی کا یہ مطالبہ مان لیا' آپ نے خواجہ آصف کو یہ ٹاسک دیا اور خواجہ صاحب نے میڈیا میں کہہ دیا مخدوم امین فہیم صدر پرویز مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں چنانچہ یہ ہمیں وزیر اعظم قبول نہیں ہوں گے جس کے بعد مخدوم صاحب پارٹی میں کارنر ہو گئے'' میاں صاحب نے یہ بات تسلیم کر لی لیکن ساتھ ہی فرمایا'' آپ ابھی کچھ باتوں پر پردہ ہی رہنے دیں'' اس انٹرویو کی دوسری خاص بات وہ بزنس ڈیل تھی جو صدر زرداری نے میاں شہباز شریف کو آفر کی تھی' میاں صاحب نے تسلیم کیا جب اس بزنس ڈیل کی آفر کی گئی تھی کہ اگر میاں برادران چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی مدت ملازمت میں توسیع کا مطالبہ مان لیں تو ان کو عدالت اہل قرار دے دے گی اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کے سینئر قائد اور وفاقی وزیر رضا ربانی وہاں موجود تھے اور وہ اس آفر کے گواہ ہیں' میاں نواز شریف کے اس انکشاف کے بعد رضا ربانی کے پاس کیا آپشن بچتا ہے' یہ بھی آج کا سب سے بڑا سوال ہے۔

ہمیں ماننا پڑے گا صورتحال اتنی گھمبیر ہو چکی ہے اب کوئی بزنس ڈیل ملک کو اس سے نہیں نکال سکے گی اور ملکی سیاست ایک بار پھر اس نہج پر آجائے گی جب پاکستان پیپلز پارٹی کی تمام مخالف جماعتوں نے'' آئی جے آئی'' بنائی تھی اور پورا سسٹم ایک بار فارغ ہو گیا تھا۔

آپ سب سے پہلے عائشہ کی کہانی سنئے۔ تین سال قبل عائشہ اور اس کے دو چھوٹے بھائی اپنے والدین کے ساتھ سعودی عرب میں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے' دونوں بہن بھائیوں نے میٹرک کا امتحان بھی سعودی عرب سے پاس کیا لیکن پھر ان کے والد اچانک بیمار ہو گئے اور انہیں ملازمت چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ دونوں بہن بھائیوں نے فیڈرل کالج کھاریاں کینٹ میں داخلہ لیا مگر فرسٹ ائر کے امتحان سے قبل ہی عائشہ والد کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئی۔ عائشہ اور اس کا بھائی ولید سیکنڈ ائر میں پہنچے تو ان کی والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں' یہ دونوں اگر عام بچے ہوتے تو شائد والدین کی محرومی کے دکھ تلے دب کر امتحان ہی نہ دے پاتے مگر عائشہ نے ہمت نہ ہاری' اس نے اپنے بہن بھائیوں کو حوصلہ دیا اور مالی دشواریوں پر قابو پانے کیلئے نہ صرف ٹیوشن پڑھاتی رہی بلکہ خود امتحان کی تیاری بھی کرتی رہی۔ اس سال دونوں بہن بھائیوں نے ایف ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور یہ اب انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد میں کمپیوٹر اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں زیر تعلیم ہیں جبکہ ان کے دو چھوٹے بھائی کھاریاں کے قریب پاکستان اوورسیز اکیڈمی منڈیر میں آٹھویں کلاس میں ہیں۔

آپ اب وزیر آباد کے حافظ رضوان احمد کی کہانی سنئے۔ حافظ رضوان احمد کا تعلق وزیر آباد کے ایک قریبی گاؤں سے ہے' وہ سات افراد کے کنبے میں سب سے بڑا ہے' والد بیمار تھے اور مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے' رضوان نے اپنی تعلیم کا آغاز مدرسے میں حفظ قرآن اور اردو پڑھنے سے کیا' حفظ قرآن کے بعد رضوان تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا مگر گھر کی معاشی پریشانیوں نے مجبور کیا اور وہ چودہ سال کی عمر میں نوکری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا' اسے کھاریاں میں فوٹو گرافر کی دکان پر انتہائی قلیل معاوضے پر ملازمت مل گئی' حافظ رضوان صبح سویرے سائیکل پر اخبار تقسیم کرتا' دن کے وقت فوٹو گرافر کی دکان پر کام کرتا اور شام میں قرآن مجید کی ٹیوشن پڑھاتا' وہ اس طرح خاندان کی کفالت کا بوجھ سنبھالتا رہا۔ 2004ء میں الفلاح سکالرشپ کی انتظامیہ نے حافظ رضوان کی مدد شروع کی' رضوان احمد نے 2006ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور انٹر کے بعد آج وہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں بی بی اے آنرز میں داخل ہے۔ اسی طرح طاہرہ نثار کا تعلق گوجرانوالہ شہر سے ہے' وہ پنجاب یونیورسٹی کے گوجرانوالہ کیمپس میں ایم بی اے کی طالبہ ہے' اس نے بی کام کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں چوتھی جبکہ گوجرانوالہ ڈویژن میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی' طاہرہ کا گھرانہ تین بھائیوں اور دو بہنوں سمیت سات افراد پر مشتمل ہے' ایک بھائی ڈی کام جبکہ دوسرا میٹرک میں ہے' تیسرا پانچویں کا طالبعلم ہے' طاہرہ نثار کے والد شوگر' ہیپا ٹائٹس اور کڈنی کے مریض ہیں' ان حالات میں والد کیلئے پانچ بچوں کے تعلیمی اخراجات چلانا ناممکن تھا چنانچہ والد نے الفلاح سکالرشپ سکیم سے رابطہ کیا' اس بچی کا سکالرشپ شروع ہوا اور طاہرہ نے مارچ 2008ء میں پہلے سمسٹر میں 395 جی پی اے حاصل کر کے یونیورسٹی طالبات میں سیکنڈ پوزیشن جبکہ اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ آپ کامیابی کی ایک اور داستان بھی سنئے۔ محمد ایوب ڈار جلالپور جٹاں ضلع گجرات کا رہنے والا بہت ہی خوش قسمت انسان ہے' وہ محلے میں کباڑیے کی دکان چلاتا ہے اور کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر ہے مگر اللہ نے اسے بہت ہی ذہین اور ہونہار اولاد سے نوازر کھا ہے۔ محمد ایوب کے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سے ایک بیٹا عبدالمنان ٹیکسلا میں انجینئرنگ یونیورسٹی کا طالبعلم ہے جبکہ بڑی بہن کنزیٰ ایوب فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور کی سال دوم کی طالبہ ہے' چھوٹے بچوں میں سے ایک ایف ایس سی اور بچی ساتویں کی طالبہ ہے۔ محمد ایوب کے چاروں بچے الفلاح سکالرشپ سکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسی طرح ثمرین ناز جڑانوالہ کے انتہائی غریب خاندان کی طالبہ ہے' میٹرک میں A+ نمبر لینے والی ہر ذہین طالبہ کی طرح وہ بھی دل میں ڈاکٹر بننے کی خواہش رکھتی تھی مگر کسی اچھے کالج تک رسائی نہ ہونے کے باعث وہ بڑی میڈیکل میں داخلے کا بس خواب ہی دیکھتی رہ گئی۔ گھر میں دو وقت کے کھانے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا تھا پھر اس نے ڈریس میکنگ اور ڈیزائننگ کورس میں داخلہ لے لیا' اسے فیس میں رعایت حاصل تھی مگر کلاسز شروع ہوئیں تو اسے اندازہ ہوا اس کیلئے اپنی کتب' کپڑے اور آمدورفت کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہیں چنانچہ اس نے کلاسز میں جانا چھوڑ دیا' انہیں دنوں اس نے اخبار کے کسی کالم میں الفلاح سکالرشپ سکیم کا تذکرہ پڑھا' اس نے ایک بار پھر انگڑائی لی اور الفلاح سکالرشپ سے رابطہ کیا' الفلاح نے اس کے حالات کا جائزہ لے کر اسے سپانسر کیا' الحمد للہ ثمرین ناز نے 72 فیصد نمبروں کے ساتھ پہلے دو سال مکمل کر لئے اور وہ اب آخری سال کے امتحانات کی تیاری کر رہی ہے اور اسی طرح رملہ منور ''ابن امیر کالج برائے خواتین جلالپور جٹاں'' کی طالبہ ہے' اس کے والد قبرستان میں نگران کا

کام کرتے ہیں' یہ خاندان قبرستان ہی کے ایک کمرے میں رہائش پذیر ہے' الفلاح سکالرشپ سکیم نے اس بچی کا ہاتھ تھاما' رملہ نے میٹرک میں اے گریڈ حاصل کیا' ایف اے بی گریڈ میں پاس کیا اور اب وہ تھرڈ ائر کی [illegible] ہے۔

یہ کہانیاں محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ معجزے ہیں اور ان معجزوں کی بنیاد کھاریاں کے ایک چھوٹے سے ادارے الفلاح سکالرشپ سکیم نے رکھی تھی' کھاریاں کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ''چنن'' اس گاؤں کے ایک صاحب محمد عبدالشکور پنجاب یونیورسٹی میں سٹوڈنٹ لیڈر رہے' وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد امریکہ چلے گئے' وہاں روزی روٹی کی جدوجہد کرتے رہے' وہ واپس ''چنن'' آئے تو انہوں نے دیکھا علاقے کے بے شمار ذہین طالب علم اور طالبات صرف وسائل کی کمی کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر پاتے چنانچہ عبدالشکور نے ان طالب علموں اور طالبات کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا' عبدالشکور نے ذاتی جیب سے الفلاح سکالرشپ سکیم کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور چند ذہین طالب علموں کی مالی معاونت شروع کر دی اور ان طالب علموں نے کمال کر دیا' اس سے عبدالشکور کا حوصلہ بڑھا چنانچہ انہوں نے اپنے دوست احباب کو بھی اس نیک کام میں شریک کر لیا۔ عبدالشکور کے دوستوں نے الفلاح سکالرشپ سکیم میں فنڈز جمع کرانا شروع کر دیئے یوں یہ ادارہ پھلنے پھولنے لگا۔ یکم ستمبر 2007ء سے 31 جولائی 2008ء تک اس ادارے نے 438 ضرورت مند طلباء و طالبات کو وظائف دیئے' ان طلباء و طالبات میں سکول سطح کے 227' کالج سطح کے 91' ڈگری کالج کے 28' ڈپلومہ کورسز کے 44' بی ایس سی انجینئرنگ کے 18' ایم بی بی ایس کے 7 اور ایم ایس سی کے 23 طلباء اور طالبات شامل ہیں' یہ وہ طالب علم ہیں جن کی زندگی میں اگر الفلاح سکالرشپ سکیم کے لوگ روشنی کی کرن شامل نہ کرتے تو شائد یہ لوگ کامیابی کا ستارہ بننے کے بجائے حالات کے اندھیروں میں ڈوب جاتے' ان میں سے بے شمار طالب علم ہتھوڑی یا بیلچہ پکڑ کر مزدوری کرتے یا بے روزگاری کے ہاتھوں خودکشی کر لیتے' میں اس سکیم اور اس سکیم کی انتظامیہ کو تین چار برسوں سے جانتا ہوں اور خود بھی اس کا ڈونر ہوں چنانچہ میری تمام صاحب ثروت احباب بالخصوص بیرون ملک موجود پاکستانیوں سے درخواست ہے وہ اپنی زکوۃ' صدقہ' فطرانہ اور عطیات اس سکیم میں جمع کرائیں۔ اگر یہ احباب اپنی استطاعت کے مطابق کسی ایک یا دو بچوں کے تعلیمی اخراجات اپنے ذمے لے لیں تو یہ جہاد اکبر سے کم نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ انہیں دنیا اور آخرت میں اس خدمت کا صلہ دے گا۔ دنیا میں سب سے بڑی خدمت کسی بے وسیلہ مگر باصلاحیت نوجوان کے ہاتھ میں قلم اور کتاب پکڑانا ہوتی ہے اور الفلاح سکالرشپ سکیم آپ کو یہ خدمت کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کر رہی ہے لہذا پلیز یہ موقع ضائع نہ کریں کیونکہ جس طرح ضرورت انسان کو کامیابی کا صرف ایک موقع فراہم کرتی ہے بالکل اسی طرح وہ آپ کو ایک ایسی بڑی نیکی کرنے کا ایک آدھ ہی موقع دیتی ہے جس کا ثواب آپ کی کئی نسلوں تک جاری رہتا ہے اور مجھے یقین ہے یہ آپ کی ایسی ہی نیکی ہو گی۔ آپ اپنے عطیات کیلئے مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبرز پر عبدالشکور صاحب سے رابطہ کر سکتے ہیں: 053-7453078,0321-5932009 جبکہ آپ مسلم کمرشل بینک جی ٹی روڈ کھاریاں اکاؤنٹ نمبر 1447-8 یا الفلاح سکالرشپ سکیم چنن ڈنگہ روڈ کھاریاں میں بھی اپنے عطیات جمع کرا سکتے ہیں۔

اٹلی کے کسی ساحل پر طوفان آ گیا' طوفان جب تھما تو ساحل پر بے شمار مچھلیاں پڑی تھیں' یہ نیم مردہ مچھلیاں تھیں اور یہ ساحل کی ریت پر بری طرح تڑپ رہی تھیں' اگلی صبح ایک بچہ ساحل پر پہنچا اور اس نے ایک ایک مچھلی اٹھا کر سمندر میں پھینکنا شروع کر دی' وہ شام تک مچھلیاں سمندر میں پھینکتا رہا' ایک اطالوی بوڑھا فولڈنگ چیئر پر بیٹھ کر بچے کو دیکھ رہا تھا' شام کو جب بچہ ستانے کیلئے رکا تو بوڑھا اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا "بیٹا آپ کیا کر رہے ہو" بچے نے مسکرا کر بوڑھے کی طرف دیکھا اور شائستگی سے بولا "میں مچھلیوں کو مرنے سے بچا رہا ہوں" بوڑھے نے بچے کی بات سنی' ایک لمحہ کیلئے کچھ سوچا اور اس کے بعد بولا "ادھر ساحل کی طرف دیکھو" بچے نے ساحل کی طرف دیکھا' ساحل پر دور دور تک لاکھوں مچھلیاں تڑپ رہی تھیں' بوڑھے نے بچے کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کے بعد بولا "بیٹا ساحل پر لاکھوں مچھلیاں پڑی ہیں تم ان میں سے کتنی مچھلیوں کو بچا لو گے' تمہاری اس کوشش سے کیا فرق پڑے گا" بچے نے بابا جی کی بات سنی' قہقہہ لگایا' وہ بھاگ کر ساحل پر گیا' ریت پر جھکا' ایک مچھلی اٹھائی' بھاگتا ہوا پانی کے پاس گیا' مچھلی کو احتیاط سے پانی میں رکھا اور بھاگتا ہوا بوڑھے کے پاس آیا اور مسکرا کر بولا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' ہو سکتا ہے میری اس کوشش سے واقعی کوئی فرق نہ پڑے لیکن میں نے کم از کم ایک مچھلی کی زندگی میں تو فرق پیدا کر دیا" بچہ رکا اور دوبارہ بولا "یہ مچھلی جب پانی میں اتری ہو گی اور اس کی ملاقات دوسری مچھلیوں سے ہوئی ہو گی تو اس نے ان سے کہا ہو گا ہم انسانوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھیں' ہم انہیں ظالم' قاتل' مفاد پرست اور وحشی سمجھتی تھیں لیکن یہ تو بہت ہمدرد' بے غرض اور مخلص ہیں" وہ رکا اور دوبارہ بولا "میں نے انسان کے بارے میں سمندری مخلوق کے خیالات بھی تبدیل کر دیئے اور یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے" بوڑھے نے بچے کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور وہ بھی اس کے ساتھ مل کر مچھلیاں سمندر میں پھینکنے لگا۔

یہ بظاہر بچگانہ اور غیر حقیقی سی داستان لگتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کے اندر پوری تمدنی تاریخ چھپی ہے' یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس سے سقراط سے لے کر حضرت امام حسینؓ تک' سراج الدولہ سے ٹیپو سلطان تک اور ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر افتخار محمد چودھری تک ان تمام لوگوں نے جنم لیا تھا جو پورے ملک میں اکیلے تھے اور جو یہ جانتے تھے وہ اکیلے ہونے کی وجہ سے شائد کوئی بڑی تبدیلی نہ لا سکیں لیکن اس کے باوجود وہ برائی کے خلاف ڈٹ گئے' اس کے باوجود انہوں نے جان دے دی' انہیں سارا معاشرہ' سارے لوگ یہ سمجھاتے رہے تم اکیلے ہو' آپ صرف 72 لوگوں کا لشکر ہیں' آپ انگریز کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے' فوج بڑی طاقتور ہے اور صدر پرویز مشرف آپ کو کچل دے گا وغیرہ وغیرہ اور آپ کی قربانی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن یہ لوگ ڈٹے رہے اور ان کے استقلال نے آنے والے دنوں میں ایک ایسی تبدیلی کی بنیاد رکھ دی جس پر بعد ازاں اخلاقیات کی بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہوئیں' یہ اصول کی ایک مچھلی کی حفاظت کرنے والے لوگ تھے' یہ کالی اندھیری رات میں اصول کا ایک دیا جلانے والے لوگ تھے اور یہ لوگ تاحد نظر پھیلے صحرا میں بیری کا ایک درخت لگانے والے لوگ تھے اور یہ لوگ بنیادی طور پر معاشروں کا حسن ہوتے ہیں' آپ ذرا اس زاویے سے تاریخ کو دیکھیں تو آپ کو حضرت امام حسینؓ انسانی تاریخ کا وہ حسن دکھائی دیں گے جس کی بنیاد پر آج پورا عالم اسلام دنیا کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے' اگر اس وقت حضرت امام حسینؓ (نعوذ باللہ) یہ سمجھ لیتے وہ اور ان کے خاندان کے 72 لوگ چار براعظموں پر پھیلی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتے یا ان کی قربانی سے کیا فرق پڑے گا تو شاید آنے والی تاریخ میں اصول مر جاتے اور کوئی نہتا' کمزور اور اکیلا شخص جابر سلطان کے سامنے کھڑا نہ ہوتا اور شاید آنے والے زمانوں میں ہر بااصول شخص وقت کی دہلیز پر اپنا ماتھا ٹیک دیتا' زمینی حقائق اصولوں کی جگہ لے لیتے اور لوگ آج کے دن کے پجاری بن کر زندگی گزارتے۔ اسی طرح اگر سقراط زہر کا پیالہ پینے کی بجائے وقت کے حکمران کے سامنے جھک جاتا تو آنے والے وقتوں کے سارے سچ بازار میں بک جاتے یا درباروں کی دہلیز بن کر امراء' وزراء اور بادشاہوں کے جوتے صاف کرتے' یہ سقراط کی ایک قربانی تھی جس کے صدقے آج بھی سچ زندہ ہے' جس کے صدقے آج بھی لوگ برائی کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور یہ ذوالفقار علی بھٹو کا جذبہ' انکار اور بے لچک رویہ تھا جس نے آنے والے وقتوں میں بے شمار لوگوں کو سچ بولنے' ڈٹ جانے اور اپنے موقف پر قائم رہنے کی ہمت دی تھی' اگر ذوالفقار علی بھٹو جنرل ضیاء الحق سے سمجھوتہ کر لیتے تو آنے والے دنوں میں محترمہ بینظیر بھٹو جرنیلوں کی کابینہ میں شامل ہوتیں اور میاں نواز شریف 2002ء میں جنرل پرویز مشرف کی صدارت میں وزیراعظم ہوتے لیکن یہ بھٹو کی

قربانی تھی جس نے آنے والے سیاستدانوں کو قوت اور طاقت دی۔

اچھے انسان اور برے انسان میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اچھے اور برے انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا' دونوں کو بھوک لگتی ہے' دونوں خوف کا شکار ہوتے ہیں' دونوں سمجھوتے کرتے ہیں اور دونوں کو ترغیب متاثر کرتی ہے لیکن اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو اپنی خامیوں کو کم کرتا اور خوبیوں کو بڑھاتا رہتا ہے جبکہ برے انسان اپنی خامیوں اور خرابیوں میں اضافہ کرتے جاتے ہیں' اچھے معاشرے اور برے معاشروں میں بھی یہی فرق ہوتا ہے' اچھے معاشرے اپنے اچھے لوگوں کی قدر کرتے ہیں' وہ اپنے اچھے لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں' وہ ان کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں جبکہ برے معاشرے برے لوگوں اور بری روایات کو بڑھنے دیتے ہیں۔ اگر معاشرے کا کوئی اچھا شخص برائی کی دلدل میں اترتا ہے تو یہ تالیاں بجا کر اس کو داد دیتے اور یہ معاشرے برائی میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب یہ اپنے اچھے لوگوں اور ان کی اچھائی کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں' یہ اچھے لوگوں کو عہدوں سے ہٹا کر جیلوں میں پھینک دیتے ہیں یا ملک بدر کر دیتے ہیں اور بعدازاں اپنے کارنامے پر خوشیاں مناتے ہیں' ہمارا معاشرہ بھی ایک برا معاشرہ تھا لیکن پھر 9 مارچ 2007ء اور 2 نومبر 2007ء آیا اور ملک میں 61 برس بعد اچھائی نے سر اٹھایا' ہم اگر ان دو دنوں کا تجزیہ کریں تو یوں محسوس ہو گا ان دنوں ہمارے ملک کی عدلیہ بیدار ہو گئی' ہماری عدلیہ نے اپنی ذمہ داری نبھادی' یہ ذمہ داری جب وکلاء اور سول سوسائٹی پر آئی تو اس نے بھی اپنا حصہ ڈال دیا لیکن جب یہ معاملہ سیاستدانوں کے دربار میں پیش ہوا تو یہاں سے ہماری بدقسمتی شروع ہو گئی۔ ہماری بدنصیبی دیکھئے وہ لوگ جو چالیس چالیس برس تک عدل' انصاف' مساوات اور اصولوں کے نعرے لگاتے رہے تھے' وہ لوگ جب اقتدار کے تخت پر بیٹھے تو وہ انصاف اور عدل کے قاتلوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور یوں معاشرے میں تبدیلی اور فرق کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ سر اٹھاتے ہی انتقال کر گیا۔

کل 27 اگست پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا' اس دن سندھ ہائی کورٹ کے آٹھ جج حکومت کے موقف کے مطابق عدلیہ میں واپس آ گئے' میرا خیال ہے ہم سب کو یہ دن "یوم سیاہ" کے طور پر منانا چاہئے تھا کیونکہ اس دن 2 نومبر اور 9 مارچ کو جنم لینے والی امید نے سیاست کے آپریشن تھیٹر پر دم توڑ دیا تھا' اس دن اصول انتقال کر گئے تھے اور سیاست جیت گئی تھی لیکن افسوس ہم نے سرکاری سطح پر اس دن کو کامیابی کی طرح منایا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا 18 فروری کو پیدا ہونے والے لوگ 2 نومبر کو آنے والی تبدیلی کا ساتھ دیتے' یہ لوگ اچھائی' اصولوں اور نظریات کی حفاظت کرتے لیکن افسوس ہم نے وقت کے بطن سے جنم لینے والی اچھائی کو سیاست کی قربان گاہ میں قتل کر دیا' ہمارے سامنے ضروریات جیت گئیں اور نظریات ہار گئے اور ہم صرف تماشا دیکھتے رہ گئے' افسوس ہم تو اس بچے سے بھی گئے گزرے ہیں جس نے ایک مچھلی ساحل کی تپتی ریت سے اٹھا کر پانی میں پھینک دی تھی اور وہ اس بات پر خوش تھا کہ وہ ایک مچھلی کی زندگی میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہو گیا جبکہ ہم لوگوں کو اس ملک کے مقدر میں تبدیلی لانے کا ایک موقع ملا تھا لیکن ہم نے اس موقع کو بھی اپنی ہوس اقتدار کا نوالہ بنا دیا' ہم نے اصولوں کے سقراط کو بے اصولی کے قبرستان میں زندہ گاڑھ دیا اور اب ہم اس کی قبر پر کھڑے ہو کر کامیابی کا جشن منا رہے ہیں' ہماری ایک ہاں' ہمارے ایک فیصلے سے اس ملک میں بڑا فرق پڑ سکتا تھا لیکن ہم نے حالات کی غلامی قبول کر لی' ہم نے عوام کے جذبات کو مصلحت کے بازار میں فروخت کر دیا' ہم کیسے لوگ ہیں اور مستقبل کا مؤرخ ہمیں کیا کہے گا' ہم آنے والے سورجوں کو کیا شکل دکھائیں گے' ہم اپنی نسلوں کا قرض کیسے چکائیں گے' افسوس ہے ہماری زندگی پر اور تف ہے ہمارے جینے پر۔

میجر جنرل (ریٹائر) راشد قریشی سابق صدر پرویز مشرف کے میڈیا ایڈوائزر اور ترجمان تھے' جنرل قریشی کا صدر پرویز مشرف کے ساتھ پرانا تعلق تھا' جنرل پرویز مشرف جس جس کور' جس جس ڈویژن اور فوج کے جس جس عہدے پر فائز رہے جنرل راشد قریشی ان کے ساتھ رہے' پرویز مشرف جب آرمی چیف بنے تو انہوں نے راشد قریشی کو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر لگا دیا' وہ اس وقت بریگیڈئر تھے اور "سپر سیڈ" ہو چکے تھے بعدازاں راشد قریشی کو "آؤٹ آف ٹرن" پروموشن دے دی گئی' وہ میجر جنرل ہو گئے اور جب جنرل پرویز مشرف نے 12 اکتوبر کیا اور وہ کچھ عرصہ بعد صدر بن گئے تو راشد قریشی نے ڈی جی آئی ایس پی آر کے ساتھ ساتھ جنرل صدر کے پریس سیکرٹری کا عہدہ بھی سنبھال لیا' وہ ان دنوں وزیر اطلاعات سے زیادہ مضبوط تھے اور بڑی حد تک میڈیا ان کا "ماتحت" تھا۔ بعدازاں جنرل راشد قریشی ان تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیئے گئے اور وہ اچانک گوشہ گمنامی میں چلے گئے لیکن جب صدر پرویز مشرف گرم پانیوں کے سفر پر نکلے اور برف سے بنی تمام کشتیاں ایک ایک کر کے ان کا ساتھ چھوڑ گئیں تو جنرل راشد قریشی تختہ بن کر ان کی مدد کیلئے آگے بڑھے اور انہوں نے آخری وقت تک صدر (سابق)' جنرل (ریٹائر) پرویز مشرف کا ساتھ دیا' جنرل راشد قریشی کا اصل ہنر "تردید" تھا' میڈیا نے ان سے جب بھی رابطہ کیا اور صدر پرویز مشرف کے بارے میں کسی "اچھی" خبر کی تصدیق چاہی تو ان کا ایک ہی ردعمل ہوتا تھا" یہ خبر بالکل بکواس' بے بنیاد اور جھوٹی ہے' یہ صدر کے خلاف پروپیگنڈا ہے اور اس کے ذریعے صدر پرویز مشرف کی شہرت کو نقصان پہچانے کی کوشش کی جا رہی ہے" لیکن الحمدللہ پچھلے آٹھ برسوں میں جنرل راشد قریشی نے جس خبر یا اطلاع کی تردید فرمائی وہ بعدازاں سچ نکلی مگر جنرل صاحب کو اپنی اس ناکامی پر کبھی ذرا بھر شرمندگی یا خفت نہ ہوئی۔ راشد قریشی کی آخری تردید 18 اگست کو وقوع پذیر ہوئی تھی' دنیا بھر کے میڈیا پر صدر پرویز مشرف کے استعفے کی خبر چل رہی تھی اور صدر پرویز مشرف ایوان صدر میں اپنی آخری تقریر تیار کر رہے تھے لیکن جنرل راشد قریشی اس اطلاع کو بے بنیاد اور جھوٹی قرار دے رہے تھے بہر حال یہ ساری باتیں' یہ سارے حقائق ایک طرف لیکن یہ حقیقت ہے جنرل راشد قریشی صدر پرویز مشرف کے اصلی اور سچے دوست اور خیر خواہ تھے اور وہ اس وقت بھی میدان میں ڈٹے رہے جب صدر صاحب کی سیاسی پلٹن ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی' صدر صاحب کی تیار کردہ جمہوری توپوں میں کیڑے پڑ گئے تھے اور صدر کی تشکیل کردہ سیاسی جماعت کا بارود گیلا ہو گیا تھا۔ ہمیں ماننا پڑے گا اس کڑے وقت میں صرف راشد قریشی اور ان کا موبائل فون تھا جس نے آخری وقت تک صدر پرویز مشرف کا ساتھ دیا تھا۔

جنرل راشد قریشی نے گزشتہ روز مجھے فون کیا' وہ تھوڑے سے اداس تھے' ان کا فرمانا تھا وہ دو' تین دن بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے چنانچہ وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا فرمانا تھا" جاوید آپ کے ساتھ میرا بڑا اچھا رابطہ رہا' میں نے آپ کو جب بھی فون کیا' آپ نے میری بات بڑے غور سے سنی' میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں" مجھے جنرل راشد قریشی کی بات سن کر خوشی ہوئی کیونکہ یہ میری زندگی کے پہلے ترجمان' پریس سیکرٹری یا میڈیا ایڈوائزر تھے جنہوں نے رخصت ہوتے وقت مجھے فون کیا تھا جبکہ میری زندگی کے باقی تمام میڈیا ایڈوائزر اپنی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے مجھے کھانے کی دعوت دیتے تھے اور یہ ان کے ساتھ میری پہلی اور آخری ملاقات ہوتی تھی کیونکہ وہ اس کے بعد اس طرح غائب ہو جاتے تھے جس طرح شام کے رنگ رات کے اندھیرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ میں نے جنرل راشد قریشی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے عرض کیا" آپ اور آپ کے باس میری گستاخیوں سے خاصے ناراض تھے' میری طرف سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں" جنرل صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے "نہیں جاوید! تم اپنا کام کر رہے تھے' ہم اپنا کام کر رہے تھے' کام ختم ہو گیا ناراضی بھی ختم ہو گئی" میں نے بھی قہقہہ لگایا اور عرض کیا" جنرل صاحب ہمارا کام ہی کچھ اس نوعیت کا ہے' حکومت اور حکمران نور ہی سے کیوں نہ بنے ہوں وہ ہمارے ساتھ راضی نہیں رہ سکتا' کل تک آپ ہمارے ساتھ ناراض تھے' آج آصف علی زرداری ہمیں گمراہ' ناسمجھ اور جاہل سمجھ رہے ہیں اور کل کو جب میاں نواز شریف اقتدار میں آئیں گے تو وہ ہمارے ساتھ ناراض ہو جائیں گے" جنرل صاحب ہنس پڑے اور بولے "ایسا کیوں ہوتا ہے" میں نے عرض کیا" ہم لوگ بڑے بدقسمت ہیں ہم اس وقت تک سچے' کھرے اور محب وطن ہوتے ہیں جب تک سیاستدان اور حکمران سڑکوں پر ہوتے ہیں لیکن جس دن یہ لوگ اقتدار کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں اسی دن ہم لوگ ان کی نظروں میں نیگیٹو مائنڈڈ' نیرو مائنڈڈ' جاہل' ناسمجھ' گمراہ اور کرپٹ ہو جاتے ہیں"۔

جنرل صاحب سنتے رہے‘ میں نے عرض کیا” جناب ہمارے حکمران جوں جوں اقتدار میں آگے بڑھتے ہیں وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب حکمران میڈیا سے ”پولیس مقابلہ“ شروع کر دیتے ہیں اور یہ ان کا آخری وقت ہوتا ہے“ جنرل صاحب نے قہقہہ لگایا‘ دوبارہ شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔

جنرل راشد قریشی کے فون کے بعد میں دیر تک اپنی بدقسمتی پر غور کرتا رہا‘ اس دوران مجھے خالد سلیم موٹا کا ایک انٹرویو یاد آ گیا‘ خالد سلیم موٹا پاکستانی فلموں کا ایک چھوٹا سا اداکار تھا‘ یہ دس بارہ ایکسٹرا کا گروپ تھا جو فلموں میں گن مینوں اور مشٹنڈوں کا کردار ادا کرتے تھے اور تمام فلموں میں ان کے تین چار قسم کے رول ہوتے تھے‘ یہ ہیروئن کو چھیڑتے تھے اور عین بازار میں ہیروئن یا ہیرو سے مار کھاتے تھے‘ یہ ولن کے ساتھ ہیرو پر حملہ کرتے تھے‘ ہیرو کی غیرت جاگتی تھی اور وہ اکیلا تیرہ‘ چودہ مشٹنڈوں کو ”دھن“ کر رکھ دیتا تھا اور یہ ولن کے ساتھ مل کر لڑکیاں اٹھاتے تھے اور خوب مار کھاتے تھے۔ میں نے بچپن میں ان لوگوں کو تمام فلموں میں دیکھا اور تمام فلموں میں ان کا ایک ہی قسم کا رول تھا۔ خالد سلیم موٹا سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا تھا” آپ اپنے رول سے مطمئن ہیں“ خالد سلیم موٹا نے فوراً جواب دیا” کہاں کا رول‘ ہم نے تو ہر فلم میں مار ہی کھانا ہوتی ہے“ اس نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا تھا” فلم اردو میں ہو‘ سندھی‘ پشتو یا انگریزی میں ہو‘ اس کی سٹوری کوئی بھی ہو‘ اس کا پروڈیوسر کوئی بھی ہو‘ ڈائریکٹر اور رائٹر کوئی بھی ہو اور اس کا ہیرو‘ ہیروئن اور ولن کوئی بھی ہو لیکن ہمارا رول فکس ہوتا ہے‘ فکس ہم نے اس فلم میں مار ہی کھانا ہوتی ہے“ خالد سلیم موٹا کی طرح ہم صحافیوں کا رول بھی اس معاشرے میں ہے‘ حکومت جنرل ضیاء الحق کی ہو‘ شوکت عزیز کی ہو‘ چودھری شجاعت حسین یا پرویز الٰہی کی ہو‘ اس ملک کے حکمران صدر پرویز مشرف ہوں‘ آصف علی زرداری ہوں یا میاں نواز شریف ہوں ہم لوگوں نے طعنے ہی سہنا ہوتے ہیں گالیاں ہی کھانا ہوتی ہیں اور ملزم اور مجرم ہی کہلانا ہوتا ہے‘ اس ملک میں خالد سلیم موٹا کی طرح ہمارا رول بھی فکس ہے چنانچہ آپ کوئی بھی دور حکومت نکال کر دیکھ لیجئے آپ کو میڈیا وہ واحد شعبہ ملے گا جس سے تمام حکومتیں اور تمام حکمران ناراض ہوں گے جسے وہ اپنا دشمن‘ دشمن کا آلہ کار‘ جاہل‘ کم عقل اور گمراہ سمجھ رہے ہوں گے۔ آپ آج کے حالات ہی دیکھ لیجئے صدر پرویز مشرف میڈیا کو طعنے دیتے دیتے رخصت ہو گئے‘ آصف علی زرداری کے ساتھی آج کل طعنوں کی توپوں کو تیل دے رہے ہیں اور میاں نواز شریف جب اپنے سائنس دانوں کے ساتھ میدان میں اتریں گے تو وہ بھی ہمیں نیگیٹو مائنڈڈ‘ گمراہ اور ناسمجھ کہیں گے لیکن آپ دلچسپ حقیقت ملاحظہ کیجئے مجھے حکمرانوں کے اس رویے پر قطعاً کوئی افسوس نہیں ہوتا کیونکہ شوریدہ سر آندھیوں کے سامنے دیا جلانے کی ذمہ داری ہم لوگوں نے خود اٹھائی تھی‘ مکر و فریب اور جھوٹ کے اس تالاب میں کنول کی قلمیں ہم لوگوں نے خود رکھنا شروع کی تھیں چنانچہ افسوس کس چیز کا لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی ایک خواہش ضرور سر اٹھاتی ہے کہ اندھے اقتدار کی ان اندھی دیواروں میں کوئی ایک تو آنکھ والا ہو‘ بہروں کے اس محل میں کوئی ایک شخص تو ایسا آئے جو سسکیوں اور آہوں کی آہٹ سن سکے اور بے حسی کے اس شہر میں کوئی ایک شخص تو ہو جسے لوگوں کے ٹوٹے‘ جلتے اور سلگتے خوابوں کی تپش محسوس ہوتی ہو اور جھوٹ کے اس بازار میں سچ کی کوئی ایک دکان تو ہو مگر افسوس مردوں کے اس شہر میں کسی قبر پر آنکھ کا کتبہ نہیں لگا اور فریب کے اس بازار میں سچ کی کوئی دکان نہیں کھلی چنانچہ اس بازار‘ اس قبرستان اور اس ملک میں سچ بولنے والوں کا رول فکس ہے۔ ان لوگوں نے ہر حکومت سے جوتے کھانے ہیں اور ان کی قسمت کا ایک تارا مسیح چلا گیا ہے‘ دوسرا آ گیا ہے اور تیسرا تیاری کر رہا ہے اور یہ ہے غلام معاشروں کے آزاد صحافیوں کا مقدر۔

نوجوان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی‘ وہ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے سے فون کر رہا تھا اور اس کے لہجے میں دیہاتی پن تھا‘ وہ بولا ”سر آپ لوگ ہمارے مجرم ہیں‘ ہم لوگ چند ماہ بعد پورے میڈیا کا گریبان پکڑیں گے“ میں نے پوچھا ”بیٹا ہم نے کیا جرم کیا‘ ہم نے کیا قصور کیا“ وہ بولا ”آپ لوگ پرویز مشرف کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے تھے‘ آپ اسے آمر کہتے تھے‘ غاصب کہتے تھے‘ قاتل کہتے تھے‘ آپ لوگوں کا کہنا تھا صدر پرویز مشرف سیاسی نظام کو چلنے نہیں دے رہا‘ وہ ججز کی بحالی کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور ان کی وجہ سے ملک دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے“ وہ سانس لینے کیلئے رکا تو میں نے فوراً لقمہ دیا ”کیا ہم غلط کہتے تھے“ وہ فوراً بولا ”18 اگست 2008ء کو جب صدر پرویز مشرف نے استعفیٰ دیا تو اس وقت تک میں بھی آپ لوگوں کا حامی تھا لیکن جوں ہی صدر نے استعفیٰ دیا اور حکمران اتحاد ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہو گیا تو میری رائے میں پہلی لکیر آئی‘ چوبیس گھنٹے گزرے اور پاکستان پیپلز پارٹی نے ججز بحال نہ کئے تو میرے خیالات میں دوسری لکیر آئی‘ پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کے درمیان اختلافات ہوئے اور یہ اختلافات ختم کرانے کیلئے اسفند یار ولی اور مولانا فضل الرحمٰن کی کمیٹی بنی تو میری رائے میں تیسری لکیر آ گئی‘ اس کمیٹی نے جب اختلافات دور کرنے کیلئے 72 گھنٹے مانگے تو چوتھی لکیر آئی‘ 72 گھنٹے کے بعد جب معاملہ پارلیمنٹ میں لے جانے کا فیصلہ ہوا تو پانچویں لکیر آ گئی‘ اسی دوران آصف علی زرداری صدارت کے امیدوار بنے تو میرے یقین میں آٹھ دس لکیریں اکٹھی آ گئیں اور جب یہ بیان دیا گیا کہ معاہدے قرآن اور حدیث نہیں ہوتے تو میرا اعتماد پوری طرح چکنا چور ہو گیا اور میں آج یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں صدر پرویز مشرف اور موجودہ حکمرانوں میں کیا فرق ہے؟ میں آج یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا اگر صدر پرویز مشرف یہ کہتا تھا میں ماضی کے سیاسی لیڈروں کو پاکستان نہیں آنے دوں گا تو وہ غلط نہیں کہتا تھا اور وہ جب یہ کہتا تھا یہ لوگ مفاد پرستوں کا ٹولہ ہیں تو بھی وہ غلط نہیں کہتا تھا“ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا‘ وہ بولا ”مجھے آپ بتایئے کیا عدلیہ نے اس لئے مار کھائی اور وکلاء اور سول سوسائٹی نے اس لئے تحریکیں چلائی تھیں کہ آخر میں اقتدار کے دستر خوان پر روٹیاں اور بوٹیاں تقسیم کر لی جائیں‘ کیا یہ وہ سویرا تھا جس کی نوید آپ ہمیں سناتے رہے تھے‘ کیا یہ وہ خواب تھے جن کی تعبیر سے موجودہ صورت حال برآمد ہونا تھی‘ اگر یہی وہ خواب‘ یہی وہ خواہش اور یہی وہ تعبیر تھی تو صدر پرویز مشرف میں کیا خرابی تھی‘ وہ بھی تو یہی کر رہا تھا‘ اس نے بھی تو عدلیہ کو معطل کر رکھا تھا‘ وہ بھی تو اعتدال پسندی اور روشن خیالی کے پھریرے لہرا رہا تھا‘ اس نے بھی تو دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کر رکھی تھی‘ وہ بھی تو معاہدوں اور وعدوں کا پاس نہیں کرتا تھا‘ وہ بھی تو امریکہ کو خوش رکھتا تھا چنانچہ صدر مشرف اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے“ میں نے عرض کیا ”بیٹا لیکن وہ آمر تھا‘ فوجی ڈکٹیٹر تھا اور سولائزڈ معاشروں میں ڈکٹیٹر شپ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی‘ ڈکٹیٹر انسانی حقوق کے قاتل ہوتے ہیں“ اس نے قہقہہ لگایا اور بلند آواز میں بولا ”انسانی حقوق‘ واہ کون سے انسانی حقوق‘ وہ انسانی حقوق جو ڈالر کو 76 روپے کر دیں‘ وہ انسانی حقوق جو پٹرول کو 86 روپے لیٹر کر دیں‘ جس میں لوگوں کو آٹا نہ ملے‘ جس میں اغواء برائے تاوان پیشہ بن جائے‘ جس میں ملک کی تین چوتھائی آبادی بھکاری بن جائے‘ جس میں لوگ انتقام لینے کیلئے خودکش جیکٹس تلاش کر رہے ہوں‘ جس میں صوبہ سرحد میں حکومتی رٹ ختم ہو جائے اور جس میں بلٹ پروف گاڑی کے بغیر کوئی سیاستدان سڑک پر نہ آ سکے‘ یہ وہ انسانی حقوق تھے جو صدر پرویز مشرف نے غصب کر رکھے تھے اور میں آپ کو یہ واضح طور پر کہہ رہا ہوں تین ماہ بعد‘ صرف تین ماہ بعد آپ لوگ اس ملک کے سب سے بڑے مجرم ہوں گے اور ہم آپ کا گریبان پکڑیں گے“ جوان نے اتنا کہا اور غصے سے فون بند کر دیا۔

یہ صدر پرویز مشرف کے حق میں پہلی آواز تھی اور اس آواز نے مجھے روح کی آخری حدوں تک ہلا کر رکھ دیا‘ میں صدر پرویز مشرف کا مخالف تھا‘ جنرل پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999ء کو جمہوریت پر شب خون مارا تو میں نے 13 اکتوبر کو اس کے خلاف لکھنا شروع کیا اور آج تک اس محاذ پر ڈٹا ہوا ہوں لیکن اس نوجوان کی گفتگو کے بعد مجھے پہلی بار محسوس ہوا صدر پرویز مشرف زیادہ غلط نہیں تھا‘ یہ درست ہے وہ آمر اور غاصب تھا‘ اس نے اقتدار کے دوران بے شمار غلط فیصلے کئے تھے اور ان فیصلوں کے نتیجے میں یہ ملک اب ناقابل اصلاح ہو چکا ہے‘ ہم لوگ ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی پکڑ کر بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں اور بس ایک چنگاری ہاتھ سے نکلنے کی دیر ہے اور یہ سارا سسٹم بھک سے اڑ جائے گا مگر سوال یہ ہے صدر پرویز مشرف کے بعد ہم کہاں آ گئے ہیں؟ کیا یہ وہ جمہوریت تھی جس کے خواب ہم نو برس تک دیکھتے رہے؟ کیا اس جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلنا تھا جو ہم دو برس سے

اس ملک کی سڑکوں پر کاشت کر رہے ہیں؟ کیا ہماری آنکھوں نے اس فصل کیلئے کانٹوں میں اپنی بینائی پروئی تھی اور کیا یہ وہ اعتماد اور یقین تھا جو نو برسوں تک فوجی بوٹوں تلے کچلا جاتا رہا تھا۔ آج ہمارے حکمرانوں نے ثا[illegible] چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ایک بے وقوف شخص تھا' وہ زمینی حقائق سے واقف ہی نہیں تھا اور اسے 9 مارچ 2007ء کو صدر پرویز مشرف کے تمام مطالبے مان لینے چاہئے تھے' اسے گھروں سے غائب 610 لوگوں کی پٹیشن ردی کی ٹوکری میں پھینک دینی چاہئے تھی' اسے سٹیل مل چپ چاپ کوڑیوں کے مول بکنے دینی چاہئے تھی اور اسے سو موٹو ایکشن کے ذریعے عوام کو انصاف اور ریلیف دینے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا' اسے وزیراعظم شوکت عزیز سے چک شہزاد میں تیس پینتیس کروڑ روپے کا فارم ہاؤس لینا چاہیے تھا اور 2013ء تک اختیار اور اقتدار سے لطف اندوز ہونا چاہیے تھا' وہ بے وقوف انسان تھا جس نے اصولوں کی خاطر اپنے بچے بھوکے مروا دیئے' ہمارے حکمرانوں نے ثابت کر دیا 2 نومبر 2007ء کو پی سی او پر حلف نہ اٹھانے والے 60 ججز بھی بے وقوف تھے' ان لوگوں نے ناحق اپنی نوکریوں' مراعات اور اختیارات کی قربانی دی' انہیں چاہئے تھا وہ زمینی حقائق کو سمجھتے اور چپ چاپ صدر مشرف کی عدلیہ کا حصہ بن جاتے' 18 فروری کو پاکستان مسلم لیگ ق کو مسترد کرنے والے عوام بھی بے وقوف تھے' انہیں چاہیے تھا وہ مسلم لیگ ق کے 260 ارکان کو ووٹ دیتے اور زندگی آرام سے گزار دیتے' حکمرانوں نے ثابت کر دیا نو مارچ' 12 مئی اور 7 اگست کے وعدوں پر یقین کرنے والے لوگ بھی بے وقوف تھے' ان لوگوں کو زمینی حقائق کو تسلیم کرنا چاہیے تھا' ان کو مان لینا چاہیے تھا سیاست سیاست ہوتی ہے' اس کے سینے میں دل ہوتا ہے' ایمان اور نہ ہی اصول اور وعدے اور معاہدے توڑنے کیلئے کئے جاتے ہیں نبھانے کیلئے نہیں اور حکمرانوں نے ثابت کر دیا آج بھی جو لوگ تبدیلی' اصول اور جمہوریت کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ سب بے وقوف اور نادان ہیں اور ان تمام نادان اور بے وقوفوں کو اٹھا کر بحیرہ عرب میں پھینک دینا چاہیے' ان لوگوں نے ثابت کر دیا اس ملک میں اصول' ایمان اور یقین کی کوئی ضرورت نہیں' اس ملک میں خواب اور خواہش پالنے والوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ہمارے حکمرانوں کی یہ فتوحات جاری رہیں تو چند مہینوں میں صدر پرویز مشرف جیسے غاصب اور آمر ہیرو بن جائیں گے اور ہم عوام سے شرمندہ شرمندہ پھریں گے۔

رین ہولڈ مسنر ایک مہم جو ہے' وہ جوانی میں بلند ترین چوٹیاں سر کرنے کے خبط میں مبتلا ہو گیا اور وہ دنیا کا واحد مہم جو تھا جس نے مہم جوئی کے سازو سامان حتیٰ کہ آکسیجن کے بغیر دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کی تھی' وہ دنیا کا سب سے پہلا مہم جو ہے جس نے آٹھ ہزار میٹر سے بلند 14 چوٹیاں سر کی تھیں' مجھے چند برس پہلے اس کا ایک انٹرویو پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا' یہ انٹرویو اس نے برسوں پہلے نیشنل جیوگرافک کو دیا تھا' اس انٹرویو میں اس نے انکشاف کیا وہ جب تازہ تازہ مہم جوئی کے شعبے میں آیا تھا اور وہ جب کوئی چوٹی سر کرنے جاتا تھا تو وہ دنیا جہاں کا سامان ساتھ لے جاتا تھا' وہ مختلف قسم کے کپڑے بیگ میں ڈال لیتا تھا' وہ پانچ چھ قسم کے جوتے ساتھ لیتا تھا' وہ دس بیس کتابیں بھی پیک کر لیتا تھا' وہ ٹیپ ریکارڈر' کیسٹس اور وائلن بھی ساتھ لے لیتا تھا اور وہ دو تین قسم کے خیمے' کمبل' سلیپنگ بیگ اور دریاں بھی ساتھ رکھ لیتا تھا' وہ کئی برسوں تک یہ بندوبست کرتا رہا لیکن پھر جب وہ زندگی میں پہلی بار ذرا سا بلند پہاڑ سر کرنے نکلا تو زندگی کے بارے میں اس کا زاویہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے انٹرویو میں انکشاف کیا' وہ جب پہاڑ کے درمیان میں پہنچا تو اسے محسوس ہوا اس نے اپنی برداشت سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہے اور وہ اس وزن کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکے گا چنانچہ اس نے سب سے پہلے فالتو کمبل' اضافی سلیپنگ بیگ' دری اور وائلن ایک چٹان پر چھوڑ دیا' وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اسے باقی سامان بھی فالتو محسوس ہوا چنانچہ اس نے کیسٹ ریکارڈر' ٹیپس' کتابیں اور کھانے پینے کا اضافی سامان بھی راستے میں پھینک دیا' وہ مزید آگے بڑھا تو اسے محسوس ہوا وہ چوٹی سے زیادہ دور نہیں لیکن اگر اس نے اپنا سامان مزید کم نہ کیا تو وہ چوٹی تک نہیں پہنچ سکے گا' اس نے فوری طور پر باقی فالتو سامان بھی پھینک دیا' وہ مزید آگے بڑھ گیا لیکن وہ جب چوٹی سے چند گز کے فاصلے پر رہ گیا تو وہ تھک کر چور ہو گیا' چوٹی اب اس کی نظروں کے سامنے تھی لیکن اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی' اس وقت اس کے پاس صرف دو آپشن تھے' وہ چوٹی کو چھوئے بغیر واپس لوٹ جائے یا پھر وہ اپنا سارا سامان نیچے پھینک دے اور تن تنہا چوٹی تک پہنچ جائے۔ اس نے تھوڑی دیر سوچا' اپنے کندھے سے سامان اتار کر نیچے رکھا اور چوٹی کی طرف چل پڑا یوں اس نے زندگی کی پہلی بلند ترین چوٹی چھو لی' اس کا کہنا تھا چوٹی پر پہنچ کر اس نے سوچا تھا اس کی زندگی کا اصل مقصد چوٹی سر کرنا تھا لیکن اس نے اپنی توجہ اپنے اصل مقصد سے ہٹا کر دوسرے مسائل میں الجھا دی تھی' اس کا کہنا تھا دنیا یہ نہیں دیکھتی مہم جو نے کس برانڈ کے بوٹ پہن رکھے ہیں' اس کے پاس کتنی جیکٹس ہیں' وہ کتنے خیمے لے کر گھر سے نکلا ہے اور وہ مہم جوئی کے دوران کیا کیا کھاتا رہا ہے۔ دنیا بس یہ دیکھتی ہے کیا مہم جو اس مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے جو وہ لے کر گھر سے نکلا تھا؟ اس کا کہنا تھا اگر انسان کا مقصد صاف اور شفاف ہو اور انسان نے اپنے ارادے کو اس مقصد کے ساتھ نتھی کر رکھا ہو تو انسان اسباب اور سازو سامان کی محتاجی سے آزاد ہو جاتا ہے اور اگر انسان کا مقصد صاف نہ ہو تو وہ حالات اور اسباب میں الجھ جاتا ہے اور یوں وہ زندگی کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

میں نے جب سے حکمران اتحاد کو الجھتے دیکھا ہے مجھے اس وقت سے رین ہولڈ مسنر کا وہ انٹرویو یاد آ رہا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے پاکستان بڑی تیزی سے بنگلہ دیش ماڈل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ میں بات کو آگے بڑھانے سے قبل آپ کو بنگلہ دیش ماڈل کے بارے میں بتاتا چلوں بنگلہ دیش میں حکومت کا نظام باقی دنیا سے مختلف ہے' بنگلہ دیش میں پانچ سال بعد جب الیکشن کا وقت آتا ہے تو سپریم کورٹ کے تازہ ترین ریٹائرڈ چیف جسٹس کو وہاں نگران وزیراعظم بنا دیا جاتا ہے' بنگلہ دیش میں کیئر ٹیکر پرائم منسٹر کو چیف ایڈوائزر کہا جاتا ہے' یہ چیف ایڈوائزر حکومت سنبھالنے کے بعد دس رکنی کابینہ بناتا ہے اور یہ کابینہ 90 دن کے اندر الیکشن کرا دیتی ہے۔ اکتوبر 2006ء تک بنگلہ دیش میں بی این پی یعنی بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کی حکومت تھی اور بیگم خالدہ ضیاء اس حکومت کی وزیراعظم تھیں۔ خالدہ ضیاء کی حکومت ختم ہوئی تو چیف جسٹس کے ایم حسن نے چیف ایڈوائزر کا عہدہ سنبھالنا تھا لیکن بنگلہ دیش کی دوسری بڑی پارٹی عوامی لیگ نے چیف جسٹس پر جانبداری کا الزام لگا دیا چنانچہ چیف جسٹس نے کیئر ٹیکر پرائم منسٹر بننے سے انکار کر دیا جس کے بعد صدر ایاجو دالدین احمد چیف ایڈوائزر بن گئے لیکن عوامی لیگ نے انہیں تسلیم نہ کیا یوں بنگلہ دیش میں سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔ عوامی لیگ کی لیڈر حسینہ واجد نے الزام لگایا کہ خالدہ ضیاء نے پانچ سالہ اقتدار کے دوران تحصیل لیول تک اپنے ورکرز کو سرکاری ملازمتیں دی تھیں اور صدر سے لے کر ایس ایچ او تک سب بی این پی کے ورکرز ہیں۔ حسینہ واجد نے الزام لگایا سابق حکومت نے ووٹر لسٹیں تک اپنی مرضی کی تیار کی ہیں چنانچہ ان حالات میں فیئر اینڈ فری الیکشن ممکن نہیں۔ الزام بازی کے اس

مقابلے کے دوران بنگلہ دیش میں ہنگامے شروع ہو گئے' ان ہنگاموں کے دوران ملکی حالات خراب ہو گئے یہاں تک کہ 3 جنوری 2007ء کو عوامی لیگ نے اپنی 18 اتحادی جماعتوں کے ساتھ الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جس کے بعد ملک میں فسادات' گھیراؤ جلاؤ اور کریک ڈاؤن شروع ہو گئے۔ بنگلہ دیش میں آنے والے دنوں میں حالات اتنے خراب ہوئے کہ فوج مداخلت پر مجبور ہو گئی' فوج نے صدر کو دبایا جس کے نتیجے میں صدر نے چیف ایڈوائزر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور فوج نے ورلڈ بینک کے ایک سابق مشیر فخر الدین احمد کو کیئر ٹیکر پرائم منسٹر بنا دیا۔ فخر الدین احمد نے 12 جنوری 2007ء کو اقتدار سنبھالا اور ملک میں بڑے پیمانے پر احتساب شروع کر دیا۔ حکومت نے جولائی 2007ء میں دو لاکھ سیاستدان' سیاسی ورکرز اور سرکاری ملازم گرفتار کر لئے اور ان سے کرپشن کے اربوں روپے برآمد کر لئے' کیئر ٹیکر پرائم منسٹر نے سیاسی نظام کو بہتر بنانے کیلئے خالدہ ضیاء اور حسینہ واجد کو زبردستی جلاوطن کرنے کا اعلان بھی کیا لیکن وہ سیاسی دباؤ کی وجہ سے اس اعلان پر عملدرآمد نہ کر سکے۔ بہر حال قصہ مختصر 12 جنوری 2007ء سے آج 24 اگست 2008ء تک بنگلہ دیش میں کیئر ٹیکر حکومت قائم ہے' اس حکومت کو فوج کی حمایت حاصل ہے اور بنگلہ دیش میں دور' دور تک الیکشن کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ ہم اگر پاکستان کے موجودہ حالات اور بنگلہ دیش کی حکومت کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے ہم بڑی تیزی سے بنگلہ دیش ماڈل کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے یہ حالات پیدا کس نے کئے' حالات کی اس خرابی کا ذمہ دار کون ہے؟

ہم حالات کی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو ہمیں ماننا پڑے گا اس صورتحال کی تمام تر ذمہ داری آصف علی زرداری کے سر جاتی ہے' آصف علی زرداری نے 9 مارچ 2008ء کو سمجھوتہ کیا اور 30 اپریل کو یہ سمجھوتہ توڑ دیا' 12 مئی کو وعدہ کیا وہ توڑ دیا اور 5 اگست اور 7 اگست 2008ء کو دو تحریری معاہدے کئے اور یہ معاہدے بھی پورے ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت بظاہر ججوں کو بحال کرتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی چنانچہ اب کیا ہو گا؟ اب پاکستان مسلم لیگ حکومت سے الگ ہو جائے گی جس کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی' ایم کیو ایم' فاٹا کے ارکان اور مسلم لیگ ق کے ساتھ مل کر نئی حکومت بنائے گی' چالیس وزارتیں تقسیم کرے گی' ایم کیو ایم اور مسلم لیگ ق کے ہاتھوں بلیک میل ہو گی' حکومت کو زیادہ سے زیادہ اکتوبر نومبر تک کھینچ کر لے جائے گی اور پھر ہم بنگلہ دیش میں جا گریں گے اور بس۔ یہاں پر ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا صرف اور صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ آصف علی زرداری رین ہولڈ مسنر کی طرح اپنے مقصد میں واضح نہیں ہیں' قدرت نے انہیں اس ملک کا لیڈر بننے کا موقع دیا تھا لیکن وہ گارڈ فادر بن رہے ہیں' وہ لیڈر کی بجائے حکمران بن رہے ہیں چنانچہ انہوں نے چوٹی سر کرنے کی بجائے سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے' وہ بھول گئے ہیں تاریخ صرف لیڈروں کو یاد کیا کرتی ہے صدروں اور چیئر مینوں کو نہیں۔

چندری گل

یہ دنیا کتاب ہے اور کتاب کے بعض واقعات مقناطیس کی طرح آپ کے دماغ میں چپک جاتے ہیں' اسی قسم کا ایک واقعہ چند ماہ قبل پاکستان مسلم لیگ ن کے ایک عہدیدار نے سنایا تھا' یہ عہدیدار میاں برادران کے بہت قریب ہے اور عموماً ان کی اہم میٹنگز میں بھی شریک ہوتا ہے' حکومت کے قیام کے چند دن بعد میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف اور آصف علی زرداری کی ایک میٹنگ تھی' میٹنگ کے دوران آصف علی زرداری نے میاں برادران سے کہا "ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہوگا؟ میاں صاحب میں پریشان ہوں' میں کہاں سے شروع کروں' کس چیز کو ٹھیک کروں' کس کو بہتر بناؤں اور کس معاملے کو وقت پر چھوڑ دوں" میاں شہباز شریف نے یہ بات سنی تو وہ مسکرائے اور آصف علی زرداری سے کہا "زرداری صاحب ہماری والدہ پنجابی ہیں' وہ ہمیشہ پنجابی میں گفتگو کرتی ہیں اور وہ بچپن سے ہمیں ایک نصیحت کرتی چلی آ رہی ہیں" آصف علی زرداری نے فوراً صوفے پر کروٹ بدلی اور اپنی "گاڈ فادر" مسکراہٹ کے ساتھ بولے "مینوں پنجابی آندی اے' تسی پوری گل پنجابی وچ کرو" میاں شہباز شریف آصف علی زرداری کے منہ سے پنجابی سن کر حیران رہ گئے' ان کا خیال تھا آصف علی زرداری سندھی بلوچ ہیں' محترمہ بے نظیر بھٹو کے قریب رہے ہیں چنانچہ انہیں سندھی' بلوچی اور انگریزی آتی ہوگی لیکن آصف علی زرداری نے پنجابی بول کر سب کو حیران کر دیا' زرداری صاحب اور میاں شہباز شریف کی فطرت میں بہت فرق ہے' زرداری صاحب فیصلے میں بہت وقت لگاتے ہیں' یہ وقت بعض اوقات اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ اس کے بطن سے جو فیصلہ نکلتا ہے اس پر عملدر آمد کی نوبت ہی نہیں آتی جبکہ میاں شہباز شریف ایک عملی انسان ہیں اور یہ اکثر اوقات کام پہلے شروع کر دیتے اور فیصلہ بعد میں کرتے ہیں' بہر حال دونوں کی عادت کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں اور کچھ منفی بھی لیکن فطرت کے اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک قدر مشترک بھی ہے' دونوں حضرات کو زبانیں سیکھنے کا بہت شوق ہے' آصف علی زرداری بھی مختلف زبانوں کے مختلف الفاظ سیکھتے رہتے ہیں اور میاں شہباز شریف بھی نصف درجن زبانیں روانی سے بول سکتے ہیں' ہم واپس واقعے کی طرف آتے ہیں' میاں شہباز شریف نے آصف علی زرداری کو بتایا "ہماری والدہ نے ہمیں بچپن سے سکھایا تھا' انسان کو کبھی منہ سے چندری گل نہیں نکالنی چاہیے" زرداری صاحب سنجیدگی سے میاں صاحب کی طرف دیکھتے رہے' میاں صاحب نے بتایا "ہم پنجابی لوگ بری بات کو چندری گل کہتے ہیں اور ہمارے خاندانوں میں صدیوں بلکہ ہزاروں سالوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ دن میں بے شمار قبولیت کی گھڑیاں ہوتی ہیں اور قبولیت کی گھڑی میں آپ کے منہ سے کوئی چندری گل نکل جائے تو قدرت بری بات کو قبول کر لیتی ہے اور وہ بری بات بعد ازاں سچ ثابت ہو جاتی ہے چنانچہ ہماری والدہ نے بچپن سے ہمیں ٹریننگ دی تھی حالات کیسے بھی ہوں مگر کبھی منہ سے چندری گل نہ نکالیں' ہم سب بہن بھائی والدہ کی اس بات پر ہمیشہ عملدر آمد کرتے ہیں لیکن 1999ء میں میرے منہ سے ایک بار چندری گل نکل گئی تھی اور وہ قبولیت کا وقت تھا اور بعد ازاں ہمارے پورے خاندان نے اس چندری گل کا خمیازہ بھگتا" میاں شہباز شریف خاموش ہو گئے۔

آصف علی زرداری بڑی توجہ سے میاں صاحب کی بات سنتے رہے' میاں صاحب نے بتایا' ہم لوگوں نے پچھلے دور میں سیف الرحمٰن پر بہت اعتماد کیا تھا اور یہ ہماری بڑی غلطی تھی' سیف الرحمٰن میں اتنی صلاحیت نہیں تھی جتنی بڑی ذمہ داری ہم نے اس پر ڈال دی تھی چنانچہ جب وہ غلطیاں کرتے تھے تو میں میاں نواز شریف صاحب کے سامنے احتجاج کرتا تھا اور اس احتجاج کی وجہ سے میرے سیف الرحمٰن خان کے ساتھ تعلقات خراب ہو گئے تھے' 1999ء کے ستمبر میں وزیراعظم ہاؤس میں ایک اجلاس تھا' اس اجلاس میں سیف الرحمٰن بھی شامل تھے' میری ان کے ساتھ تلخ کلامی ہو گئی' اجلاس ختم ہوا تو میں نے سلام کیلئے سیف الرحمٰن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سیف الرحمٰن نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا' اسی دوران ان کا سیکرٹری ہاتھ ملانے کیلئے میری طرف بڑھا تو خان صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے' وہاں موجود تمام لوگ ان کے رویے پر حیران رہ گئے' مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے شرمندگی کے اس عالم میں چودھری نثار علی کو مخاطب کر کے کہا' چودھری صاحب میری بات لکھ لیں یہ شخص ہمیں چھ مہینے میں جیل تک لے جائے گا' بس میرے منہ سے چندری گل نکلنے کی دیر تھی اور حالات خراب ہونا شروع ہو گئے' 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جب مجھے مری سے لانڈھی جیل لے جایا گیا اور وہاں میری ملاقات چودھری نثار علی خان سے ہوئی تو میں نے انہیں وہ وقت یاد کرایا اور ان سے کہا' چودھری صاحب میری والدہ نے مجھے منع کیا تھا' بیٹا کبھی منہ سے چندری گل ناں نکالنا

مگر میرے منہ سے بری بات نکل گئی اور ہم آج جیل میں بیٹھے ہیں' کاش میں اس وقت اپنا غصہ پی گیا ہوتا" میاں شہباز شریف رکے' انہوں نے لمبا سانس لیا اور آصف علی زرداری سے مخاطب ہو کر بولے "زرداری صاحب میں آج ایک بار پھر چندری گل نکالنے لگا ہوں' مجھے اللہ معاف کرے گا اور اللہ کرے میری بات غلط ثابت ہو لیکن میں کوشش کے باوجود اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا" آصف علی زرداری آگے جھک گئے' میاں شہباز شریف نے دور کونے میں بیٹھے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا اور بولے "مجھے یہ شخص آپ کا سیف الرحمٰن لگتا ہے' یقین کیجئے اس شخص اور سیف الرحمٰن میں کوئی فرق نہیں اور میں آج دعوئی سے کہتا ہوں اگر یہ شخص اسی طرح آپ کا مشیر رہا تو چھ مہینے میں آپ کا بھی وہی انجام ہو گا جو 1999ء میں ہمارا ہوا تھا" میاں شہباز شریف رکے اور دوبارہ بولے "میں دعوئی سے کہتا ہوں یہ شخص آپ سے بے شمار ایسی غلطیاں کرائے گا جن کے نتیجے میں آپ کے وفادار ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے' آپ کی پارٹی آپ سے ناراض ہو جائے گی' حکمران اتحاد ٹوٹ جائے گا' آپ کی حکومت ختم ہو جائے گی اور ہم سب ایک بار پھر 1999ء کی پوزیشن پر آ جائیں گے' اللہ نہ کرے وہ وقت آئے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے میری یہ چندری گل بھی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی" میاں شہباز شریف نے بات مکمل کی اور صوفے کے ساتھ ٹیک لگا دی' آصف علی زرداری نے دور صوفے پر بیٹھے اس شخص کی طرف دیکھا' مسکرائے اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔

مجھے یہ واقعہ میاں برادران کے قریبی دوست نے سنایا تھا' میں پچھلے مہینے میاں شہباز شریف کے ساتھ مری جا رہا تھا تو میں نے راستے میں انہیں یہ واقعہ سنایا اور ان سے اس کی تصدیق چاہی' میاں صاحب نے نہ صرف اس واقعے کی تصدیق کر دی بلکہ افسوس سے کہا "میں جس بحران کو چھ ماہ دے رہا تھا افسوس آصف علی زرداری کے سیف الرحمٰن نے ہمیں اس پر چار ماہ میں پہنچا دیا' مجھے اپنی چندری گل پر افسوس ہے لیکن کیا کیا جائے دنیا کی تمام حکومتوں اور تمام حکمرانوں کی ناکامیوں کے پیچھے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں" میاں صاحب نے اتنا کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے' گاڑی سے باہر مری کی اونچائی شروع ہو چکی تھی' میری گزشتہ روز خواجہ آصف اور چودھری اعتزاز احسن سے ملاقات ہوئی' یہ دونوں حضرات افسردہ تھے' خواجہ آصف کا خیال تھا صرف چالیس گھنٹے باقی ہیں' اگر آصف علی زرداری نے معطل ججز بحال نہ کئے تو ہمیں وہ فیصلہ کرنا پڑے گا جس سے ہم بچنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ اعتزاز احسن کے اندر امید ابھی باقی تھی' ان کا خیال تھا چالیس گھنٹے سے پہلے پہلے کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا' میں نے سوچا لیکن کب تک' اس ایشو کے بعد کوئی دوسرا ایشو آ جائے گا اور اس دوسرے ایشو کے بعد کوئی تیسرا ایشو آ جائے گا یہاں تک کہ دونوں مختلف سمتوں کے مسافر اپنی اپنی سمت میں چل نکلیں گے' یہ سسٹم بیٹھ جائے گا اور ملک ایک بار پھر آمریت کے نہ ختم ہونے والے دور میں داخل ہو جائے گا' ہم ایک بار پھر کسی چندری گل' کسی ان ہونی کا شکار ہو جائیں گے' پتہ نہیں کب ہماری ان سیف الرحمانوں سے جان چھوٹے گی' پتہ نہیں کب ہماری سیاست ان مشیروں سے پاک ہو گی کیونکہ میں نے اسی شام اس شخص کو زرداری ہاؤس سے نکلتے دیکھا تھا اور اس کے آگے اور پیچھے سیکورٹی کی گاڑیاں تھیں۔

میں اب کہاں جاؤں گا'' یہ وہ سوال ہے جو پچھلے تین دن سے صدر (سابق) پرویز مشرف کو کروٹ نہیں لینے دیتا ہو گا' نو برس تک اقتدار اور اختیار کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار رہنے والے شخص کیلئے آج دنیا بھر میں پناہ کی کوئی جگہ نہیں' وہ پاکستان میں اس لئے نہیں رہ سکتے کہ وہ اس ملک میں محفوظ نہیں ہیں' ان کے گرد جوں ہی سیکورٹی کا حصار ختم ہو گا' وہ جوں ہی بم پروف گاڑی سے باہر نکلیں گے اور سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکار دائیں بائیں ہو جائیں گے تو ہمارے محبوب صدر (سابق) خودکش حملہ آوروں کے نرغے میں آ جائیں گے' جس کے بعد حکمران اتحاد بھی عوامی دباؤ میں آ کر انہیں گرفتار کر سکتا ہے اور ان پر غداری کا مقدمہ بھی قائم ہو سکتا ہے چنانچہ پرویز مشرف کو پاکستان سوٹ نہیں کرتا۔ ہمارے محبوب صدر (سابق) سعودی عرب بھی جا سکتے ہیں لیکن اس ملک میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' ہمارے صدر روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے عادی ہیں جبکہ سعودی عرب میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی پر پابندی ہے چنانچہ وہ زیادہ دنوں تک وہاں نہیں رہ سکیں گے۔ ترکی بھی ان کی منزل ہو سکتی ہے لیکن ترکی فدائیوں سے زیادہ دور نہیں' عراق' ایران اور افغانستان سے کسی بھی وقت کوئی ''بھٹکا'' ہوا شخص وہاں پہنچ سکتا ہے اور صدر (سابق) کی قیمتی جان کیلئے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے؟ یورپ بھی صدر کا ٹھکانہ ہو سکتا ہے لیکن یورپ کے لوگ سرکاری خزانے سے کسی سابق دوست کی سیکورٹی کا بوجھ نہیں اٹھاتے چنانچہ یورپی ممالک پرویز مشرف کو لمبے عرصے کیلئے برداشت نہیں کریں گے اور رہ گیا صدر کا عزیز ترین دوست امریکہ! وہ امریکہ جس کیلئے صدر (سابق) پرویز مشرف نے اپنے ایمان تک کی قربانی دی تھی' کیا وہ امریکہ پرویز مشرف کو پناہ دے دے گا؟ کیا اس امریکہ کے پاس پرویز مشرف کیلئے گنجائش ہو گی اور یہ وہ سوال ہے جو صدر (سابق) کو تین دن سے کروٹ نہیں لینے دے رہا ہو گا' کیوں؟ کیونکہ صدر (سابق) بھی جانتے ہیں امریکہ نے آج تک اپنے کسی سابق وفادار کو پناہ نہیں دی۔

صدر (سابق) جانتے ہیں امریکی تاریخ کا سب سے وفادار دوست شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی تھا' یورپی پریس اسے ''امریکن گورنر'' کہتا تھا' وہ امریکی وفاداری میں بہت آگے چلا گیا تھا' شاہ نے ایران میں داڑھی اور پردہ پر پابندی لگا دی۔ اس کے دور میں کوئی باپردہ عورت گھر سے نکلتی تھی تو پولیس سرے عام اس کا برقع پھاڑ دیتی تھی' شاہ ایران نے تمام زنانہ سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکرٹ کو یونیفارم بنا دیا' شراب نوشی' رقص اور زنا کو فیشن بنا دیا' شاہ کے دور میں ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں کالجوں میں شراب کی دکانیں تھیں' یونیورسٹیوں میں خواتین کی سودے بازی ہوتی تھی اور اس مکروہ کاروبار کو قانونی حیثیت حاصل تھی' شاہ کے زمانے میں دو جرنیلوں کے ہم جنس پرست بیٹوں نے آپس میں شادی کی' سرکاری سطح پر نہ صرف ان کی دعوت ولیمہ ہوئی بلکہ شاہ اور اس کی کابینہ نے خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کی۔ شاہ نے امریکہ کی محبت میں ایران میں موجود 42 ہزار امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی لیکن پھر شاہ کی امریکہ نواز پالیسیوں پر بغاوت ہوئی' یہ بغاوت تین سال تک چلتی رہی' شاہ نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا لیکن عوام نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' شاہ نے حکومت شاہ پور بختیار کے حوالے کی اور ملک سے فرار ہو گیا' اس کا خیال تھا امریکہ اب اس کی وفاداریوں کا بدلہ دے گا لیکن جوں ہی شاہ ایران کا طیارہ ایران کی حدود سے نکلا' امریکہ نے آنکھیں پھیر لیں' شاہ پہلے مصر گیا' پھر مراکش' پھر بہاماس اور پھر میکسیکو' وہ اس دوران امریکہ سے مسلسل مدد مانگتا رہا لیکن وائٹ ہاؤس اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتا تھا۔ شاہ ایران سوا سال تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی' امریکہ نے اس کے اکاؤنٹس تک ''سیز'' کر دیئے' آخر میں انور السادات کام آیا اور اس نے اسے مصر میں پناہ دے دی۔ جولائی 1980ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا' انتقال کے وقت اس کے پاس اس کی تیسری بیوی کے سوا کوئی نہ تھا اور کوئی شخص اس کا جنازہ تک پڑھنے نہیں آیا تھا چنانچہ اسے اس کے بیڈ روم ہی میں امانتاً دفن کر دیا گیا۔

شاہ ایران کے بعد ''اناس تاسیوسو'' امریکہ کا دوسرا قریبی دوست تھا' وہ نکاراگوا میں امریکی ایجنٹ تھا' نکاراگوا میں کمیونزم کی تحریک شروع ہوئی تو امریکہ نے اناس تاسیوسو کو ڈالر اور اسلحہ دے کر کمیونزم کے خلاف کھڑا کر دیا۔ تاسیوسو امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑتا رہا' 1979ء میں نکاراگوا میں اس کے لئے حالات مشکل ہو گئے' وہ ملک سے فرار ہوا لیکن جوں ہی اس نے نکاراگوا سے باہر قدم رکھا' امریکا نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا' اس نے امریکہ آنے کی کوشش کی لیکن امریکی حکومت نے اجازت نہ دی' یوں اناس تاسیوسو جنگلوں اور غاروں میں چھپ کر زندگی گزارنے لگا۔ وہ 1980ء میں اسی پریشانی کے عالم میں انتقال کر گیا اور اس کے قریبی دوستوں نے

اسے پیراگوئے کے شہر اسنشن میں دفن کر دیا' آج لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ چلی کا آمر جنرل اگارتے اگستو پنوشے امریکہ کا تیسرا دوست تھا' پنوشے نے 1973ء میں سی آئی اے کی مدد سے جنرل کی منتخب حکومت پر شب خون مارا تھا' وہ اقتدار میں آیا اور اس نے چلی کی عوام کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ پنوشے 1990ء تک چلی پر حکمران رہا' ان 17 برسوں میں پنوشے نے امریکہ کے کہنے پر اپنے ہزاروں شہری قتل کرائے' امریکہ کی ناپسندیدہ تنظیموں پر پابندیاں لگائیں اور امریکہ کی خواہش پر اپنے شہریوں کے انسانی حقوق غصب کئے' یہاں تک کہ 1990ء میں عوام پنوشے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے' وہ مارچ 1990ء میں لندن فرار ہو گیا' اس کا خیال تھا برطانیہ اور امریکہ اس کی وفاداریوں کی قدر کریں گے لیکن لندن آتے ہی برطانوی پولیس نے اسے گرفتار کیا اور اسے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا' اس نے اس ناروا سلوک پر امریکہ سے احتجاج کیا لیکن امریکی حکومت نے اسے جواب تک دینے کی زحمت نہ کی' برطانوی حکومت نے اسے 2000ء میں چلی کے حوالے کر دیا' اس کے خلاف مقدمہ چلا' 3 دسمبر 2006ء کو اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دم توڑ گیا' اس کی موت پر پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں جبکہ امریکی حکومت نے ایک سطر کا تعزیتی پیغام تک جاری نہ کیا۔ انگولا کا باغی سردار ''جوناس سیومبی'' بھی امریکہ نواز لیڈر تھا' وہ برس ہا برس تک انگولا میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا' نومبر 1992ء میں امریکہ نے اسے کیمونسٹوں کے ساتھ امن معاہدے کا حکم دیا' اس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے نتیجے میں جوناس سیومبی بے دست و پا ہو گیا' معاہدے پر دستخطوں کے دو ماہ بعد کیمونسٹوں نے ''ہامبو'' میں اس کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر دیا' وہ فرار ہو گیا' آج اس واقعہ کو 16 سال گزر چکے ہیں لیکن جوناس سیومبی جان بچانے کیلئے چھپتا پھر رہا ہے اور امریکی حکومت اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتی۔ جنرل نوریگا بھی پانامہ میں امریکہ کا آلہ کار تھا' اسے بھی امریکیوں نے کیمونسٹوں کے خلاف استعمال کیا۔ وہ 1990ء تک امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا لیکن امریکہ کی تسلی نہ ہوئی لہٰذا امریکہ نے پانامہ پر حملہ کر دیا' صدر نوریگا گرفتار ہوا' امریکی ایما پر عدالت نے اسے 40 سال قید بامشقت کی سزا سنا دی اور نوریگا گزشتہ 18 برس سے جیل میں امریکی دوستی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ فرڈی نینڈ مارکوس 22 برس تک فلپائن میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا۔ اس نے فلپائن سے کیمونسٹوں کو چن چن کر ختم کر دیا لیکن 1986ء میں امریکہ ہی نے اس کی حکومت ختم کرا دی' مارکوس امریکہ آ گیا' امریکہ نے اسے پناہ تو دے دی لیکن اسے وہ عزت اور وہ توقیر نہ دی جس کا وہ حق دار تھا' یوں مارکوس نے باقی زندگی ہونولولو کے ایک چھوٹے سے مکان میں گزاری اور امریکہ میں اسے ایک عام پناہ گزین کے برابر وظیفہ ملتا تھا' مارکوس 1999ء میں اسی بے بسی کے عالم میں آنجہانی ہو گیا۔ 1979ء ہی میں امریکہ نے رہوڈیشیا میں بشپ ایبل منروریوا کو موغابے اور نکومو کے مقابلے میں کھڑا کیا' بشپ امریکیوں کیلئے لڑتا رہا لیکن جب وہ لڑتے لڑتے کمزور ہو گیا تو امریکہ نے اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور باقی رہ گیا صدر صدام حسین۔ انقلاب ایران کے بعد امریکہ نے صدام حسین کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا' صدام حسین نے امریکہ کی ایماء پر 22 ستمبر 1980ء کو ایران پر حملہ کیا' یہ جنگ 20 اگست 1988ء تک 8 سال جاری رہی اور اس میں دس لاکھ افراد ہلاک اور 20 لاکھ زخمی ہوئے۔ صدام حسین 1990ء تک امریکہ کا دوست رہا لیکن پھر امریکہ نے تیل کے لالچ میں عراق پر حملہ کر دیا' اس جنگ میں 86 ہزار عراقی شہری شہید ہوئے' 2003ء میں امریکہ نے ایک بار پھر عراق پر حملہ کیا' صدام حسین گرفتار ہوا اور امریکی ہدایات پر اسے 30 دسمبر 2006ء کو بغداد میں پھانسی دے دی گئی۔

(بقیہ صفحہ 13 پر)

1980-81ء میں سب سے بڑا نوٹ سو روپے کا ہوتا تھا' مہنگائی اس وقت بھی تھی لیکن ضروریات زندگی کی قیمتیں سو روپے تک پہنچ کر رک جاتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے اس وقت سب سے مہنگا جوتا ننانوے روپے میں ملتا تھا اور لوگ جوتوں کی دکان پر جا کر جوتا دیکھتے تھے اور افسوس سے کہتے تھے "اتنا مہنگا' توبہ توبہ" میں اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا' ہماری کلاس میں ایک عارضی ماسٹر صاحب آئے' یہ ماسٹر صاحب "سابق استاد" تھے' وہ کبھی اسی سکول میں پڑھایا کرتے تھے لیکن پھر وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے ملک سے باہر چلے گئے' وہاں سے واپس آئے تو انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے خوشحال ہو گئے لیکن کبھی کبھی ان کے اندر کے استاد کو مرگی کا دورہ پڑتا تو وہ بے چین ہو جاتے اور چند دنوں کیلئے سکول کی کوئی کلاس سنبھال لیتے' وہ طالب علموں کو درسی کتابیں پڑھانے کی بجائے انہیں زندگی کا درس دیتے تھے' ان کے دیئے ہوئے بے شمار درس آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں اور میں جب بھی زندگی کی کسی اندھی اور بہری صورتحال میں جا پھنستا ہوں تو اس عارضی ماسٹر صاحب کے دیئے ہوئے سبق میرے لئے روشنی کا کام کرتے ہیں اور میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر ہمارے ملک کے تمام ڈاکٹرز' انجینئرز' پروفیسرز' سرکاری ملازم' سیکرٹریز' بزنس مین' گلوکار' اداکار' صحافی اور سیاستدان سال میں ایک ہفتے کیلئے عارضی ماسٹر صاحب بن جائیں' وہ دور دراز علاقے کے کسی مڈل یا ہائی سکول میں ڈیرہ ڈال لیں اور وہ طالب علموں کو زندگی کا درس دیں' انہیں مطالعہ کرنے' محنت کرنے' آگے بڑھنے' کامیاب ہونے اور لوگوں کے کام آنے کا سبق دیں' وہ ان طالب علموں کو وژن' حب الوطنی' نیک نیتی' لائف سٹائل اور پازیٹو تھنکنگ سکھا دیں تو پورا ملک تبدیل ہو سکتا ہے' اس ملک کے بچے بچے کی سوچ کا دھارا بدل سکتا ہے' کاش ہم میں سے کوئی شخص اس نیک کام کا بیڑا اٹھا لے۔ بہرحال میں موضوع کی طرف واپس آتا ہوں' ہمارے عارضی ماسٹر صاحب ایک دن ہماری کلاس میں آئے' وہ کلاس کے سامنے کھڑے ہوئے' انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا' سو روپے کا کڑکڑاتا ہوا تازہ نوٹ نکالا اور کلاس کو دکھا کر بولے "یہ کتنے کا نوٹ ہے" پوری کلاس گلا پھاڑ کر بولی "سو روپے کا" ماسٹر صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی' نوٹ کا گولہ سا بنایا اور اس گولے کو دونوں ہاتھوں میں مسلنا شروع کر دیا' وہ تھوڑی دیر تک نوٹ کو مسلتے رہے' اس کے بعد انہوں نے نوٹ کو سیدھا کیا' نوٹ بری طرح چرمرا گیا تھا' اس پر سلوٹیں ہی سلوٹیں تھیں' انہوں نے وہ نوٹ دوبارہ کلاس کو دکھایا اور پوچھا "یہ اب کتنے کا نوٹ ہے" کلاس دوبارہ بولی "سو روپے کا" ماسٹر صاحب مسکرائے' انہوں نے نوٹ زمین پر گرایا' اس پر پاؤں رکھا اور پاؤں کے ساتھ نوٹ کو رگڑنا شروع کر دیا' وہ تھوڑی دیر بعد جھکے' انہوں نے نوٹ اٹھایا' نوٹ اب بری طرح کچلا جا چکا تھا' اس پر مٹی اور کیچڑ کے داغ لگ چکے تھے' اس کا ایک کونا پھٹ چکا تھا اور جوتے اور فرش کی رگڑ سے اس کا رنگ اور عبارت بھی مٹ چکی تھی' انہوں نے نوٹ دوبارہ کلاس کی طرف لہرایا اور پوچھا "اب بتاؤ یہ نوٹ کتنے کا ہے" کلاس کا جواب وہی تھا "جناب یہ نوٹ اب بھی سو روپے کا ہے" ماسٹر صاحب نے نوٹ تہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔

وہ کلاس کی طرف مڑے اور آہستہ اور نرم آواز میں بولے "اس نوٹ کی قیمت سو روپے تھی' اس وقت بھی جب یہ نیا' نکور اور خوبصورت تھا' اس وقت بھی جب میں نے اسے ہاتھ میں مسلا اور اس وقت بھی جب میں نے اسے جوتے تلے رگڑا" وہ رکے' مسکرائے اور بولے "سو روپے کا نوٹ سو روپے کا نوٹ ہی رہا' نوٹ کی کسی تذلیل' کسی زیادتی اور کسی بے حرمتی نے نوٹ کی اہمیت' نوٹ کی ویلیو اور نوٹ کی وقعت میں کمی نہیں کی" ہم حیرت سے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھتے رہے' ماسٹر صاحب بولے "دنیا کے بڑے لوگ سو روپے کے نوٹ کی طرح ہوتے ہیں' یہ لوگ جب اپنی مقبولیت کی انتہا پر ہوتے ہیں تو بھی یہ سو روپے کے نوٹ ہوتے ہیں اور جب یہ لوگ زندگی کی سختیوں' زندگی کی ٹھوکروں اور زندگی کی مشکلوں میں گھرے ہوتے ہیں تو اس وقت بھی یہ لوگ سو روپے کے نوٹ ہی ہوتے ہیں' سو روپے کا نوٹ سیٹھ صاحب کی جیب میں ہو یا کسی بھنگی کی بدبودار شلوار کے نیفے میں وہ سو روپے کا نوٹ ہی رہتا ہے' وہ سہرے کی لڑی میں لٹک رہا ہو' کسی مزار کے سرہانے پڑا ہو' خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر دھرا ہو' کسی طوائف کے قدموں میں بکھرا ہو یا کسی بدبودار نالی میں تیر رہا ہو اس کی قدر' اس کی قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا" ماسٹر صاحب رکے' انہوں نے لمبا سانس بھرا اور نرم آواز میں بولے "تم لوگ زندگی میں سو روپے کا نوٹ بننے کی کوشش کرنا' ملک کا سب سے بڑا کرنسی نوٹ۔ اگر تم ایک بار سو روپے کا نوٹ بن گئے تو اس کے بعد اپنی قدر کو پہچاننا اور پھر حالات کی سختی' مسائل کی گرمائش اور آزمائشوں کی دھوپ سے نہ گھبرانا کیونکہ حالات

جو بھی ہوئے' آزمائشیں' مسائل اور سختیاں کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہوئیں تمہاری قدر وہی رہے گی' تمہاری قیمت وہی رہے گی' وقت کی کوئی سختی' آزمائش کی کوئی توہین اور حالات کا کوئی الٹا سیدھا چکر تمہیں پونے سو روپے نہیں کر سکے گا۔ ہاں مگر تم" وہ رکے اور دوبارہ بولے "ہاں اگر تم خود حالات کے سامنے ڈھیر ہو گئے' اگر تم نے خود شکست مان لی اگر تم خود وقت کی چوکھٹ پر لیٹ گئے تو دوسری بات ہے ورنہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہارے مقام' تمہاری قدر اور تمہاری قیمت سے نہیں گرا سکے گی" ماسٹر صاحب کا لیکچر ختم ہو گیا لیکن وہ لیکچر ساٹھ طالب علموں کو ان کی قدر و قیمت بتا گیا' ساٹھ طالب علم جان گئے وہ قدرت کے ٹکسال سے نکلے ہوئے کرنسی نوٹ ہیں اور ہر کرنسی نوٹ پر قدرت نے ایک قدر نقش کر دی ہے اور جب تک ان کا وجود سلامت ہے ان کی قدر قائم رہے گی اور دنیا کی کوئی طاقت اس قدر میں کمی نہیں کر سکے گی۔

میں آج جب صدر پرویز مشرف کو دیکھتا ہوں اور پوری دنیا کو ان سے استعفے کے مطالبے کرتے دیکھتا ہوں اور ان مطالبوں کے جواب میں صدر پرویز مشرف کے اس قسم کے بیان سنتا ہوں "میں ہرگز استعفیٰ نہیں دوں گا' میں پسپا نہیں ہوں گا' میں مقابلہ کروں گا' وغیرہ' وغیرہ" تو میں بے اختیار ہنس پڑتا ہوں اور سوچتا ہوں شائد صدر پرویز مشرف اپنی قدر و قیمت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے' وہ ایک روپے کا ایک ایسا کرنسی نوٹ تھے جو خود کو ملین ڈالر کا بانڈ سمجھ بیٹھا تھا یا وہ کانچ کا ایک ایسا ٹکڑا تھے جو دس تولے سونے کے ہار میں پرویا ہوا تھا اور جب سونا ان کے وجود سے الگ ہوا اور ان کی اپنی بولی شروع ہوئی تو انہیں پہلی بار اپنی کم مائیگی کا اندازا ہوا' جب بانڈ کی مدت ایکسپائر ہو گئی اور وہ کاغذ کا محض ایک حقیر سا ٹکڑا رہ گیا' ایک ایسا ٹکڑا جس سے اب کوئی انگلی تک صاف کرنے کیلئے تیار نہیں تو اسے اس وقت اپنی اصل قیمت کا اندازا ہوا لیکن یہ انا بھی عجیب چیز ہوتی ہے' یہ وہ پتھر ہوتی ہے جو شیشوں میں رہتے رہتے خود کو شیشہ سمجھ بیٹھتا ہے اور یہ وہ سیاہ کالا بھنورا ہوتی ہے جو پھولوں میں رہ رہ کر خود کو خوشبو سمجھ بیٹھتا ہے لیکن جب بہار گزر جاتی ہے یا شیشے چکنا چور ہو جاتے ہیں' جب عکس روٹھ جاتے ہیں اور جب خوشبوئیں بکھر جاتی ہیں تو اس وقت بھنورے کو بھنورا اور پتھر کو پتھر ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے بھنورے کا دل ہو یا پتھر کا دماغ وہ کبھی حقیقت تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے صدر پرویز مشرف واقعی سو روپے کا نوٹ ہوں اور حالات کی سختیاں انہیں کچلنے' مسلنے اور رگیدنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر حقیقت کیا ہے؟ اس کا فیصلہ اب وقت نے کرنا ہے اور وقت کو وقت دینا اب صدر پرویز مشرف کا کام ہے' وہ اونچی دیواروں کے محل سے باہر آئیں اور خود کو حالات کی بھٹی میں گر نے دیں' اگر وہ سو روپے کا اصلی نوٹ ہوئے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کی قدر کو نہیں مٹا سکے گی اور اگر وہ شیشوں کے دیس کے پتھر ہوئے تو محل کی دیواریں ان کو زیادہ دیر تک نہیں بچا پائیں گی۔ صدر مشرف کیا تھے؟ اور کیا ہیں اب اس کا فیصلہ وقت نے کرنا ہے اور وقت اب صدر مشرف سے زیادہ دور نہیں۔

یہ 1974ء کی بات تھی' سردار محمد اقبال لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور جسٹس شمیم حسین قادری ہائی کورٹ کے جج۔ جسٹس شمیم حسین قادری کی عدالت میں ایک فوجی کرنل کا کیس آ گیا' کرنل صاحب کسی کریمنل کیس میں ملوث تھے اور وہ مختلف عدالتوں سے ہوتے ہوئے ہائی کورٹ پہنچ گئے تھے' عدالت میں بحث شروع ہوئی تو کرنل کے رویے پر جسٹس شمیم حسین قادری ناراض ہو گئے اور انہوں نے بھری عدالت میں کرنل صاحب کو جھڑک دیا' دوسرے دن ذوالفقار علی بھٹو نے چیف جسٹس سردار محمد اقبال کو اسلام آباد طلب کر لیا۔ چیف جسٹس بھٹو صاحب کے پاس پہنچے تو وزیراعظم نے چیف جسٹس سے فرمایا ''سردار صاحب آپ اپنے ججوں کو سنبھال لئے' ہم ابھی جنگل سے باہر نہیں نکلے'' سردار صاحب فوراً لاہور واپس پہنچے اور جسٹس شمیم حسین قادری کو سارا معاملہ بتا دیا' جسٹس شمیم یہ سن کر اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ وہ چند دن بعد معافی تلافی کیلئے کمانڈر ان چیف جنرل ٹکا خان کے پاس پہنچ گئے' انہوں نے جنرل ٹکا خان سے ملاقات کی اور واپسی پر جنرل صاحب کی درازی عمر کیلئے بکرے کی قربانی دی۔

آپ دیکھئے یہ کس دور کی بات تھی؟' یہ اس دور کی بات تھی جب بنگلہ دیش کا واقعہ پیش آ چکا تھا' ہماری فوج بنگلہ دیش میں شکست کا سامنا کر چکی تھی' ہمارے 90 ہزار فوجی بھارت کی قید میں تھے' ذوالفقار علی بھٹو مغربی پاکستان کے سب سے بڑے لیڈر بن کر ابھرے تھے' پورا ملک ان کی قیادت میں ایک تھا' بھٹو صاحب انگلی اٹھاتے تھے تو لوگ سانس روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ انگلی گراتے تھے تو لوگ آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے اور اس دور میں فوج اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ بھٹو صاحب اور ان کے حواریوں کا خیال تھا ملک سے مارشل لاء کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکا ہے' حمود الرحمان رپورٹ تیار ہو چکی تھی اور بھٹو صاحب کسی بھی وقت اس کو منظر عام پر لا کر بے شمار جرنیلوں' بریگیڈیئرز اور کرنلز کا مستقبل تباہ کر سکتے تھے لیکن اس وقت بھی فوج سماجی اور سیاسی لحاظ سے اس قدر مضبوط تھی کہ ہائی کورٹ کے جج کی گھرکی یا جھڑک پر نہ صرف وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے بلکہ جج صاحب کو کمانڈر ان چیف کے پاس جا کر معافی بھی مانگنا پڑی۔ یہ تو محض ایک واقعہ تھا۔ آپ اب جنرل یحییٰ خان کی مثال بھی لیجئے' جنرل یحییٰ خان کی شراب نوشیوں' بدکاریوں اور غفلتوں کے باعث مشرقی پاکستان کا مسئلہ انتہا تک پہنچا' جنرل یحییٰ خان کے حکم پر مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن ہوا' اس آپریشن میں ہزاروں معصوم پاکستانی شہری مارے گئے' بنگالی اور پاکستانی بھارت گئے' بھارت نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بھارتی فوج مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئی اور جنرل یحییٰ خان کی خام حکمت عملی کی وجہ سے پاک فوج ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہوئی اور پاکستان کی تاریخ پر ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ لگ گیا۔ یہ پاکستانی فوج کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا جب چھوٹے افسروں نے اپنے کمانڈر ان چیف کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور فوج کے جنرل صاحب جب جونیئر افسروں سے خطاب کیلئے آئے تو نوجوان کپتانوں اور میجروں نے انہیں سر عام گالیاں دیں' ان جرنیلوں نے واپس جا کر جنرل یحییٰ خان کو صورتحال بتائی اور اسے مشورہ دیا آپ استعفیٰ دے دیں اور خود کو سول حکومت کے حوالے کر دیں ورنہ جونیئر افسر آپ پر حملہ کر دیں گے۔ جنرل یحییٰ خان صورتحال کی نزاکت بھانپ گیا چنانچہ اس نے ذوالفقار علی بھٹو کو بلوایا' اقتدار اس کے حوالے کیا' استعفیٰ دیا اور خود کو ٹرائل کیلئے پیش کر دیا' حکومت نے جنرل یحییٰ خان کو گرفتار تو کر لیا لیکن حکومت اسے اڈیالہ یا کوٹ لکھپت جیل نہیں بھجوا سکی' جنرل یحییٰ خان کو پہلے منگلہ کے ایک آرمی ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا' وہاں جونیئر فوجی افسروں کی بیگمات نے ان کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا تو اسے کھاریاں کے نزدیک بنی بنگلہ کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا اور اس ریسٹ ہاؤس میں اسے دنیا کی تمام سہولتیں حاصل تھیں' وہ جب ٹرائل کیلئے راولپنڈی لایا جاتا تھا تو اس کیلئے فوج کا ہیلی کاپٹر بنی بنگلہ بھجوایا جاتا تھا اور بعد ازاں یحییٰ خان کو اس کے گھر ہارلے سٹریٹ راولپنڈی بھجوا دیا گیا' یحییٰ خان نے 10 اگست 1980ء تک اپنے گھر میں آرام دہ زندگی گزاری' وہ طبعی موت مرا اور اس کے انتقال پر نہ صرف اسے قومی پرچم میں لپیٹا گیا بلکہ اس کی میت کو گارڈ آف آنر بھی پیش کی گئی' جنرل یحییٰ خان کو پورے فوجی احترام کے ساتھ دفن کیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں عام طور پر یہ کہا جاتا تھا مارشل لاؤں کا وقت ختم ہو چکا ہے اور بھٹو صاحب کی عوام پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ کوئی فوجی طالع آزما اقتدار کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا لیکن پھر اسی ذوالفقار علی بھٹو پر 5 جولائی 1977ء کا وقت آیا' جنرل ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کو اٹھا کر کال کوٹھڑی میں پھینکا' انہیں

پھانسی چڑھایا اور تادم مرگ اقتدار کے ساتھ چمٹے رہے۔ 1997ء سے 1999ء تک بھی یہی صورتحال تھی' میاں نواز شریف کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار دو تہائی اکثریت ملی تھی' میاں صاحب کے پاس ہیوی مینڈیٹ تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فوج آگے بڑھے گی اور میاں نواز شریف کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہو جائے گی لیکن جنرل پرویز مشرف نے نہ صرف میاں صاحب کا تختہ الٹا بلکہ انہیں زبردستی جلاوطن بھی کر دیا اور جب تک صدر پرویز مشرف کی وردی قائم رہی فوج نے میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کو پاکستان میں داخل نہیں ہونے دیا اور آج ایک بار پھر یہ کہا جا رہا ہے حکمران اتحاد جنرل ریٹائرڈ صدر پرویز مشرف کا مواخذہ کرے گا۔ سترہ یا اٹھارہ اگست کو صدر پرویز مشرف کے خلاف مواخذے کی تحریک پارلیمنٹ ہاؤس میں لائی جائے گی' تین سے ساڑھے تین سو کے قریب ارکان صدر پرویز مشرف کے خلاف ووٹ دیں گے اور صدر پرویز مشرف ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اقتدار سے فارغ ہو جائیں گے اور اس کے بعد حکمران اتحاد صدر مشرف کے خلاف آئین کی دفعہ چھ کے تحت غداری کا مقدمہ قائم کرے گا۔ صدر پرویز مشرف کو گرفتار کیا جائے گا اور ان کے خلاف مقدمے کی سماعت ہو گی' یہ اس ملک کے عوام اور سیاسی جماعتوں کی خواہش ہے جبکہ میری دعا ہے اس ملک میں ایسا وقت بھی آئے اور وہ وقت ستمبر 2008ء ہی ہو لیکن سوال یہ ہے کیا ہم جنگل سے باہر آ چکے ہیں' کیا اس ملک میں فوج 1971ء سے زیادہ کمزور ہے اور کیا آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف ذوالفقار علی بھٹو سے زیادہ بڑے اور مضبوط لیڈر ہیں' اگر ایسا ہے؟ اگر ہم واقعی جنگل سے باہر آ چکے ہیں اور اگر واقعی اس ملک میں سیاستدان جرنیلوں سے زیادہ مضبوط ہو چکے ہیں تو پھر ہمیں صدر پرویز مشرف کے مواخذے کی توقع رکھنی چاہئے لیکن جس ملک میں حکومت چند گھنٹوں میں آئی ایس آئی کے بارے میں نوٹیفکیشن واپس لینے پر مجبور ہو جائے اس ملک میں فوج کے سابق سربراہ کا مواخذہ خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا چنانچہ میرا خیال ہے فوج اس بار بھی اپنے سابق سربراہ کو ''شرمندہ'' نہیں ہونے دے گی اور صدر پرویز مشرف زیادہ سے زیادہ باعزت طریقے سے ملک سے باہر چلے جائیں گے اور شوکت عزیز کے ساتھ مل کر دنیا کے مختلف ملکوں میں دہشت گردی کے خلاف جنگ پر لیکچر دیا کریں گے۔ سعودی عرب میں سرور پیلس بھی خالی ہو چکا ہے اور اگر صدر پرویز مشرف یورپ یا امریکہ نہ گئے تو سعودی عرب تو کہیں نہیں گیا' سعودی عرب پاکستان کا ایک ایسا برادر اسلامی ملک ہے جس نے ہر مشکل وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا۔ میں آج زرداری ہاؤس گیا تھا اور میری پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرپرسن آصف علی زرداری کے ساتھ دو گھنٹے گفتگو ہوئی' میں نے ان سے پوچھا ''کیا ہماری سیاست 1971ء سے مضبوط ہو چکی ہے'' زرداری صاحب نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور فرمایا ''ہاں یہ 1971ء نہیں یہ 2008ء ہے اور اب فوج کے سابق سربراہ کا مواخذہ ناممکن نہیں'' میں نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا ''کیا ہم واقعی جنگل سے باہر نکل آئے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا ''ہاں ہم جنگل سے بہت باہر آ چکے ہیں''۔

میری جان پر پچھلے دوماہ سے ایک قرض چلا آ رہا ہے' یہ قرض عافیہ صدیقی ہےاور عافیہ صدیقی اوراس پر ڈھائے جانے والے مظالم میری آدھی نیند کھا چکے ہیں۔ میں روز جب رات کو سونے لگتا ہوں تو عافیہ صدیقی اوراس کے تین بچے میرے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اوران کے آنسو سیدھے میرے ماتھے پر گرتے ہیں اور میری نیند ساتھ بہالے جاتے ہیں۔ عافیہ صدیقی کراچی سے بگرام لے جائی گئی' بگرام میں اس پر جتنے مظالم ڈھائے گئے اس کا پہلی بار انکشاف ابو یحییٰ علیبی نے کیا تھا۔ ابو یحییٰ علیبی کا تعلق القاعدہ سے تھا' وہ تنظیم کے اہم رہنماؤں میں شمار ہوتا تھااور وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ 2003ء میں گرفتار ہو گیا تھا' ابو یحییٰ کو بگرام کے امریکی بیس میں قید رکھا گیا تھا' وہ جولائی 2006ء میں اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہوااور اس نے 2007ء میں الجزیرہ ٹیلی ویژن کو ایک انٹرویو دیا' اس انٹرویو میں اس نے انکشاف کیا ''افغانستان اور بعض عرب ممالک میں بے شمار خفیہ جیلیں ہیں اوران جیلوں میں سینکڑوں بے گناہ لوگ قید ہیں'' ابو یحییٰ کا کہنا تھا ''بگرام کی جس جیل میں وہ لوگ قید تھے وہاں ایک پاکستانی خاتون بھی تھی' یہ خاتون دو سال پہلے بگرام لائی گئی اور وہ شدید تشدد کے باعث اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے'' ابو یحییٰ کا کہنا تھا' وہ ایک درمیانی عمر کی خاتون ہے جس کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے جو مرد قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہےاوراس خاتون کی یادداشت ختم ہو چکی ہے'' میں نے جب الجزیرہ پر ابو یحییٰ کا انٹرویو سنا تھا تو میرا ذہن فوراً عافیہ صدیقی کی طرف چلا گیا تھااور میں نے سوچا تھا وہ پاکستانی خاتون یقیناً عافیہ صدیقی ہو گی

-

یہ عافیہ صدیقی کون ہے؟ عافیہ صدیقی ایک پاکستانی امریکی خاتون تھی' وہ 2مارچ 1972ء کو کراچی میں پیدا ہوئی' اس کے والد محمد صدیقی پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے' یہ خاندان 70 کی دہائی میں امریکہ منتقل ہو گیا' عافیہ صدیقی پر مذہب کا غلبہ تھا' وہ سکول اور یونیورسٹی میں سکارف لیتی تھی' عافیہ نے دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے ''ایم آئی ٹی'' سے گریجوایشن کی تھی' ایم آئی ٹی میں وہ مسلمان طالب علموں کی ایک ایسوسی ایشن میں شامل ہو گئی تھی' گریجوایشن کے بعد اس کے والدین نے اس کی شادی ڈاکٹر امجد خان کے ساتھ کر دی اور وہ دونوں اطمینان سے زندگی گزارنے لگے' اللہ تعالیٰ نے اس دوران اسے دو بچوں سے نوازا' 2001ء میں نائین الیون کا واقعہ پیش آیا جس کے بعد دنیا کی تمام سیکریٹ ایجنسیاں دہشت گردوں کے خفیہ نیٹ ورک کے پیچھے لگ گئیں' 2002ء کے وسط میں امریکہ کے اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ اور ایف بی آئی کے ڈائریکٹر رابرٹ میولر نے پریس کانفرنس کی اوراس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ ایف بی آئی القاعدہ کے سات کارکنوں کو تلاش کر رہی ہے' ان کارکنوں میں ایک درمیانی عمر کی خاتون بھی ہے' ان سات لوگوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کیلئے دہشت گردوں کو رقم فراہم کی تھی' اس اعلان کے کچھ عرصہ بعد ایف بی آئی نے عافیہ صدیقی کی تصویریں ریلیز کر دی۔ ایف بی آئی کا کہنا تھا امریکی حکومت نے 1999ء میں القاعدہ کے تمام اکاؤنٹس منجمد کر دیئے تھے جس کے بعد یہ لوگ بینکوں کے ذریعے رقم ٹرانسفر نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان لوگوں نے اس کا حل ہیروں کی شکل میں نکالا' یہ لوگ مغربی افریقہ کے ملک لائبیریا سے ہیرے خریدتے تھے' یہ ہیرے امریکہ سمگل کرتے تھے' انہیں انڈر ورلڈ میں فروخت کرتے تھے اوران سے حاصل ہونے والی رقم دہشت گردی میں استعمال کرتے تھے۔ ایف بی آئی کا کہنا تھا عافیہ صدیقی ہیروں کی اس سمگلنگ کی مرکزی کردار تھی' وہ سال میں کئی کئی بار لائبیریا جاتی تھی' وہاں سے ہیرے خریدتی تھی اور امریکہ لا کر فروخت کر دیتی تھی۔ ایف بی آئی کا کہنا تھا عافیہ صدیقی جولائی 2001ء میں بھی لائبیریا گئی اور وہ وہاں سے 15 ملین ڈالر کے ہیرے خرید کر لائی تھی بعد ازاں ان لوگوں نے اس رقم میں سے پانچ لاکھ ڈالر خرچ کیے اوراس کے نتیجے میں امریکہ میں نائین الیون کا واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ بعض امریکی صحافیوں کا کہنا تھا عافیہ صدیقی کی نشاندہی شیخ خالد محمد نے کی تھی' شیخ خالد القاعدہ کا مرکزی رہنما تھااور نائین الیون کا سارا آپریشن اس نے ڈیزائن کیا تھا' وہ یکم مارچ 2003ء کو کراچی سے گرفتار ہوا تھااور اس نے دوران تفتیش عافیہ صدیقی کا نام لیا تھا' اس وقت عافیہ کراچی میں مقیم تھی اور شدید گھریلو مسائل کا شکار تھی' اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی تھی جس کے صدمے کی وجہ سے اس کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے' عافیہ کو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنوں بیٹے کی نعمت سے نوازا لیکن اس کے باوجود وہ شدید ڈپریشن اور پریشانی کا شکار تھی' اسی پریشانی میں اس نے اپریل 2003ء میں اپنے تینوں بچے لیے اور ٹرین کے ذریعے کراچی سے اسلام آباد روانہ ہو گئی' اس وقت اس کے بچوں کی عمریں سات سال' پانچ سال اور چھ ماہ تھی' عافیہ صدیقی راستے میں کسی جگہ بچوں سمیت غائب

ہو گئی' عافیہ صدیقی کی گمشدگی کے چند روز بعد ایک موٹر سائیکل سوار اس کی والدہ کے پاس آیا اور اس نے بتایا عافیہ گرفتار ہو چکی ہے اور اگر وہ اپنی بیٹی کی سلامتی چاہتی ہے تو وہ خاموشی اختیار کر لے۔ انہی دنوں پاکستان کی وزارت داخلہ کے ترجمان اور دو امریکی اہلکاروں نے صحافیوں کے سامنے اعتراف کیا کہ عافیہ صدیقی اور اس کے بچے ان کی حراست میں ہیں اور وہ ان سے تفتیش کر رہے ہیں ابھی اس اعتراف کو چند ہی روز گزرے تھے کہ وزارت داخلہ اور امریکی اہلکاروں نے اپنے بیان کی تردید کر دی' یوں عافیہ صدیقی اور اس کے بچے قصہ ماضی بن گئے۔ عافیہ صدیقی 3 اگست 2008ء تک گوشہ گمنامی میں رہی' 4 اگست کو نو مسلم صحافی ریڈلی نے اسلام آباد میں انکشاف کیا عافیہ صدیقی بگرام جیل میں قید ہے اور اس پر انسانیت سوز تشدد کیا جا رہا ہے' اسی دوران عافیہ کے سابق خاوند نے دعویٰ کیا ایف بی آئی 2001ء کے جن دنوں میں عافیہ کو لائبیریا میں ثابت کر تی رہی ہے عافیہ ان دنوں امریکہ میں تھی اور ان کے پاس تمام ثبوت موجود ہیں۔ اس کا کہنا تھا "ممکن ہے القاعدہ نے عافیہ کی جعلی دستاویزات بنالی ہوں اور ان دستاویزات پر عافیہ کی جگہ کوئی دوسری خاتون سفر کر تی رہی ہو"۔

عافیہ مجرم ہے یا نہیں' یہ راز اس وقت تک راز رہے گا جب تک عافیہ اور اس کے بچے دنیا کے سامنے نہیں آتے اور انہیں کھل کر بات کرنے کی اجازت نہیں ملتی لیکن اس اجازت سے قبل انسانی ضمیر دنیا کے 6 ارب لوگوں سے چند سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ دنیا کا ہر قانون ملزم کو صفائی کا پورا پورا حق دیتا ہے لیکن عافیہ کے معاملے میں دنیا کا قانون پانچ سال کیوں خاموش رہا؟ نمبر دو' اگر عافیہ مجرم ہے تو اس کے تینوں معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟ نمبر تین' عافیہ صدیقی پانچ سال بگرام کی جیل میں قید رہی کیا پاکستانی ہونے کی حیثیت سے اسے رہا کرانا اور اسے دنیا کی عدالت میں پیش کرنا ہماری ذمہ داری نہیں تھی؟ پاکستان میں بے شمار علمائے کرام ہیں ہم دنیا کی بہترین فوج کے مالک ہیں' اس ملک میں چار پانچ کروڑ پڑھے لکھے لوگ ہیں' اس ملک کے 80 فیصد لوگ روز مسجدوں میں جاتے ہیں' ہم سب لوگ صبح شام قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں' ہم سب کے سینوں میں دل ہے اور یہ دل ایک منٹ میں ستر اسی بار دھڑکتا ہے' ہماری نسوں میں خون بھی ہے اور یہ خون بھی ہماری رگوں میں سرکتا ہے' ہم سب خود کو زندہ اور باضمیر انسان بھی کہتے ہیں لیکن جب عافیہ جیسے لوگوں کا معاملہ آتا ہے تو ہماری زبانیں گنگ کیوں ہو جاتی ہیں؟ ہمارا ضمیر کروٹ بدل کر کیوں سو جاتا ہے اور ہماری نمازیں' ہمارے قرآن مصلحت کی چادر کیوں اوڑھ لیتے ہیں؟' ہم نظریہ ضرورت کے مورچے میں سر کیوں چھپا لیتے ہیں؟ اور ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں عافیہ صدیقی کے ساتھ چھ ماہ کا ایک بچہ بھی تھا اور اگر کل روز حشر عافیہ صدیقی کے اس چھ ماہ کے بچے نے ہمارا گریبان پکڑ لیا تو ہم اللہ کو کیا جواب دیں گے۔ ہم بھول جاتے ہیں حضرت امام حسینؓ کے چھ ماہ کے بیٹے نے فرات کے کنارے ایک سوال پوچھا تھا اور ہم چودہ سو سال سے اس سوال کا جواب دے رہے ہیں لیکن قدرت ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہو رہی۔ آج اکیسویں صدی میں عافیہ صدیقی کا چھ ماہ کا بیٹا بھی ہم سے وہی سوال پوچھ رہا ہے' وہ ہم سے پوچھ رہا ہے "میرا کیا جرم تھا" ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے اس کائنات کا ایک رب ہے اور اس رب کی نظر میں اس وقت ہمارا کیا مقام ہو گا؟' وہ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا؟۔ یہ چھ ماہ کا بچہ اس ملک کے 16 کروڑ لوگوں کو پیغام دے رہا ہے خدا کیلئے خدا سے ڈرو۔ تم سب نے فوت ہونا ہے اور فوت ہونے کے بعد اپنے رب کے سامنے پیش ہونا ہے اور اللہ کی عدالت وہ عدالت ہے جس میں تمہیں کوئی بش نہیں بچا سکے گا' وہاں صرف تمہارے اعمال' تمہاری سوچ' تمہاری جرات اور تمہارا ایمان تمہارا ساتھ دے گا اور تم نے اپنے اعمال اور اپنی نیکیاں اس چھ ماہ کے بچے اور ایک مظلوم عورت کے حوالے کر دی ہیں چنانچہ تم اب خالی ہاتھ لے کر اللہ کے سامنے پیش ہو گئے۔ ہمیں ماننا پڑے گا عافیہ صدیقی کے معاملے میں ہماری خاموشی ایک ایسا گناہ کبیرہ تھی جس کا تاوان اس پوری قوم کو ادا کرنا پڑے گا' جس کی سزا ہم سب کو بھگتنا پڑے گی۔ صدر مشرف کی سزا شروع ہو چکی ہے اور ہماری سزا کا وقت شروع ہونے والا ہے۔ بس چند دن کی بات ہے اور ہم تاوان کے بیلنے میں گنے کی طرح پیس دیئے جائیں گے' ہم معافی مانگتے مانگتے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

لوگوں نے ہیلی کاپٹر دیکھ کر ہاتھ ہلانا شروع کر دیئے' زمین پر آگے پیچھے دائیں بائیں پانی تھا اور پانی کے درمیان ایک چھوٹا سا راستہ تھا اور راستے کے آخر میں کچی مٹی کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا گاؤں سے بوڑھے' جوان اور بچے نکلے اور ہیلی کاپٹر کے نیچے بھاگنے لگے' وہ اوپر دیکھ رہے تھے' ہاتھ ہلا رہے تھے اور چیخ رہے تھے لیکن ان کی آوازیں ہیلی کاپٹر کی گھوں گھوں' ٹھاہ' ٹھاہ میں دب رہی تھیں' چیف منسٹر کے پی ایس زبیر نواز پائلٹ کے کان پر جھک گئے اور ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ زمین پر اترنے لگا' یہ پنجاب کے آخری ضلع راجن پور کی بستی لاکھا تھی اور اس بستی کی سو سالہ تاریخ میں پہلی بار کسی حکمران نے اس زمین پر قدم رکھا تھا' میاں شہباز شریف کو اپنے درمیان دیکھ کر لوگوں نے دہائی دینا شروع کر دی "سائیں مر گئے آں' سائیں مر گئے آں" ہمارے ارد گرد دور دور تک غربت بکھری تھی' لوگوں کے تن پر کپڑے تھے اور نہ ہی پاؤں میں جوتا گرم سلگتی دوپہر میں ننگے بدن چل چل کر ان لوگوں کی جلد تک جل چکی تھی اور وہ لوگ انسان کم اور سڑا ہوا چمڑا زیادہ دکھائی دے رہے تھے' میاں شہباز شریف لوگوں کے ہجوم میں بہتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گئے جبکہ میں سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھنے لگا' کپاس کے پودے سروں تک پانی میں ڈوبے تھے' مال مویشی ہراساں کھڑے تھے' گھروں کے درمیان میں پانی جمع تھا اور لوگوں کے چہروں پر غربت کی تہیں جمی تھیں' یہ میری زندگی کی اس نوعیت کی پہلی بستی تھی' بستی لاکھا۔

یہ سات اگست کی صبح تھی' مجھے چیف منسٹر کے سٹاف نے جگا دیا' ان کا کہنا تھا میاں شہباز شریف اسلام آباد سے رحیم یار خان اور وہاں سے راجن پور جا رہے ہیں' وہ چاہتے ہیں آپ ان کے ساتھ جائیں' صحافت اور سیاست کے نقطہ نظر سے یہ ایک قیمتی صبح تھی' پانچ اور چھ اگست کو آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کے مابین حتمی مذاکرات ہوئے تھے اور میاں شہباز شریف ان مذاکرات میں شامل رہے تھے' اس شام آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف نے مشترکہ پریس کانفرنس بھی کرنی تھی اور میں مذاکرات کی اندرونی کہانی بھی جاننا چاہتا تھا چنانچہ میں فوراً چکلالہ ائیر بیس پہنچ گیا' میاں شہباز شریف کے ساتھ میرا عقیدت اور محبت کا رشتہ ہے' وہ جب جلاوطن تھے تو لندن میں ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں' وہ جب پاکستان واپس آئے' انہوں نے الیکشن لڑا اور وہ چیف منسٹر بنے تو ان ملاقاتوں میں تیزی آ گئی اور مجھے میاں شہباز شریف کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا' میاں شہباز شریف کے بارے میں لوگوں کا تاثر تھا وہ جتنے اچھے ایڈمنسٹریٹر ہیں وہ اتنے شاندار سیاستدان نہیں ہیں' یہ بات 1999ء تک ہو سکتا ہے درست ہو لیکن 2008ء کے میاں شہباز شریف سیاستدان بھی اتنے ہی اچھے ہیں جتنے اچھے وہ ایڈمنسٹریٹر ہیں' ہم پونے گیارہ بجے اسلام آباد سے روانہ ہوئے' میں نے بیٹھتے ہی ان سے مذاکرات کے بارے میں پوچھا' میاں صاحب نے بڑی احتیاط سے پانچ اور چھ اگست کے مذاکرات کی تفصیل بتانا شروع کی' میاں صاحب کا کہنا تھا "ہم نے اپنی طرف سے جمہوریت کو بچانے' حکومت کو قائم رکھنے' ججز کو بحال کرانے اور صدر پرویز مشرف کے مواخذے کی آخری حجت پوری کر دی ہے' ہم نہیں چاہتے تھے کل کو لوگ ہمیں یہ الزام دیں کہ ہماری ضد کی وجہ سے ملک دوبارہ آمریت کے پنجے میں چلا گیا" میں نے پوچھا "لیکن چھ اگست کی شام میاں نواز شریف مذاکرات ادھورے چھوڑ کر پنجاب ہاؤس آ گئے تھے" میاں شہباز شریف فوراً بولے "ہمارے مذاکرات ٹھیک چل رہے تھے لیکن اچانک پتہ چلا حکومت نے صدر سے سندھ ہائی کورٹ کے 8 معطل ججز کی بحالی کی سمری جاری کرا دی ہے' میاں صاحب اس بات پر مذاکرات ادھورے چھوڑ کر واپس آ گئے' میاں صاحب کا کہنا تھا جب تک یہ نوٹیفکیشن واپس نہیں لیا جاتا اس وقت تک مذاکرات شروع نہیں ہوں گے لیکن پیپلز پارٹی کا خیال تھا جو ہو گیا اسے جوں کا توں رہنے دیا جائے اور باقی ججز کیلئے کوئی فارمولہ طے کر لیا جائے مگر میاں صاحب نے کہا ہم نے تمام ججز کی بحالی کی بات کی تھی چنانچہ اس پر کسی قسم کا کمپرومائز نہیں ہو گا" میں نے پوچھا "آپ اور آپ کے ساتھی زرداری صاحب کے ہمراہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سے ملاقات کیلئے بھی گئے تھے" میاں شہباز شریف اس کے بعد وزیراعظم کی تعریف کرنے لگے' میاں صاحب کا کہنا تھا "ہم لوگ وزیراعظم کی شرافت' راست بازی' جرأت اور جمہوریت پسندی کے قائل ہو گئے ہیں' وزیراعظم واقعی ایک جینوئن سیاستدان ہیں" میں نے حیرت سے میاں صاحب کی طرف دیکھا' وہ بولے "ہم جوں ہی وزیراعظم کے پاس پہنچے اور ہم نے ان سے کہا کہ آپ 8 ججز کا نوٹیفکیشن واپس لے لیں تو انہوں نے سب کے سامنے کہا' مجھ سے یہ کام وزیر قانون فاروق ایچ نائیک نے کرایا تھا' میں نے ان سے کہا بھی تھا آپ پہلے میاں نواز شریف سے پوچھ لیں لیکن نائیک صاحب کا کہنا تھا ہم میاں صاحب کی اجازت سے یہ سمری پیش کر رہے ہیں' وزیراعظم کے اس انکشاف پر پیپلز پارٹی کے وفد

کے رنگ پیلے ہوگئے لیکن وزیراعظم نے کسی کی پروانہ کی اور ساری بات کھول کر سامنے رکھ دی چنانچہ ہم لوگ ان کی سیاسی اپروچ اور راست بازی کے قائل ہوگئے" اس کے بعد میاں صاحب دیر تک وزیراعظم کی تعریف کرتے رہے' ان کا کہنا تھا اگر وزیراعظم کو آزادی سے کام کرنے کا موقع ملے تو وہ پیپلز پارٹی کا گراف کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے' میں نے پوچھا "اب کیا ہوگا؟" میاں صاحب نے جواب دیا "اب صدر کا مواخذہ ہوگا اور ججز بحال ہوں گے' ہم اس سے کم پر ہر گز راضی نہیں ہوں گے خواہ ہماری حکومت چلی جائے' ہمیں اپوزیشن میں کیوں نہ بیٹھنا پڑے اور ہمیں سڑکوں پر جدو جہد کیوں نہ کرنی پڑے" میں نے پوچھا "کیا آپ کو پیپلز پارٹی کے وعدوں پر اب بھی اعتبار ہے" میاں صاحب نے چند لمحے سوچا اور اس کے بعد بولے "میرا خیال ہے پیپلز پارٹی کے پاس اب کوئی دوسرا آپشن نہیں بچا' ہمارے پارٹنر کے پاس وقت بہت کم ہے"۔

ہم رحیم یار خان پہنچے اور وہاں سے ہیلی کاپٹر پر راجن پور پہنچ گئے' راجن پور میں ضلعی انتظامیہ نے سیلاب کی صورتحال' تباہی اور مسائل پر بریفنگ کا بندوبست کر رکھا تھا' بریفنگ کے دوران معلوم ہوا' سیلاب کو چھ سات دن گزر چکے ہیں لیکن ضلعی انتظامیہ ابھی تک جوتے تلاش کر رہی ہے' سیلاب زدہ علاقوں کے ریلیف کا کام بھی مکمل نہیں ہوا' خیمے ابھی لاہور سے نہیں نکلے اور پینے کے پانی کا دور دور تک کوئی بندوبست نہیں تاہم لوگ پولیس اور محکمہ صحت کے کردار کی بڑی تعریف کر رہے تھے' لوگوں کا کہنا تھا اگر پولیس ان کی مدد کو نہ آتی تو وہ سیلاب میں بہہ گئے ہوتے' پولیس کے جوانوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر لوگوں کو سیلاب زدہ علاقوں سے نکالا اور محکمہ صحت نے آخری بستی تک لوگوں کو طبی امداد پہنچائی' یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ تھا میں نے جس میں عام آدمی کے منہ سے پولیس اور محکمہ صحت کی تعریف سنی' لوگ راجن پور کے ڈی پی او کے حق میں باقاعدہ نعرے لگا رہے تھے' میاں شہباز شریف نے وہاں بیٹھے بیٹھے غفلت کے ذمہ دار افسروں کو معطل کرنے کا حکم جاری کر دیا جبکہ لاہور سے اسی وقت 2 ہزار خیمے' پانی کی پانچ ہزار بوتلیں' خوراک اور نقد رقم راجن پور پہنچانے کا حکم دے دیا' وزیراعلیٰ نے اپنا ہیلی کاپٹر بھی راجن پور کی انتظامیہ کے حوالے کر دیا اور ان سے کہا کل تک یہ سارا امدادی سامان متاثرہ لوگوں تک پہنچ جانا چاہیے' ہم بریفنگ کے بعد متاثرہ علاقوں کی طرف نکل گئے' سینکڑوں میل تک پانی نے تباہی مچادی تھی' لوگ بے گھر ہو چکے تھے اور ان کے مال مویشی اور فصلیں تباہ ہو چکی تھی' میں نے میاں صاحب سے عرض کیا "میاں صاحب اصل پاکستان اور اصل پاکستانی یہ لوگ ہیں" میاں شہباز شریف نے فوراً میری بات سے اتفاق کیا اور بولے "میں سیلاب کے فوراً بعد یہاں آنا چاہتا تھا لیکن ہمارے دوستوں نے ہمیں مذاکرات میں الجھا دیا' آج صبح بھی مجھے روکا جارہا تھا لیکن میں نے کہا خدا کے بندو' مجھے میرا کام تو کرنے دو' وہاں لوگ بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں اور ہم یہاں مذاکرات کر رہے ہیں چنانچہ میں وہاں سے نکل آیا" میاں شہباز شریف کا کہنا تھا "ہماری اصل ذمہ داری یہ لوگ ہیں اور اگر ہم لوگ یہ ذمہ داری نہ نبھا سکے تو کل کو یہ لوگ ہمارا گریبان پکڑیں گے' یہ ہمیں حشر کے میدان میں گھسیٹیں گے لہٰذا میں حشر سے پہلے پہلے اپنی ذمہ داری نبھانا چاہتا ہوں"۔

ہم بستی لاکھا سے واپس لوٹ رہے تھے' میں نے میاں صاحب سے عرض کیا "میاں صاحب آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ جب کسی حکمران سے راضی ہوتا ہے تو وہ اسے کیا دیتا ہے" میاں صاحب نے پوچھا "کیا" میں نے عرض کیا "اللہ اسے نیک نیتی اور قوت فیصلہ دیتا ہے" میاں صاحب نے ہاں میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا "میری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ سمیت ہمارے تمام حکمرانوں کو قوت فیصلہ اور نیک نیتی دے کیونکہ اس ملک کو ان دونوں چیزوں کی بے انتہا ضرورت ہے" میاں شہباز شریف کے منہ سے آمین نکلا اور ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو گیا' ہم بستی لاکھا سے ایک بار پھر مذاکرات کے شہر کی طرف روانہ ہو گئے' میں نے نیچے دیکھا' لوگ آسمان کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے اور بلند آواز میں کچھ کہہ رہے تھے' مجھے یقین تھا لوگ کہہ رہے ہوں گے "سائیں مر گئے آں" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا' حکومت مذاکرات سے کب فارغ ہو گی اور شہباز شریف کی طرح سب حکمران مل کر لاکھا جیسی بستیوں میں کب آئیں گے' ان بستیوں کے دکھ کب ختم ہوں گے مگر مجھے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔

"وزیراعظم امریکہ سے بہت خوش لوٹے ہیں" اس کی آنکھوں میں چمک تھی جبکہ میں اس کی سٹیٹ منٹ پر حیران تھا' مجھے حیران ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ پاکستانی' امریکی اور یورپی میڈیا بڑے تواتر سے وزیراعظم کے امریکی دورے کو ناکام قرار دے رہا تھا' یہ واویلا صرف غیر جانبدار میڈیا تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ تمام صحافی بھی بانگ دہل کلمہ حق کہہ رہے تھے جو وزیراعظم کے خصوصی طیارے پر ان کے ساتھ امریکہ گئے تھے 'لندن میں جس طرح وزیراعظم کا سواگت کیا گیا' لندن سے امریکہ روانگی کے وقت جس طرح تاخیر ہوئی' واشنگٹن میں جس طرح وزیراعظم کو "خوار" کر کے ویل کم کیا گیا' صدر بش کے ساتھ ملاقات کے بعد جس طرح وزیراعظم کو میڈیا کے سامنے پیش کیا گیا اور جس طرح صدر بش نے وزیراعظم کے خیالات پر میڈیا کو آنکھیں ماریں' وزیراعظم کے رفقائے کار اور وفد میں شامل معززین کو جس طرح گلی میں کھڑا کر کے تلاشی کے عمل سے گزارا گیا' وزیراعظم نے جس طرح امریکی ٹیلی ویژن چینلز کو انٹرویو زدیئے اور ان انٹرویوز میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا' وزیراعظم نے امریکی بزنس مینوں اور سرمایہ کاروں کو جس طرح پاکستان میں سرمایہ کاری کی ترغیب دی اور انہوں نے جس طرح امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو پاکستان میں امن وامان' سلامتی اور جمہوریت کا لیکچر دیا ان تمام وارداتوں میں کسی بھی جگہ خوشی' عظمت' اطمینان اور کامیابی کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میں حیران تھا وزیراعظم خوش' خوش کیوں لوٹے ہیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور وہ چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا' وہ آصف علی زرداری سے لے کر وزیراعظم تک اور وزیراعظم سے لے کر صدر تک اور صدر سے لے کر جی ایچ کیو تک تمام مقتدر حلقوں اور مقتدر ہستیوں کا منظور نظر ہے' وہ پچھلے دس برسوں سے اقتدار کے ایوانوں کا اہم مہرہ چلا آ رہا ہے' اس نے صدر پرویز مشرف کی ہر نازک موقع پر مدد کی تھی' وہ پہلا شخص تھا جس نے پاکستان پیپلز پارٹی اور صدر پرویز مشرف کے درمیان رابطے کرائے تھے' جس نے پاکستانی میڈیا میں آصف علی زرداری کیلئے گنجائش پیدا کی تھی اور جو بیک وقت ایوان صدر اور زرداری ہاؤس دونوں کا مشیر ہے چنانچہ اگر دیکھا جائے تو وہ خبروں کا منبع ہے' وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے بتایا تھا مخدوم امین فہیم وزیراعظم نہیں بنیں گے۔ میں نے اس وقت اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا' محترمہ اس وقت تازہ تازہ شہید ہوئی تھیں اور آصف علی زرداری نے چند دن قبل مخدوم امین فہیم کو اپنا وزیراعظم قرار دیا تھا۔ میں نے اس خبر کا سورس اور وجہ پوچھی تو وہ ہنس کر ٹال گیا' لیکن الیکشن کے بعد اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے بتایا تھا وزیراعظم پنجاب سے ہوگا' وہ پہلا شخص تھا جس نے بتایا تھا وزیراعظم کوئی نہ کوئی مخدوم ہوگا' جس نے بتایا تھا جج بحال نہیں ہوں گے' جس نے بتایا تھا پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کا اتحاد نہیں ٹوٹے گا' جس نے بتایا تھا آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کے درمیان بڑے گہرے روابط ہیں اور جس نے بتایا تھا امریکہ بدستور صدر پرویز مشرف کی پشت پناہی کر رہا ہے اور وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے بتایا تھا وکلاء کی تحریک اچانک دم توڑ جائے گی اور جس نے مجھے اعتزاز احسن کے مستقبل کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے ہر بار اس کی بات سے اختلاف کیا لیکن اس کی تمام اطلاعات درست ثابت ہوئیں اور سیاست کا قافلہ اس کے بتائے راستے پر آگے بڑھتا رہا' اس نے مجھے اڑھائی برس قبل بتایا تھا آصف علی زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں پاکستان میں فوج اور امریکہ کی مخالفت کے ساتھ حکومت نہیں کی جا سکتی اور اگر کبھی آئندہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو زرداری صاحب اور محترمہ فوج اور امریکہ کو کبھی ناراض نہیں کریں گی۔

میں آج پھر اس کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور اس کا کہنا تھا "وزیراعظم امریکہ سے بہت خوش لوٹے ہیں" میں نے اس سے پوچھا "اس خوشی کی وجہ" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا "وزیراعظم 18 جون کو شرم الشیخ گئے تھے' وہاں ان کی ملاقات صدر بش کے ساتھ ہوئی تھی اور وزیراعظم نے بڑی حد تک صدر بش کو صدر پرویز مشرف کے مواخذے پر رضامند کر لیا تھا' صدر بش نے ان سے کہا تھا وہ حتمی جواب چند دنوں میں دیں گے" میں نے پوچھا "اور اب" اس نے مسکرا کر جواب دیا "اور اب صدر بش نے انہیں حتمی جواب دے دیا ہے" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا' وہ بولا "لیکن صدر بش اپنے پرانے دوست کی بے عزتی نہیں چاہتے' ان کا کہنا ہے جو بھی کیا جائے تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں رہ کر کیا جائے" میں نے پوچھا "اس کا مطلب ہے پھر مواخذہ نہیں ہوگا" اس نے ہاں میں سر ہلا دیا اور فوراً بولا "ہوگا' ہوگا لیکن اس طرح نہیں ہوگا جس طرح تم لوگ توقع کر رہے ہو" میری حیرت میں اضافہ ہو گیا' وہ بولا "تم مجھے ایک سوال کا جواب دو" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ بولا "میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری صدر پرویز مشرف سے

کیوں خائف ہیں" میں نے عرض کیا "صدر پرویز مشرف کے اختیارات اور بیک گراؤنڈ سے" اس نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولا "یہ ہوئی ناں بات' صدر مشرف کے پاس 58 دو' ب کے اختیارات ہیں' وہ کسی بھی وقت اسمبلیاں توڑ سکتے ہیں' ان کے پاس مسلح افواج کے سربراہان کی معطلی اور تقرری کے اختیارات بھی ہیں' الیکشن کمیشن بھی ان کا ماتحت ہے اور بڑی حد تک آئی ایس آئی بھی ان کے قریب ہے' وہ کمانڈو رہے ہیں' انہوں نے 9 برس تک بلا شرکت غیرے اقتدار کے مزے بھی لوٹے چنانچہ سب جانتے ہیں وہ کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں"۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا اور وہ بولا "چنانچہ اگر صدر پرویز مشرف سے ان کے یہ اختیارات واپس لے لئے جائیں تو میرا خیال ہے صدر پرویز مشرف خود ہی مستعفی ہو جائیں گے اور یہ ایک باعزت ترین ذریعہ ہے" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے عرض کیا "تو اس کا مطلب ہے حکومتی اتحاد صدر کا مواخذہ نہیں کرے گا" اس نے قہقہہ لگایا اور نرم آواز میں بولا "کر بھی رہا ہے اور نہیں بھی کر رہا" میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ بولا "مواخذے کی راہ میں چار بڑی رکاوٹیں ہیں' امریکہ' فوج' تین بڑی سیاسی جماعتیں اور این آر او" میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ بولا "میں بتا چکا ہوں صدر بش اپنے پرانے دوست صدر پرویز مشرف کی توہین نہیں چاہتے اور پاکستان پیپلز پارٹی امریکہ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ دوم' صدر پرویز مشرف آرمی چیف رہے ہیں' فوج کے دل میں آج بھی ان کیلئے ہمدردیاں موجود ہیں اور فوج اپنے سابق چیف "سویلین" کو سیاستدانوں کے سامنے جھکنے نہیں دے گی۔ سوم' ملک کی تین بڑی سیاسی جماعتیں صدر پرویز مشرف کے مواخذے پر رضامند نہیں ہیں' یہ پارٹیاں پاکستان مسلم لیگ ق' ایم کیو ایم اور اے این پی ہیں اور ان جماعتوں کی رضامندی کے بغیر مواخذے کیلئے پارلیمنٹ میں مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہوتی لیکن یہ جماعتیں 58 دو' ب اور سروسز چیفس کی تقرری کے اختیارات ختم کرنے پر رضامند ہیں اور چار' این آر او ہیں' 2007ء میں پاکستان پیپلز پارٹی اور صدر پرویز مشرف کے درمیان سمجھوتہ ہوا تھا' اس سمجھوتے کے نتیجے میں این آر او آئے تھے اور ان این آر او کی وجہ سے محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان واپس آئی تھیں' اس سمجھوتے کے دوران صدر پرویز مشرف کو برطانیہ' امریکہ اور متحدہ عرب امارات نے گارنٹی دی تھی' اس گارنٹی میں یہ شامل تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی صدر کا مواخذہ نہیں کرے گی" میں نے حیرت سے پوچھا "تو پھر ہو گا کیا؟" وہ بولا "بہت آسان ہے' صدر پرویز مشرف سے ان کے اختیارات واپس لے لئے جائیں اور ان سے موجودہ اسمبلیوں سے دوبارہ اعتماد کا ووٹ لینے کی درخواست کی جائے گی اور صدر صاحب استعفیٰ دے دیں گے" میں نے پوچھا "اور ججز کا ایشو" اس نے قہقہہ لگایا اور ذرا سا آگے جھک کر بولا "اس کیلئے ہمیں نومبر کا انتظار کرنا پڑے گا"۔ میں نے اس سے عرض کیا "لیکن میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کے مذاکرات بے نتیجہ رہے" اس نے قہقہہ لگایا اور کہا "لیکن ہو گا وہی جو میں نے تمہیں بتا دیا"۔

حاجی صاحب نے آخری عمر میں فیکٹری لگائی اور وہ چوبیس گھنٹے فیکٹری میں رہنے لگے' وہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے دفتر میں کام کرتے تھے اور جب تھک جاتے تھے تو فیکٹری کے گیسٹ ہاؤس میں سو جاتے تھے' حاجی صاحب کے مزاج کی یہ تبدیلی سب کیلئے حیران کن تھی' وہ تیس برس تک دنیاداری' کاروبار اور روپے پیسے سے الگ تھلگ رہے تھے' انہوں نے یہ عرصہ عبادت اور ریاضت میں گزارا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ریاضت کا بڑا خوبصورت صلہ دیا تھا' وہ اندر سے روشن ہو گئے تھے' وہ صبح آٹھ بجے اپنی بیٹھک کھولتے تھے اور رات گئے تک ان کے گرد لوگوں کا مجمع رہتا تھا' لوگ اپنی اپنی حاجت لے کر ان کے پاس آتے تھے' وہ ان کیلئے دعا کا ہاتھ بلند کر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ سائل کے مسائل حل فرما دیتا تھا' اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبولیت سے سرفراز کر رکھا تھا لیکن پھر اچانک حاجی صاحب کی زندگی نے پلٹا کھایا' وہ ایک دن اپنی گدی سے اٹھے' بیٹھک بند کی' اپنے بیٹوں سے سرمایہ لیا اور گارمنٹس کی ایک درمیانے درجے کی فیکٹری لگائی' انہوں نے اس فیکٹری میں پانچ سو خواتین رکھیں' خود اپنے ہاتھوں سے یورپی خواتین کیلئے کپڑوں کے نئے ڈیزائن بنائے' یہ ڈیزائن یورپ بھجوائے' باہر سے آرڈر آئے اور حاجی صاحب نے مال بنوانا شروع کر دیا' یوں ان کی فیکٹری چل نکلی اور حاجی صاحب دونوں ہاتھوں سے ڈالر سمیٹنے لگے' دنیا میں اس وقت گارمنٹس کی کم و بیش دو' تین کروڑ فیکٹریاں ہوں گی اور ان فیکٹریوں کے اتنے ہی مالکان ہوں گے لیکن ان دو' تین کروڑ مالکان میں حاجی صاحب جیسا کوئی دوسرا کردار نہیں ہوگا۔ پوری دنیا میں لوگ بڑھاپے تک کاروبار کرتے ہیں اور بعد ازاں روپے پیسے اور اکاؤنٹس سے تائب ہو کر اللہ' اللہ شروع کر دیتے ہیں لیکن حاجی صاحب ان سے بالکل الٹ ہیں' انہوں نے پینتیس سال کی عمر میں کاروبار چھوڑا' اللہ سے لو لگائی لیکن جب وہ اللہ کے قریب ہو گئے تو انہوں نے اچانک اپنی آباد خانقاہ چھوڑی اور مکروہات کے گڑھے میں چھلانگ لگا دی' وہ دنیا کے واحد بزنس مین ہیں جو فیکٹری سے درگاہ تک گئے تھے اور پھر درگاہ سے واپس فیکٹری پر آ گئے۔

حاجی صاحب کی کہانی ایک کتے سے شروع ہوئی تھی اور کتے پر ہی آ کر ختم ہوئی تھی' یہ 35 برس پرانی بات تھی' حاجی صاحب کی گارمنٹس فیکٹری تھی' حاجی صاحب صبح صبح فیکٹری چلے جاتے تھے اور رات بھیگنے تک کام کرتے تھے' ایک دن وہ فیکٹری پہنچے تو انہوں نے دیکھا ایک درمیانے قد کاٹھ کا کتا گھسٹ گھسٹ کر ان کے گودام میں داخل ہو رہا ہے' حاجی صاحب نے غور کیا تو پتہ چلا کتا شدید زخمی ہے' شائد وہ کسی گاڑی کے نیچے آ گیا تھا جس کے باعث اس کی تین ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ صرف ایک ٹانگ کے ذریعے اپنے جسم کو گھسیٹ کر ان کے گودام تک پہنچا تھا' حاجی صاحب کو کتے پر بڑا رحم آیا' انہوں نے سوچا وہ کتے کو جانوروں کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں' اس کا علاج کراتے ہیں اور جب کتا ٹھیک ہو جائے گا تو وہ اسے گلی میں چھوڑ دیں گے۔ حاجی صاحب نے ڈاکٹر سے رابطے کیلئے فون اٹھایا لیکن نمبر ملانے سے قبل ان کے دل میں ایک انوکھا خیال آیا اور حاجی صاحب نے فون واپس رکھ دیا۔ حاجی صاحب نے سوچا کتا شدید زخمی ہے' اس کی تین ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں' اس کا جبڑا زخمی ہے اور پیٹ پر بھی چوٹ کا نشان ہے چنانچہ کتا اب روزی' روٹی کا بندوبست نہیں کر سکتا' حاجی صاحب نے سوچا' اب دیکھنا یہ ہے قدرت اس کتے کی خوراک کا بندوبست کیسے کرتی ہے' حاجی صاحب نے مشاہدے کا فیصلہ کیا اور چپ چاپ بیٹھ گئے' وہ کتا سارا دن گودام میں بے ہوش پڑا رہا' شام کو جب اندھیرا پھیلنے لگا تو حاجی صاحب نے دیکھا ان کی فیکٹری کے گیٹ کے نیچے سے ایک دوسرا کتا اندر داخل ہوا' کتے کے منہ میں ایک لمبی سی بوٹی تھی' کتا چھپتا چھپاتا گودام تک پہنچا' زخمی کتے کے قریب آیا' اس نے پاؤں سے زخمی کتے کو جگایا اور بوٹی اس کے منہ میں دے دی' زخمی کتے کا جبڑا حرکت نہیں کر پا رہا تھا چنانچہ اس نے بوٹی واپس اگل دی' صحت مند کتے نے بوٹی اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالی' بوٹی چبائی جب وہ اچھی طرح نرم ہو گئی تو اس نے بوٹی کا لقمہ سا بنا کر زخمی کتے کے منہ میں دے دیا' زخمی کتا بوٹی نگل گیا' اسکے بعد وہ کتا گودام سے باہر آیا' اس نے پانی کے حوض میں اپنی دم گیلی کی' واپس گیا اور دم زخمی کتے کے منہ میں دے دی' زخمی کتے نے صحت مند کتے کی دم چوس لی' صحت مند کتا اس کارروائی کے بعد اطمینان سے واپس چلا گیا' حاجی صاحب مسکرا پڑے' اس کے بعد یہ کھیل روزانہ ہونے لگا' روز کتا آتا' زخمی کتے کو بوٹی کھلاتا' پانی پلاتا اور چلا جاتا۔ حاجی صاحب کئی دنوں تک یہ کھیل دیکھتے رہے' ایک دن حاجی صاحب نے اپنے آپ سے پوچھا ''وہ قدرت جو اس زخمی کتے کو رزق فراہم کر رہی ہے کیا وہ مجھے دو وقت کی روٹی نہیں دے گی؟''

سوال بہت دلچسپ تھا' حاجی صاحب رات تک اس سوال کا جواب تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ وہ توکل کی حقیقت بھانپ گئے' انہوں نے فیکٹری اپنے بھائی کے حوالے کی اور تارک الدنیا ہو گئے' وہ مہینے میں تیس دن

روزے رکھتے اور صبح صادق سے اگلی صبح کاذب تک رکوع و سجود کرتے 'وہ برسوں اللہ کے دربار میں کھڑے رہے '

اس عرصے میں اللہ انہیں رزق بھی دیتا رہا اور ان کی دعاؤں کو قبولیت بھی۔یہاں تک کہ وہ صوفی بابا کے نام سے مشہور ہو گئے اور لوگ ان کے پاؤں کی خاک کا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالنے لگے لیکن پھر ایک دوسرا واقعہ پیش آیا اور صوفی بابا دوبارہ حاجی صاحب ہو گئے۔

یہ سردیوں کی ایک نیم گرم دوپہر تھی' صوفی بابا کی بیٹھک میں درجنوں عقیدت مند بیٹھے تھے' صوفی بابا ان کے ساتھ روحانیت کی رموز شیئر کر رہے تھے' باتوں ہی باتوں میں صوفی بابا نے کتے کا قصہ چھیڑ دیا اور اس قصے کے آخر میں حاضرین کو بتایا "رزق ہمیشہ انسان کا پیچھا کرتا ہے لیکن ہم بے وقوف انسانوں نے رزق کا پیچھا شروع کر دیا ہے' اگر انسان کی توکل زندہ ہو تو رزق انسان تک ضرور پہنچتا ہے بالکل اس کتے کی طرح جو زخمی ہوا تو دوسرا کتا اس کے حصے کا رزق لے کر اس کے پاس آ گیا۔میں نے اس زخمی کتے سے توکل سیکھی' میں نے دنیاداری ترک کی اور اللہ کی راہ میں نکلا آیا' آج اس راہ کا انعام ہے میں آپ کے درمیان بیٹھا ہوں۔ان تیس برسوں میں کوئی ایسا دن نہیں گزرا جب اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی وسیلے سے مجھے رزق نہ دیا ہو یا میں کسی رات بھوکا سویا ہوں' میں ہمیشہ اس زخمی کتے کو تھینک یو کہتا رہتا ہوں جس نے مجھے توکل کا سبق سکھایا تھا" صوفی بابا کی محفل میں ایک نوجوان پروفیسر بھی بیٹھا تھا' پروفیسر نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کان میں ایم پی تھری کا ائر فون لگا تھا' نوجوان پروفیسر نے ائر فون اتارا اور قہقہہ لگا کر بولا "صوفی بابا ان دونوں کتوں میں افضل زخمی کتا نہیں تھا بلکہ وہ کتا تھا جو روز شام کو زخمی کتے کو بوٹی چبا کر کھلاتا تھا اور اپنی گیلی دم سے اس کی پیاس بجھاتا تھا' کاش آپ نے زخمی کتے کے توکل کی بجائے صحت مند کتے کی خدمت' قربانی اور ایثار پر توجہ دی ہوتی تو آج آپ کی فیکٹری پانچ' چھ سو لوگوں کا چولہا جلا رہی ہوتی" صوفی بابا کو پسینہ آ گیا' نوجوان پروفیسر بولا "صوفی بابا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہوتا ہے' وہ صحت مند کتا اوپر والا ہاتھ تھا جبکہ زخمی کتا نیچے والا۔افسوس آپ نے نیچے والا ہاتھ تو دیکھ لیا لیکن آپ کو اوپر والا ہاتھ نظر نہ آیا۔میرا خیال ہے آپ کا یہ سارا تصوف اور سارا توکل خود غرضی پر مبنی ہے کیونکہ ایک سخی بزنس مین دس ہزار نکمے اور بے ہنر درویشوں سے بہتر ہوتا ہے" نوجوان اٹھا' اس نے سلام کیا اور بیٹھک سے نکل گیا' حاجی صاحب نے دو رکعت نفل پڑھے' بیٹھک کو تالا لگایا اور فیکٹری کھول لی' وہ اب عبادت بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی۔

''سات کروڑ' دس لاکھ روپے کی بے عزتی''

لاہور میں میرے ایک دوست رہتے ہیں' وہ بہت خوشحال ہیں' اللہ تعالیٰ نے انہیں دھن' دولت اور خوشحالی سے نواز رکھا ہے' وہ بلا کے مہمان نواز اور محفل ساز ہیں' وہ کھانا پکوانے اور کھلانے کے بھی ماہر ہیں' میں ایک بار ان سے ملاقات کیلئے لاہور گیا' اس دن ان کی بیگم بیمار تھیں اور خانساماں چھٹی پر تھا چنانچہ انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور ایم ایم عالم روڈ کے ایک مشہور ریستوران میں لے گئے' اس دن ریستوران میں بہت رش تھا' ہم دونوں نے ایک میز پسند کی اور اس پر قابض ہو گئے' ہم بڑی دیر تک وہاں بیٹھے رہے لیکن آرڈر لینے کیلئے ویٹر نہ آیا' میرے دوست نے میز بجانا شروع کر دی مگر ریستوران کی انتظامیہ نے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا' ہم بڑی حیرت سے دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھتے رہے لیکن ''کسی نے میری گل نہ سنی'' یہ صورتحال دیکھ کر میرا دوست اٹھا اور منیجر کے کمرے میں چلا گیا اور اس سے عرض کیا ''جناب کیا آپ دو منٹ کیلئے ہماری میز پر آ سکتے ہیں'' منیجر روایتی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گیا' میرے دوست نے اسے میز پر بٹھایا اور نہایت عاجزی سے بولا ''جناب اللہ کا بڑا کرم ہے میرا گھربار ہے' گھر میں بیوی بھی ہے اور اسے بڑا زبردست کھانا بھی پکانا آتا ہے' اللہ کی مہربانی سے میں نے گھر میں کک بھی رکھا ہوا ہے اور وہ انڈین' چائنیز' لبنانی اور تھائی کھانے بنانے کا ماہر ہے' میرے گھر میں آپ کے ریستوران کے مقابلے میں کراکری بھی بہت اچھی ہے لیکن ہم یہ ساری سہولتیں چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئے' ذرا بتایئے بھلا کیوں؟'' منیجر پریشان ہو گیا اور نیپکن سے ماتھا پونچھ کر بولا ''آئی ڈونٹ نو سر'' میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور نرم آواز میں بولا ''بٹ آئی نو سر'' ہم یہاں صرف اور صرف اس لئے آئے ہیں کہ گھر میں ہماری عزت نہیں ہے' میں وہاں سارا سارا دن بڑ بڑاتا رہتا ہوں لیکن میری بیوی مجھے لفٹ نہیں کراتی اور میرا خانساماں بھی کھانا پکانے میں بہت ٹائم لگا دیتا ہے چنانچہ میں نے سوچا آپ کے ریستوران میں آ جاتا ہوں' ہمیں یہاں عزت بھی ملے گی اور کھانا بھی لیکن یہاں آ کر محسوس ہوا آپ کے ریستوران اور میرے گھر میں کوئی فرق نہیں لہٰذا میں اپنے مہمان کو واپس گھر لے جا رہا ہوں'' منیجر مسکرا پڑا اور عاجزی سے بولا ''سر میں آپ سے معافی چاہتا ہوں'' میرے دوست نے بھی قہقہہ لگایا اور بولا ''لیکن میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا کیونکہ میں نے سوچ لیا ہے اگر ہم نے بے عزت ہی ہونا ہے تو اس کیلئے دنیا میں میرے گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں'' میرا دوست اٹھا' اس نے منیجر کے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے لے کر واقعی اپنے گھر آ گیا۔

ہمارے محترم وزیراعظم یوسف رضا گیلانی جب سے امریکہ کے دورے پر نکلے ہیں اور وہاں ان کی جس طرح ''آؤ بھگت'' ہو رہی ہے مجھے وہ دیکھ دیکھ کر اپنا یہ دوست اور ریستوران کا وہ ماحول یاد آ رہا ہے اور مجھے رہ رہ کر محسوس ہوتا ہے اگر ہمارے وزیراعظم نے یہی عزت افزائی کرانا تھی تو انہیں پاکستان سے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' وہ بس پروٹوکول اور سیکورٹی کے بغیر راولپنڈی پہنچ جاتے اور اس کے بعد عوام کا ''والہانہ پن'' ملاحظہ فرما لیتے' یوں ان کی آؤ بھگت بھی ہو جاتی' ان کا وقت بھی بچ جاتا اور قوم کا سرمایہ بھی محفوظ رہتا۔ وزیراعظم نے امریکہ کا دورہ فرما کر دو غلطیاں کیں' ایک وہ آؤ بھگت کیلئے امریکہ چلے گئے اور دوسرا وہ جناب رحمان ملک' شیری رحمان' راجہ پرویز اشرف اور شاہ محمود قریشی کو بھی ساتھ لے گئے' وزیراعظم کی اس زیادتی کے باعث قوم چار دن سے ان حضرات کی کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ خود سوچئے اگر رحمان ملک وزیراعظم کی غیر موجودگی میں ملک میں ہوتے تو وہ اس دوران کم از کم تین' چار ایسے نوٹیفکیشن جاری فرما چکے ہوتے جنہیں حکومت بعد از اں واپس لیتی اور پوری دنیا اس پر واہ' واہ کرتی۔ اسی طرح اگر محترمہ شیری رحمان ملک میں ہوتیں تو وہ بھی اب تک چار' پانچ ایسی کانفرنسیں فرما چکی ہوتیں جن کے آخر میں صحافی ایک دوسرے سے پوچھتے محترمہ کہنا کیا چاہتی تھیں' اگر اس دوران راجہ پرویز اشرف ملک میں ہوتے تو وہ لوڈشیڈنگ کے تین' چار گھنٹوں میں اضافہ فرما چکے ہوتے لیکن وزیراعظم ان حضرات اور خاتون کو بھی ساتھ لے گئے چنانچہ ان تین' چار دنوں میں ملک میں امن وامان رہا جس سے پاکستان پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں بڑی شدید کمی واقع ہوئی۔ وزیراعظم نے ایک اور ستم بھی فرما دیا' وہ وزیرخارجہ شاہ محمود قریشی کو بھی ساتھ لے گئے چنانچہ عوام ان چار دنوں میں گیس کے نرخوں میں 13 روپے اضافے سے بھی محروم رہے' جس کی وجہ سے پارٹی شدید خفت اور پریشانی کا شکار ہے لیکن کیونکہ یہ حضرات اور وزیراعظم واپس آ چکے ہیں لہٰذا مجھے یقین ہے کل سے عوام کی تفنن طبع کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائے گا اور محترم رحمان ملک عنقریب کوئی نہ کوئی ایسا نوٹیفکیشن جاری کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے بعد پوری حکومت اور پارٹی زمین پر لیٹ کر معافی مانگے گی لیکن ان کی جان نہیں چھوٹے گی اور یوں خوشحالی اور

جمہوریت کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا۔

ہماری حکومت کا دعویٰ ہے وزیراعظم کا دورہ تاریخی بھی تھا اور کامیاب بھی۔ میں حکومت کے اس دعوئی سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ اگر دورے کے دوران ہونے والی بدنظمی' حماقتوں اور رخ فتوں کی فہرست بنائی جائے تو اس لحاظ سے یہ دورہ کامیاب بھی تھا اور تاریخی بھی۔ وزیراعظم اور ان کا وفد جب لندن پہنچا تو ماشاءاللہ برطانوی حکومت نے وفد کو کسی قسم کی لفٹ نہیں کرائی تھی' وزیراعظم لندن سے واشنگٹن روانہ ہونے لگے تو برطانوی سول ایوی ایشن نے ان کے طیارے کو اڑنے کی اجازت نہیں دی تھی جس کی وجہ سے وفد کئی گھنٹے ہیتھرو ائرپورٹ پر خوار ہوتا رہا تھا' وزیراعظم واشنگٹن پہنچے تو ائرپورٹ پر سفارتی ضابطوں کے برخلاف ان کیلئے سرخ قالین نہیں بچھایا گیا اور وزیراعظم اور بیگم صاحبہ کو طیارے سے چلا کر چبوترے تک لے جایا گیا' اس دوران وفد کے باقی ارکان کو طیارے سے اترنے نہیں دیا گیا' وزیراعظم چلے گئے تو وفد کے باقی لوگ امیگریشن کیلئے آٹھ گھنٹے تک ائرپورٹ پر خوار ہوتے رہے تھے کیونکہ امیگریشن کا صرف ایک نمائندہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا جو وفد کی انٹری کر رہا تھا اور وزیراعظم کو صرف اسسٹنٹ سیکرٹری رچرڈ باؤچر نے ریسیو کیا تھا' صدر بش کے ساتھ ملاقات کے بعد بھی میڈیا کو وزیراعظم سے سوال جواب کی اجازت نہیں دی گئی تھی' پاکستان ایمبیسی کے عشائیے میں شرکت کیلئے بھی وفد کو گلی میں قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور تمام مندوبین کو اس وقت تک سفارتخانے میں داخلے کی اجازت نہیں دی گئی تھی جب تک کتے نے سونگھ کر ان کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی تصدیق نہیں کر دی۔ دورے کے دوران صدر جارج بش مناسب موقعوں پر آنکھ مار کر ہماری درخواستوں کا مذاق بھی اڑاتے رہے تھے اور کونڈا لیزا رائس نے بھی "ڈو مور" کا مطالبہ کر دیا تھا اور پیچھے رہ گئی ہمارے وزیراعظم کی انگریزی تو ماشاءاللہ پوری دنیا میں اس کی دھوم مچ چکی ہے چنانچہ اگر اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ دورہ ہر لحاظ سے کامیاب تھا لیکن کیونکہ میں ایک منفی ذہن کا صحافی ہوں لہٰذا مجھے حکومت کی یہ کامیابی ہضم نہیں ہو رہی اور میں یہ سمجھتا ہوں اگر ہمارے محبوب وزیراعظم امریکہ کی بجائے راولپنڈی چلے جاتے تو ان کا وفد نہ صرف بے عزتی سے لطف اندوز ہو سکتا تھا بلکہ اس سے ملک کے وہ سات کروڑ' دس لاکھ روپے بھی بچ سکتے تھے جو ہم نے 60 رکنی وفد کی بے عزتی کرانے پر خرچ کر دیئے ہیں۔ جی ہاں یہ پاکستان کی تاریخ کی مہنگی ترین بے عزتی تھی' ہم نے اس بے عزتی کیلئے ون ملین ڈالر خرچ کئے ہیں' یہ رقم پاکستانی کرنسی میں سات کروڑ' دس لاکھ روپے بنتے ہیں اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایک نہایت ہی کامیاب دورہ تھا۔

ہم کب جاگیں گے

12 جولائی کی رات چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے ملک کے چند سینئر کالم نگاروں کو ڈنر اور گفتگو کی دعوت دی تھی' میں بھی اس گفتگو میں شریک تھا' جنرل صاحب رات گئے تک برف کی چٹان بن کر صحافیوں کے درمیان بیٹھے رہے تھے جبکہ ملک کے سینئر ترین کالم نگار جنرل صاحب کو اپنے گرما گرم سوالوں سے جذباتی کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جنرل اشفاق پرویز کیانی ہر کھولتے اور ابلتے ہوئے تیزابی سوال کو ہنس کر ٹال جاتے تھے۔ کالم نگار ذرا دیر بعد سوالوں کی نئی صف بندی کرتے تھے اور جنرل صاحب پر دوبارہ "اٹیک" شروع کر دیتے تھے لیکن وہ یہ کہہ کر "آپ بتایئے اس مسئلے کا کیا حل ہے" صحافیوں کے سوال صحافیوں کی طرف لوٹا دیتے تھے۔ یہ نشست دیر تک جاری رہی تھی' میری اس رات فلائٹ تھی' میں فرانس جا رہا تھا چنانچہ میں نے معذرت کی اور ائیر پورٹ چلا گیا اور یوں پاکستانی سیاست کے ساتھ میرا تعلق پندرہ دن کیلئے منقطع ہو گیا۔

اس دوران میں تین دن کیلئے مراکش بھی گیا' مراکش بلا شبہ میرے لئے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے اور میں بہت جلد مراکش کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا۔ سر دست میں مراکش کے بارے میں چند موٹی موٹی باتیں کرتا جاتا ہوں۔ مراکش ایک اسلامی ملک ہے لیکن حکومت کی لبرل پالیسیوں کے باعث مراکش کا شمار اس وقت دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے' مراکش شہر دو حصوں میں تقسیم ہے' شہر کا قدیم حصہ مدینہ کہلاتا ہے اور بڑی حد تک اندرون لاہور سے ملتا جلتا ہے لیکن بھاٹی اور لاہوری کے برعکس اس کی گلیاں' محلے اور گھر صاف ستھرے ہیں' مجھے پرانے شہر میں کوئی کھلی نالی نہیں ملی اور کسی جگہ کوئی گٹر ابلتا نظر نہیں آیا' شہر کا دوسرا حصہ جدید ہے' یہ حصہ یورپی سٹائل میں بنایا گیا ہے اور اس میں یورپی سٹائل کی سڑکیں' پارکس' میگا مالز اور کیفے بارز ہیں اور آپ اس حصے میں گھومتے پھرتے ہوئے چند لمحوں کیلئے فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ آپ اس وقت کسی اسلامی ملک میں موجود ہیں۔ مراکش سٹی دن کو سونے اور رات کو جاگنے والا شہر ہے' شہر کی نوے فیصد آبادی دن کو اونگھتی رہتی ہے لیکن جوں ہی شام رات کی آغوش میں اترتی ہے تو پورے شہر کی آنکھ کھل جاتی ہے جس کے بعد شہر کی تمام عمارتیں' سڑکیں' پارکس' گلیاں اور بازار روشنیوں میں نہا جاتے ہیں' مقامی فنکار آلات موسیقی لے کر گھروں سے نکلتے ہیں' کھلے میدانوں اور چوکوں میں بیٹھ جاتے ہیں' لوگ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور رات بھیگنے تک موسیقی اور رقص کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سیاحت مراکش کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے' ایک اندازے کے مطابق سیاحوں کی تین سو سے زائد فلائٹس روزانہ یورپ' امریکہ اور مشرق بعید سے مراکش آتی ہیں اور ہزاروں لاکھوں سیاح ہفتوں تک مراکش میں یوروز' پاؤنڈز اور ڈالرز لٹاتے رہتے ہیں۔ مراکش کی حکومت سیاحوں کی اہمیت سے واقف ہے چنانچہ اس ملک میں سیاحوں کو خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ میں تین دن مراکش سٹی میں پھرتا رہا' میں نے ان تین دنوں میں نوٹ کیا آپ ہوٹل سے لے کر بینک اور بینک سے گلی محلے کے چھوٹے سے چھوٹے منی چینجرز کے پاس چلے جائیں آپ کو تمام جگہوں پر ڈالرز' پاؤنڈز اور یوروز کا یکساں ایکسچینج ریٹ ملے گا' ٹیکسیاں بہت سستی ہیں اور تمام ٹیکسی ڈرائیور غیر ملکیوں کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتے ہیں' دکانداروں کا رویہ بھی سیاحوں کے ساتھ بڑا دوستانہ ہے' مراکش میں اگر کوئی سیاح کسی دکاندار' ٹیکسی ڈرائیور یا ہوٹل کی انتظامیہ کی شکایت کر دے تو حکومت اس کا اتنا خوفناک نوٹس لیتی ہے کہ فراڈ کرنے والے کیلئے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے' پورے شہر میں امن اور سکون ہے اور سیاح رات گئے تک بلا خوف و خطر سڑکوں پر پھرتے رہتے ہیں۔

میں 29 جولائی کو واپس لوٹا تو اسلام آباد پہنچتے ہی ایک بری خبر ملی' میرے ایک دوست ہیں سردار تنویر الیاس' سردار صاحب کے والد صاحب سعودی عرب کے دوسرے بڑے کاروباری گروپ التمیمی کے ساتھ منسلک ہیں' وہ سعودی عرب کے شاہی خاندان کے بہت قریب ہیں' سردار صاحب نے تین برس قبل اسلام آباد میں سینٹورس کے نام سے ایک سیون سٹار ہوٹل اور میگا کمپلیکس کی بنیاد رکھی تھی' یہ پاکستان کی تاریخ کا مہنگا ترین پراجیکٹ ہے اور اس پراجیکٹ کیلئے سردار تنویر الیاس نے سی ڈی اے کی تاریخ کا مہنگا ترین پلاٹ خریدا تھا' سردار صاحب نے سعودی عرب اور گلف کی بے شمار کمپنیوں کو بھی پاکستان میں سرمایہ کاری پر تیار کیا تھا' سینکڑوں کی تعداد میں اوورسیز پاکستانیوں نے بھی اس پراجیکٹ میں سرمایہ کاری کی تھی اور صدر پرویز مشرف کے بقول یہ منصوبہ آنے والے دنوں میں ایفل ٹاور کی طرح اسلام آباد کی شناخت بن جائے گا لیکن 29 جولائی کو سردار تنویر الیاس کے ساتھ ایک انتہائی خوفناک حادثہ پیش آ گیا' دن گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان آٹھ نوجوان ڈاکو سردار تنویر الیاس

کے گھر میں داخل ہوئے' انہوں نے سیکورٹی گارڈ کو زخمی کر کے پھینکا' گھر کے افراد کو ایک کمرے میں بند کیا' ملازموں کو یرغمال بناکر اڑھائی کروڑ روپے کے زیورات' نقدی اور قیمتی اشیاء جمع کیں' ان کی گٹھڑی بنائی اور فرار ہو گئے۔ میں نے جونہی اسلام آباد پہنچ کر موبائل فون آن کیا تو مجھے سردار تنویر الیاس کی ٹیلی فون کال آ گئی' وہ بری طرح گھبرائے ہوئے تھے' ان کا کہنا تھا انہیں اللہ تعالیٰ نے بے تحاشا دے رکھا ہے' ان کیلئے دو اڑھائی' تین کروڑ بڑی رقم نہیں لیکن اصل مسئلہ پاکستان کا امیج ہے' سردار تنویر الیاس کا کہنا تھا اس ڈاکے کی خبر جب عام ہو گی تو غیر ملکی سرمایہ کاروں بالخصوص اوورسیز پاکستانی سرمایہ کاروں کا پاکستان پر اعتماد مزید متزلزل ہو جائے گا اور وہ لوگ یہ سمجھیں گے جس ملک میں سردار تنویر الیاس جیسا شخص محفوظ نہیں' جس ملک میں حکومت اسلام آباد کے سب سے بڑے غیر ملکی پراجیکٹ کے مالک کو تحفظ نہیں دے پائی اور جس ملک کے دارالحکومت میں دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں' جس ملک میں پرائیویٹ گارڈز اور دس' دس ملازم ڈاکوؤں کو روکنے میں ناکام رہتے ہیں اور جس ملک میں ڈاکو پورے اطمینان سے گھر کو لوٹ کر پیدل فرار ہو جاتے ہیں اس ملک میں انہیں سرمایہ کاری کا رسک نہیں لینا چاہئے۔ سردار تنویر الیاس کا کہنا تھا اس حادثے کے بعد ان کی امید کی آخری لو بھی کانپنے لگی ہے۔

میں نے سردار تنویر الیاس کو جھوٹی سچی تسلی دے دی لیکن پاکستان واپس آتے ہی میرا دل بوجھل ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا ایک طرف مراکش جیسے ممالک ہیں جن میں سیاح تک محفوظ ہیں' جن میں حکومت سیاحوں کو گارنٹی دیتی ہے آپ ملک کے کسی بھی حصے میں کرنسی تبدیل کرائیں آپ کے ساتھ ایک درہم کی ہیرا پھیری نہیں ہو گی' جن میں حکومت نے سیاحوں کو مقدس مقام دے رکھا ہے اور پورے ملک میں کسی شخص کو سیاح کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں جبکہ دوسری طرف ہمارا ملک ہے جس میں سرمایہ کاروں کا سرمایہ اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ سوچنے کی بات ہے مراکش سیاحوں کو اتنا اہم مقام کیوں دیتا ہے؟ بات بڑی واضح ہے مراکش کی حکومت جانتی ہے جو شخص بھی مراکش کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے وہ سرمایہ کار کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ملک کی معیشت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے' وہ عوام کیلئے روزی روٹی کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ جب تک سرمایہ کار اور اس کا اعتماد محفوظ نہیں رہے گا اس وقت تک مراکش آگے نہیں بڑھے گا۔ مراکش حکومت کی یہ سوچ ہے جس کی وجہ سے یہ ملک آج سرمایہ کاروں کی جنت بنتا چلا جا رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ہمارے ملک میں سردار تنویر الیاس جیسے لوگ اور ان کے گھر تک محفوظ نہیں ہیں' یہ لوگ دن دیہاڑے لٹتے جا رہے ہیں لہٰذا سوچئے پھر ہم پر کون اعتماد کرے گا۔ سرمایہ کاروں کے دل ٹڈی کے پروں سے بنے ہوتے ہیں' یہ لوگ گھاس کی پتی لرزنے سے بھی گھبرا جاتے ہیں اور اپنا سرمایہ سمیٹ کر اس ملک میں جا بستے ہیں جہاں گھاس نہیں اگتی۔ آپ ستم ظریفی دیکھئے ہمارے ملک میں سردار تنویر الیاس جیسے سرمایہ کاروں کی عزت نفس اور حوصلوں کو دن دیہاڑے کچلا جا رہا ہے جبکہ حکومت آئی ایس آئی اور آئی بی کو وزارت داخلہ کے ماتحت بنانے کے نوٹیفکیشن جاری کرنے اور واپس لینے میں مصروف ہے۔ پاکستان کی معاشی فصلیں اجڑ رہی ہیں اور ہمارے وزیراعظم امریکہ میں پاکستان کی امداد بڑھانے کی درخواستیں کر رہے ہیں۔ ہم کس صدی کے لوگ ہیں اور ہماری عقل کس غار میں جا سوئی ہے' ہم کب جاگیں گے

-

لبنانی دانشور خلیل جبران کا قول ہے ”اس نے کہا میں نے مان لیا‘ اس نے پھر کہا تو مجھے شک گزرا‘ اس نے تیسری بار وہی بات قسم اٹھا کر کہی تو مجھے یقین ہو گیا وہ جھوٹ بول رہا ہے“ خلیل جبران کا یہ قول انسانی نفسیات کی ایک خامی کا عکاس ہے جب بھی انسان جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بات کو بار بار دہراتا ہے‘ اگر اس دوران سننے والا اس بات پر یقین کر لے تو بھی وہ بات کے ساتھ قسم اٹھا دیتا ہے‘ آپ کپڑا بیچنے والوں کی نفسیات کا جائزہ لے لیں‘ آپ دیکھیں گے شیخ صاحب تھان کھولتے ہی گاہک کو اپنا بھائی یا بہن ڈکلیئر کر دیتے ہیں اور بار بار یہ کہتے ہیں ”بس جی آپ کو خرید کے برابر دے رہا ہوں“ سودے بازی کے دوران شیخ صاحب کوئی مناسب موقع دیکھ کر قسم تک اٹھا جاتے ہیں لیکن گاہک کو چند دن بعد معلوم ہوتا ہے شیخ صاحب اپنے منہ بولے بھائی یا بہن کے ساتھ ٹھیک ٹھاک ہاتھ کر گئے ہیں‘ انسان کی یہ خامی سفارت کاری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے‘ سفارت کار ‘ سیاستدانوں اور لیڈروں کی اس حرکت کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہیں اور اس تجزیئے کے دوران بڑے بڑے نتائج اخذ کرتے ہیں‘ سفارت کاری کے ادارے انسان کی اس خامی اور اس کے نتائج سے واقف ہیں چنانچہ ترقی یافتہ ممالک اپنے سفارت کاروں کو ہمیشہ بات دہرانے سے پرہیز کی ٹریننگ دیتے ہیں اور ساتھ ہی انہیں سختی سے حکم دیتے ہیں کہ جب بھی میزبان ملک کا کوئی بڑا عہدیدار گفتگو کے دوران بار بار ایک ہی بات دہرائے تو اس کی اطلاع فوراً وزارت خارجہ کو دے دی جائے تاکہ اس کا بروقت سدباب کیا جا سکے‘ میں اس سلسلے میں آپ کو دو مثالیں پیش کرتا ہوں‘ ستر کی دہائی میں جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا تو وہ اپنے ہر بیان میں نوے دنوں میں الیکشن کرانے کی یقین دہانی کراتے تھے‘ جب ان یقین دہانیوں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تو امریکہ کے ایک بڑے عہدیدار نے اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا ”جنرل ضیاء نو سال سے پہلے واپس نہیں جائیں گے“ پوچھنے والے نے اس دعوے کی وجہ دریافت کی تو امریکی عہدیدار نے ہنس کر جواب دیا ”جنرل ضیاء نوے دنوں کی اس قدر گردان کر چکے ہیں کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے وہ نو سال سے پہلے نہیں جائیں گے“ دوسری مثال بین الاقوامی نوعیت کی ہے‘ چند سال پہلے چار ایشین ٹائیگرز ملائشیا‘ انڈونیشیا‘ تھائی لینڈ اور ہانگ کانگ شدید مالیاتی بحران کا شکار ہو گئے تھے‘ ان چاروں ممالک کی انڈسٹری بند ہو گئی‘ پیداوار رک گئی اور ان کی سٹاک ایکسچینجز جڑوں تک ہل گئیں‘ اس وقت امریکہ کو خطرہ محسوس ہوا چین اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کیلئے کہیں اپنی کرنسی کی قیمت نہ گرا دے لہٰذا امریکی انتظامیہ نے چینی زعماء سے مہربانی کی اپیل کر دی جس پر چینی وزارت خزانہ نے امریکی ماہرین کو کرنسی کی قیمت برقرار رکھنے کی یقین دہانی کرا دی‘ کچھ عرصہ بعد چین کے وزیر خارجہ نے ایک عالمی فورم پر یہ یقین دہانی دہرا دی جب یہ خبر ذرائع ابلاغ سے ہوتی ہوئی امریکہ پہنچی تو امریکی وزیر خزانہ اپنی تمام مصروفیات منسوخ کر کے چین پہنچ گیا اور جاتے ہی چین کے وزیر خزانہ کے گھٹنے پکڑ لئے‘ چین کے وزیر خزانہ نے حیران ہو کر کہا ”حضور ہم تو آپ کو دو بار یقین دلا چکے ہیں‘ آپ کیوں پریشان ہیں“ امریکی وزیر خزانہ نے گھگھیا کر جواب دیا ”جناب عالی! ہمیں یہی تو پریشانی ہے‘ آپ نے پہلی بار فرمایا تو ہم نے یقین کر لیا لیکن جب آپ نے دوسری بار یقین دہانی کرائی تو ہم گھبرا گئے‘ اب آپ ہم پر مہربانی فرمائیں اور یہ بات تیسری بار نہ دہرائیے گا کیونکہ اگر آپ نے تیسری بار یقین دہانی کرا دی تو تمام سرمایہ کار مشرق بعید سے اپنا سارا سرمایہ سمیٹ لیں گے“۔

آپ سیاسی تاریخ کو بھی دیکھئے‘ 1999ء میں میاں نواز شریف کی حکومت تھی‘ میاں صاحب کو تاریخ کا سب سے ہیوی مینڈیٹ حاصل تھا لیکن پھر اچانک میاں صاحب نے بڑے تواتر سے اس قسم کے بیان دینا شروع کر دیئے میری کرسی مضبوط ہے‘ مجھے گھر بھجوانے والے خود گھر چلے گئے اور نواز شریف کو کوئی نہیں ہلا سکتا‘ وغیرہ وغیرہ۔ میاں صاحب کے ان بیانات سے اس وقت کے سمجھ دار لوگوں نے فوراً اندازا لگا لیا نواز شریف حکومت بس آج کل کی مہمان ہے‘ انہی دنوں کی بات ہے ایک سفارتی تقریب میں ایک سفارت کار نے مجھ سے حکومتی تبدیلی کے بارے میں پوچھا تو میں نے حیرت کا اظہار کیا‘ جس پر سفارت کار نے مسکرا کر نواز شریف کے بیانات کا حوالہ دیا اور آخر میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ”جو حکومتیں مضبوط ہوتی ہیں وہ اپنی مضبوطی کا اعلان نہیں کیا کرتیں‘ تم مجھ سے لکھوا لو نواز شریف چند دنوں کے مہمان ہیں“ میں نے اس وقت سفارت کار کی وہ بات قہقہے میں اڑا دی لیکن میں ٹھیک پندرہ دن بعد اسی سفارت کار کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ مجھے ”ہم نہیں کہتے تھے یہ ہو کر رہے گا“ جیسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح مجھے اچھی طرح یاد ہے صدر پرویز مشرف نے جب اقتدار سنبھالا تھا

توانہوں نے اپنے لئے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ منتخب کیا تھااوران دنوں جنرل صاحب کے ترجمان میجر جنرل راشد قریشی نے بار باراس قسم کے بیان دینا شروع کر دیئے تھے کہ حکومتی سیٹ اپ تبدیل نہیں ہو گا' جنرل مشرف صدر نہیں بنیں گے اور سیاسی شخصیات حکومت میں شامل نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ' جنرل راشد قریشی کے ان بیانات سے لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا جنرل پرویز مشرف صدر رفیق تارڑ کو ہٹا کر خود صدر بننے والے ہیں اور وہ سیاستدانوں کو ساتھ ملا کر نئی پارٹی بھی بنائیں گے' انہی دنوں میاں اظہر نے لاہور میں ایک افطار پارٹی دی تھی' میاں اظہر کی افطار پارٹی نے بھی سمجھ دار لوگوں کے کان کھڑے کر دیئے کیونکہ اس پارٹی کو کامیاب کرنے کیلئے حکومت نے اپنے سارے وسائل استعمال کر دیئے تھے' سرکاری دفتروں سے سرکاری ٹیلی فونوں کے ذریعے معطل شدہ ارکان اسمبلی کو میاں اظہر کی پارٹی میں شریک ہونے کے احکامات دیئے گئے اور جن لوگوں نے اس پارٹی میں شرکت سے پہلو تہی کی تھی' انہیں باقاعدہ لاہور ''پہنچایا'' گیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میاں اظہر کی افطار پارٹی کی خبریں باہر نکلی تھیں تو حکومت نے اس تواتر اور بے قراری سے اس کی تردید کی تھی کہ لوگ سمجھ گئے اس افطار پارٹی سے کوئی نہ کوئی نئی مسلم لیگ جنم لے گی اور یہی مسلم لیگ آنے والے دنوں کی حکمران جماعت ہو گی اور ہوا بھی ایسے ہی کیونکہ اس افطار پارٹی کے بعد پاکستان مسلم لیگ ق کی فارمیشن شروع ہو گئی تھی' گو بعدازاں میاں اظہر کا پتہ کٹ گیا لیکن مسلم لیگ ق بنی اور اس نے 2008ء کے شروع تک اقتدار کے مزے لوٹے۔

بات دہرانے کا یہ سلسلہ اب ایک بار پھر شروع ہو گیا ہے' پچھلے کچھ عرصے سے ایک طرف پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن عوام کو بڑے تواتر سے یہ یقین دہانی کرا رہی ہے کہ ''حکومتی اتحاد نہیں ٹوٹے گا اور دوسری طرف حکومتی اتحاد کی طرف سے بار بار یہ بیان بھی آ رہے ہیں کہ اسمبلیاں نہیں ٹوٹ رہیں اور حکومت پانچ سال پورے کرے گی۔ جمعہ کے روز وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے امریکہ روانہ ہونے سے قبل بھی یہ بیان دیا تھا کہ ''کسی میں اسمبلی توڑنے کی جرات نہیں'' حکمران جماعتیں اتنی شدت اور بے قراری سے اس قسم کے بیان دے رہی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے یہ کولیشن بھی ٹوٹنے والی ہے اور اسمبلیوں کا مقدر بھی ریڈ زون میں داخل ہو چکا ہے کیونکہ اگر کولیشن کو کوئی خطرہ نہیں تو دونوں جماعتوں کو بار بار اس قسم کے بیان دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر اسمبلیوں کو کوئی خطرہ نہیں تو وزیراعظم کو اس کی یقین دہانی کی کیا ضرورت ہے چنانچہ میں جب بھی ایک ہی قسم کے بیان بار بار پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے دال میں کچھ نہ کچھ کالا موجود ہے۔ مستقبل قریب میں کوئی ایسا واقعہ ہونے والا ہے جس سے یہ سارا دستر خوان لپٹ جائے گا' کمہاروں کی ایک کہاوت ہے جہاں گدھے ہوں وہاں دھول ضرور اڑتی ہے جبکہ حلوائی کہتے ہیں شیرے پر مکھیاں ضرور آتی ہیں' ہم اگر ان دونوں کہاوتوں کو ذرا سی ماڈرن شکل دے لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں جب بھی کوئی سیاسی واقعہ ہونے لگتا ہے تو اس سے قبل ''نہیں ہو گا' نہیں ہو گا'' قسم کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور انہی آوازوں کے دوران وہ سیاسی واقعہ ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے کولیشن اور حکومت اس مقام تک پہنچ چکی ہے' چولہے سے دھواں اٹھ رہا ہے بس شعلے اٹھنے باقی ہیں۔

ہماری باتیں جاری تھیں' فون بھی آ رہے تھے اور سیکرٹری صاحب فائلوں پر دستخط بھی کر رہے تھے' اس افراتفری کے دوران اذان کی آواز گونجی' ہم سب خاموش ہو گئے' اذان ختم ہوئی تو سیکرٹری صاحب نے کافی کا لمبا سا گھونٹ بھرا' جوتے اور موزے اتارے' شرٹ کے کف اوپر چڑھائے اور ہماری طرف دیکھ کر بولے "آپ لوگ گپ لگائیں میں وضو کر کے آتا ہوں" ہم دونوں نے بھی آخری گھونٹ لئے اور عرض کیا "ہم بھی وضو کرنا چاہتے ہیں" ہم تینوں باری باری سیکرٹری کے غسل خانے میں گئے' وضو کیا اور نماز کیلئے باہر آ گئے۔

سیکرٹری صاحب کے دفتر کے سامنے صفیں بچھی تھیں' ہم آخری صف میں نمازیوں کے جوتوں کے پاس بیٹھ گئے' امامت کی جگہ پر سیکرٹری کا بار لیش چپڑاسی بیٹھا تھا' پہلی صف میں دوسرے چپڑاسی' ڈرائیور' بیرے' کلرک اور ڈی آر بیٹھے تھے' دوسری اور تیسری صف میں جونیئر اور سینئر آفیسر تھے جبکہ چوتھی صف میں ہم تینوں بیٹھے تھے' سیکرٹری کے دائیں بازو پر ایک مفلوک الحال بوڑھا بیٹھا تھا اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے اور اس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی' تکبیر کی آواز آئی اور ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' ہمارا اور سیکرٹری صاحب کا امام دوسرے گریڈ کا ایک چپڑاسی تھا جبکہ تین' چار' پانچ اور گیارہ گریڈ کے بیسیوں کلرک' بیرے' ڈرائیور اور نائب قاصد ہمارے آگے کھڑے تھے' اس وقت ہم سب ایک تھے' ایک سے محتاج' ایک سے منگتے اور ایک سے مجبور۔ سب خالی دامن' خالی جھولی اور پر امید' بارگاہ ایزدی میں سر جھکائے کھڑے تھے' دنیا و مافیہا سے بے نیاز' اس کی رحمت' اس کے کرم اور اس کی عنایات پر چشم تصور گاڑھے کھڑے تھے' سیکرٹری صاحب کی گردن بھی جھکی ہوئی تھی' ایڈیشنل سیکرٹری' جوائنٹ سیکرٹریوں' ڈپٹی سیکرٹریوں' اسسٹنٹ سیکرٹریوں اور سیکشن افسروں کا سینہ بھی اندر کو دبا اور گردنیں نیچے گری ہوئی تھیں' چپڑاسی اور صاحب' سیکرٹری اور وہ مفلوک الحال بوڑھا جس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے اور جس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی ہم سب ایک دکھائی دیتے تھے' بڑے اور چھوٹے' امیر اور غریب' محتاج اور غنی کی تفریق ختم ہو چکی تھی' گورے اور کالے' رنگ و نسل اور فرقہ اور گروہ سے بالاتر ہو کر ہم رب کے حضور اپنی اپنی جبینیں خم کئے ہوئے تھے' نماز ہوتی رہی' ہم سب اللہ اکبر کی آواز پر ہاتھ باندھتے اور کھولتے رہے' رکوع سے سجدے اور سجدے سے واپس قیام میں آتے رہے' اس دوران کسی صاحب نے ایک لمحے کیلئے نہ سوچا وہ یہ سب کچھ کس کی امامت میں کر رہے ہیں' ان کا چپڑاسی انہیں جھکنے' زمین پر ماتھا ٹیکنے اور دوبارہ کھڑا ہو جانے کا حکم دے رہا ہے اور وہ اس کی ہر آواز پر عملدرآمد کر رہے ہیں اور پھر سلام پھیرنے کا وقت آ گیا اور جونہی دوسری بار السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی آواز آئی' مقتدیوں نے بائیں جانب سر پھیرا اور سارا مجمع اس ڈسپلن سے آزاد ہو گیا' ہم اس اتحاد' اس اتفاق اور اس مساوات کو مسجد میں چھوڑ کر باہر آ گئے امام چند سیکنڈ میں چپڑاسی بن گیا' کلرک' کلرک' ڈی آر' ڈی آر' ڈرائیور' ڈرائیور' ایڈیشنل' ایڈیشنل' جوائنٹ' جوائنٹ' ڈپٹی' ڈپٹی' اسسٹنٹ سیکرٹری اسسٹنٹ سیکرٹری' سیکشن آفیسر' سیکشن آفیسر اور ہیڈ کلرک ہیڈ کلرک ہو گیا' عہدوں اور گریڈوں کی گری ہوئی دیواریں یک لخت پورے قد کے ساتھ کھڑی ہو گئیں' بجھی ہوئی' مری ہوئی تقسیم دوبارہ زندہ ہو گئی' محتاج' محتاج اور غنی' غنی ہو گیا' غلام' غلام اور صاحب' صاحب ہو گیا' گورا گورا اور کالا کالا ہو گیا' چوہدری چوہدری' وڈیرہ وڈیرہ اور جاگیردار جاگیردار ہو گیا' ہم سب اپنی اپنی دنیا میں لوٹ آئے' سیکرٹری صاحب نے میرے کان میں سرگوشی کی "ہم باقی نماز اندر کمرے میں پڑھیں گے" ہم لوگوں نے جوتے پہنے اور واپس 22 ویں گریڈ میں آ گئے' ٹھیک آدھ گھنٹے بعد سیکرٹری صاحب نے گھنٹی بجائی اور چند لمحے پہلے جو شخص ہمارا امام تھا وہ ہماری میز سے کپ اور پرچیں اٹھا رہا تھا' وہ پی اے جو ہم سے دو صفیں آگے کھڑا تھا وہ صاحب سے ڈانٹ کھا رہا تھا اور اذان دینے والا ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا تھا' رہا وہ مفلوک الحال بوڑھا جس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے اور جس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی وہ ہاتھ میں درخواست پکڑے باہر سڑک پر کھڑا تھا اور آتے جاتے ہر شخص کے چہرے پر نوکری تلاش کر رہا تھا' صرف چند لمحوں میں اتنی بڑی تبدیلی؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا' میرا دماغ اس تبدیلی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔

ہم باہر نکلے تو میں نے اپنے دوست سے کہا "یار اللہ تعالیٰ ہر روز پانچ بار ہمیں یاد دلاتا ہے تم سب ایک ہو' تم ایک جسم' ایک مٹی' ایک روح اور ایک جیسے گوشت پوست کے انسان ہو' تم رب کے سامنے اس کا اظہار بھی کرتے ہو' سر جھکا کر تسلیم بھی کرتے ہو' تم یہ بھی مانتے ہو چپڑاسی اور سیکرٹری میں وہ افضل ہے جس کے اعمال اچھے ہیں' اللہ

کی بارگاہ میں وہ زیادہ معتبر' وہ زیادہ بلند ہے جس کی جبین پر زیادہ سجدے' جس کی گردن میں زیادہ عاجزی اور جس کے دامن میں زیادہ نیکیاں ہیں' ہم دن میں پانچ بار چپڑاسیوں' کلرکوں اور ڈرائیورں کے ساتھ اس اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر دو چار سجدوں تک اللہ تعالیٰ کے اس نظام' اس ڈسپلن اور اس حکم کو مانتے بھی ہیں لیکن جونہی نیت کی مدت ختم ہوتی ہے اور ہمیں آنکھیں گھمانے' چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی آزادی ملتی ہے تو ہم فوراً اللہ کا یہ حکم فراموش کر دیتے ہیں' ہم صاحبوں اور محتاجوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہم افسروں اور ماتحتوں میں بٹ جاتے ہیں' دنیا میں اس سے بڑی فکری اور عملی منافقت کیا ہو گی' ہم دن میں پانچ بار مساوات کا عہد کریں' اللہ تعالیٰ کو مساوات کی پریکٹس بھی کر کے دکھائیں لیکن سلام پھیرتے ہی ہماری گردنوں کا سریا واپس آجائے' ہم اس عہد سے پھر جائیں" میرے دوست نے ہاں میں گردن ہلادی' میں نے عرض کیا' میں سمجھتا ہوں جو قوم دن میں پانچ بار اللہ سے وعدہ کرتی ہو اور پھر پانچ بار ہی یہ وعدہ توڑ دیتی ہو وہ قوم اللہ کی زمین پر ذلیل و خوار نہیں ہو گی تو کیا ہو گی؟ اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنے باس کی بات نہ مانتے تو وہ چند لمحوں میں اسے اپنی کمپنی' اسے اپنے ادارے اور اپنے کارخانے سے چلتا کر دے لیکن وہ رب جس کے قبضے میں ہماری جان ہے ہم دن میں پانچ بار اس کے حکم کی نفی کرتے ہیں' ہم پانچ بار اس کی حکم عدولی کرتے ہیں' کیا وہ رب اس نافرمانی پر ہم سے ناراض نہیں ہو گا' کیا وہ ہمیں معاف کر دے گا؟ ذرا سوچو بنی اسرائیل نے ایک وعدہ توڑا تھا انہیں اللہ کی زمین پر آج تک پناہ نہیں ملی اور ہم روز پانچ بار (نعوذ باللہ) اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں' ہم اس سے عہد شکنی کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس سے یہ توقع کرتے ہیں ہمارے لئے آسمان سے فرشتے اتریں گے اور ہم پورے کرہ ارض پر غالب آجائیں گے' اس سے بڑی بے وقوفی کیا ہو گی؟"۔

حکم دیں' احتجاج نہ کریں

ایک صحافی قید خانے میں نپولین بوناپارٹ سے ملنے گیا' چوتھائی دنیا کا مالک اس وقت ایک سیلن زدہ کوٹھڑی میں مقید تھا' صحافی نے پوچھا "آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟" نپولین نے مسکرا کر چھت کی طرف اشارہ کیا' صحافی نے اوپر دیکھا' چھت سے جالے لٹک رہے تھے' شکست خوردہ بادشاہ نے دیواروں کی طرف اشارہ کیا' صحافی نے دیواروں پر نظر دوڑائی ان کا پلستر اکھڑ چکا تھا اور اینٹیں نمی سے بھر بھری مٹی بن چکی تھیں' نپولین نے آخر میں فرش پر ہاتھ پھیرا' صحافی نے گھبرا کر نیچے دیکھا' ٹائلیں غائب تھیں' فرش ناہموار تھا اور پلنگ کے پائے آدھ آدھ فٹ تک زمین میں دھنس چکے تھے' صحافی کوٹھڑی کے مشاہدے سے فارغ ہو چکا تو نپولین نے شگفتہ لہجے میں پوچھا "تم خود بتاؤ کیا یہ جگہ بادشاہوں کی رہائش کے قابل ہے" صحافی نے تاسف سے گردن ہلا کر جواب دیا" نہیں ایکسی لینسی ہر گز نہیں.......... لیکن آپ اس سلوک پر احتجاج کیوں نہیں کرتے؟" نپولین نے قہقہہ لگایا اور نوجوان صحافی کا بازو تھپتھپا کر کہا "بادشاہ حکم دیا کرتے ہیں اور حکم نہ دے سکیں تو خاموش رہا کرتے ہیں' احتجاج نہیں کیا کرتے"۔

میں نے یہ واقعہ کسی مغربی مؤرخ کی کتاب میں پڑھا تھا' شاید اس واقعے ہی میں اتنی جان تھی کہ لکھنے والا قید خانے کے دیو ہیکل دروازے پر پہنچ کر یہ بھول گیا کہ وہ ایک ٹھنڈا ٹھار مؤرخ ہے شاعر نہیں لہٰذا اس نے دروازے کے قبضوں کی مکروہ آواز سے لے کر کوٹھڑی کی بدبودار نمی اور نپولین کے کمزور پلنگ کی چی چی سے لے کر چھت سے لٹکے جالوں کی سرسراہٹ تک ہر لمحے' ہر زاویے کی اتنی خوبصورت تصویر کشی کی کہ پڑھنے والے چند ساعتوں کیلئے کتاب سے نکل کر نپولین کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے چہرے کی شگفتگی' اس کے لہجے کا اٹل پن اور اس کی باتوں میں چھپی ذہانت کو محسوس کرنے لگتے ہیں' شاید رائٹر کی اسی گرفت' روانی اور جزئیات نگاری کا کمال تھا کہ میں کتاب کا نام' مصنف کا نام اور موضوع تو بھول گیا لیکن گہرے تاثر میں بھیگے اس کے دو تین صفحات میرے حافظے سے اس طرح چپک گئے جس طرح چبائی ہوئی چیونگم بالوں سے چمٹ جاتی ہے اور آنے والے دنوں میں جب مجھے بادشاہوں' حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے چند مزید تذکرے پڑھنے کا موقع ملا اور قوموں کے عروج و زوال کی کہانیاں نظروں سے گزریں تو معلوم ہوا نپولین کے فلسفے میں حقیقتاً بڑی جان تھی اور حکمران واقعی صرف اسی وقت احتجاج کیا کرتے ہیں جب اپنی کمزوری اور اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں ورنہ ہر پر امید حکمران (خواہ وہ معزول ہی کیوں نہ ہو) آخری وقت تک حکومت کرتا رہتا ہے یا اپنے اعصاب' اپنے جسم کی سلطنت کا بادشاہ رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے حکومت کی لغت میں احتجاج اعتراف شکست کا دوسرا نام ہوتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم وہ کیا عوامل ہیں یا وہ کون سی وجوہات ہیں جن کے باعث پچھلے ساڑھے تین ماہ سے حکومت کی صفوں سے تواتر سے ایسے بیانات اور اعلانات آ رہے ہیں جن میں ایک طرف تو مضبوط جمہوری حکومت کے اٹل پن کی جھلک نظر نہیں آتی اور دوسری طرف حکم کی جگہ احتجاج اور امید کی جگہ ایک غیر شعوری اعتراف شکست نظر آتا ہے' آپ پچھلے چند دنوں کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں آپ کو جگہ جگہ اس قسم کے فقرے نظر آئیں گے' اس نظام نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں' ہم ایک چیز ٹھیک کرتے ہیں تو دوسری خراب ہو جاتی ہے' ہم لوگوں کو ریلیف دینا چاہتے ہیں لیکن رکاوٹیں بہت ہیں' مجبوریاں بہت آڑے آتی ہیں' ہم لوگوں کے حالات دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں' ہمیں افسوس ہے ہم اپنے عوام کو امن' انصاف اور تحفظ نہیں دے پا رہے' ہماری نیت نیک ہے لیکن یہ نظام ہمیں آگے نہیں بڑھنے دے رہا وغیرہ وغیرہ' آپ جوں جوں یہ بیانات پڑھتے جائیں گے آپ کو محسوس ہو گا ایک ایسی حکومت جسے عوام نے 18 فروری کو ایک شاندار مینڈیٹ دیا' جسے آئین نے اتنی طاقت سے نوازا کہ صدر پرویز مشرف' مسلم لیگ ق اور شوکت عزیز اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے' جسے وقت اور حالات نے اتنی قوت دی کہ پورے ملک میں کوئی ایک بھی ایسا لیڈر نہیں بچا جو اس کے سامنے کھڑا ہو سکے' کسی اپوزیشن لیڈر کو اتنی سٹریٹ پاور حاصل نہیں کہ وہ حکومت کیلئے پریشانی کا باعث بن سکے لیکن وہی حکومت اس نظام کے سامنے اتنی بے بس' لاچار اور کمزور ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تو آتے ہیں' اس کا دل تو روتا ہے لیکن وہ لوگوں کو ریلیف نہیں دے سکتی' انہیں امن' انصاف' روزگار اور تحفظ فراہم نہیں کر سکتی' کون یقین کرے گا اس بات پر' حکومت کے اس دعوے پر کون ایمان لائے گا؟

درست ہے یہ نظام پتھروں سے بھرا راستہ ہے جس پر کوئی بھی شخص اپنی چال کی روانی برقرار نہیں رکھ سکتا' یہ بدبودار پانی کا ایک ایسا جوہڑ ہے جو لوگوں کو آکسیجن نہیں بیماریاں دیتا ہے' یہ ایک ایسی دلدل ہے جو آگے بڑھنے

والے ہر قدم کو نیچے کھینچتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر اس نظام کو آصف علی زرداری اور نواز شریف نہیں ٹھیک کر سکتا تو کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ اگر کولیشن کی اتنی طاقت ' اتنا بڑا مینڈیٹ ' اتنی بڑی آئینی اور پارلیمانی قوت اس کے سامنے بے بس ہو چکی ہے تو پھر اس کے بعد تو آسمان سے فرشتوں کے نزول کا انتظار ہی کیا جا سکتا ہے ' ذرا سوچئے کیا پوری دنیا میں اس حکومت کی کوئی اپوزیشن تھی ؟ دنیا کے تمام ممالک نے کولیشن کا خیر مقدم کیا تھا ' 9 مارچ کو بھوربن میں اعلان مری ہوا تو پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں اور دونوں سیاسی جماعتوں کا گراف آسمان کو چھونے لگا تھا لیکن پھر کیا ہوا ؟ حکومت ججز کی بحالی جتنا معمولی اور آسان کام بھی نہیں کر سکی اور اس کے بعد حکومت کی طاقت ریت کی طرح اڑتی ہوئی دکھائی دی اور آج لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں جو حکومت ججز کو بحال نہیں کر سکی وہ دوسرے اور مشکل کام کیسے کرے گی ' وہ مہنگائی ' بے روزگاری اور امن و امان کا مسئلہ کیسے حل کرے گی ؟ اور بدقسمتی سے حکومت کے کسی عہدیدار کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا ؟ حکومت کی حالت تو یہ ہے چند دن پہلے حکومت نے قدرتی گیس کی قیمت میں اضافہ کر دیا جس کے نتیجے میں سی این جی کی قیمت میں فی کلو 13 روپے اضافہ ہو گیا دو دن تک عوام نئے نرخ پر گیس خریدتے رہے ' ان دو دنوں میں عوام کا 20 کروڑ روپے نقصان ہوا لیکن پھر حکومت کی طرف سے وضاحت آ گئی اضافہ 13 روپے نہیں بلکہ ساڑھے پانچ روپے تھا اور غلطی سے 13 روپے اناؤنس ہو گیا ؟ کیا اس فراڈ کو غلطی کہا جا سکتا ہے ؟ کیا یہ حکومت ہوتی ہے اور کیا اس حکومت کو حکومت کہنا چاہیے ؟۔

جناب عالی ! حکومت حکم دینے کی طاقت کا نام ہے اور جس حکومت کی حکم دینے کی طاقت سلب ہو جائے اس کے پاس بے چارگی ' بے بسی اور افسوس باقی رہ جاتے ہیں اور ' اور جناب عالی مضبوط ' اٹل اور پر امید "بادشاہ" کی زبان پر حکم سجتا ہے احتجاج نہیں چنانچہ میری حکومت سے درخواست ہے وہ حکم دے ' احتجاج نہ کرے ' لوگوں کو آپ کے آنسو اور نیک نیتی نہیں چاہئے ' فیصلے چاہئیں ' امن ' انصاف اور روزگار چاہیے اور آپ کے پاس سب کچھ ہے لیکن حکم کرنے اور اس پر عملدر آمد کرانے کی طاقت نہیں۔

البرٹ سپئیر کا شمار ہٹلر کے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا' وہ بنیادی طور پر آرکیٹکٹ تھا' ہٹلر بھی فن تعمیر میں گہری دلچسپی رکھتا تھا لہٰذا دونوں میں اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ہٹلر ان ملاقاتوں کے دوران البرٹ سپئیر کے ٹیلنٹ سے متاثر ہو گیا اور جب وہ جرمنی کا سربراہ تھا تو اس نے ہتھیار سازی کی وزارت سپئیر کے حوالے کر دی' دوسری جنگ عظیم کے بعد سپئیر سیاست سے تائب ہو گیا اور اس نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ ساٹھ کی دہائی میں اس نے ہٹلر کی زندگی' اس کے سٹائل اور اس کی فلاسفی پر ایک ایسی کتاب لکھی جس کی گونج آج تک تاریخ اور ادب کی وادی میں سنائی دیتی ہے۔ البرٹ سپئیر نے اپنی کتاب میں ہٹلر کی زندگی کے بے شمار واقعات لکھے لیکن ان واقعات میں سے ایک واقعہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا' سپئیر نے لکھا تھا' وہ ایک دن ہٹلر کے دفتر میں داخل ہوا تو اس نے ہٹلر کو خلاف معمول ہشاش بشاش پایا' وہ نصف گھنٹے تک اس کے ساتھ گپ لڑاتا رہا' جب وہ واپسی کیلئے اٹھا تو ہٹلر نے اس سے پوچھا "تم نے میرے دفتر میں کوئی نئی چیز دیکھی؟" سپئیر نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا تو اسے وہاں کوئی غیر معمولی تبدیلی دکھائی نہ دی' ہٹلر نے سپئیر کو یوں پریشان دیکھا تو وہ ریوالونگ چیئر پر جھول کر بولا "تم دیکھو' آج میرے کمرے میں فائل نام کی کوئی چیز نہیں" سپئیر نے دیکھا واقعی ہٹلر کی میز بالکل صاف تھی' ہٹلر نے صاف شفاف ٹیبل پر ہاتھ پھیر کر انکشاف کیا "میں کام چور' حیلہ ساز اور مکار بیوروکریسی کو مات دے چکا ہوں' اب جرمنی میں کوئی سرکاری افسر ہیرا پھیری کرے گا اور نہ ہی کسی سائل کو کسی دفتر سے کوئی شکایت ہو گی"۔

البرٹ سپئیر کیلئے یہ انکشاف حیران کن تھا لہٰذا اس نے اس کی تفصیل جاننے کی خواہش کی' ہٹلر نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "جب میں نے عنان اقتدار سنبھالی تو ساری وزارتوں نے میرے آفس میں فائلوں کی بھرمار کر دی' میں صبح اٹھ کر فائلیں پڑھنا شروع کرتا تھا تو رات گئے تک بمشکل ایک چوتھائی کام مکمل ہوتا تھا' اگلے روز میرا سٹاف آتا تو وہ جتنی فائلیں سمیٹتا اس سے دُگنی میز پر رکھ دیتا تھا' ایک روز جب میں دستخط کر کر کے تھک گیا تو میں نے سوچا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے تب مجھے محسوس ہوا یہ میرے خلاف بیوروکریسی کی سازش ہے' یہ لوگ مجھے دستخطوں اور فائلوں میں الجھا کر میرے اصل مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں' بس یہ خیال آنا تھا' میں نے ساری فائلیں فرش پر پھینکیں اور حکم جاری کیا آئندہ کوئی فائل مجھ تک نہیں پہنچنی چاہیے' تمام متعلقہ حکام ان پر خود ہی فیصلے صادر کریں لیکن یہ واضح رہے جس نے حکم جاری کرتے ہوئے کسی قسم کی بدنیتی کا مظاہرہ کیا میں اسے گولی سے اڑا دوں گا' بس وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کوئی فائل میرے دفتر آئی اور نہ ہی کہیں سے بدنظمی اور تاخیر کی کوئی شکایت موصول ہوئی"۔

ہم جدید دور کے آزاد لوگ ہٹلر کو لاکھ برا سمجھیں' اسے فاشسٹ' آمر' ظالم اور ننگ انسانیت قرار دیں لیکن یہ طے شدہ حقیقت ہے جو سچائی ہٹلر نے ساٹھ' ستر برس پہلے بھانپ لی تھی اس تک ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر پرویز مشرف اور میاں نواز شریف سے یوسف رضا گیلانی تک پاکستان کا کوئی حکمران نہیں پہنچ سکا' ہمارے ملک کے سیاسی افق پر بڑے بڑے ذہین لوگ ابھرے' بڑے بڑے انقلابی ایجنڈے لے کر آئے اور بڑے بڑے منصوبوں کی بڑی بڑی گٹھڑیاں سروں پر لاد کر پارلیمنٹ میں داخل ہوئے لیکن انہیں' ان کے انقلابی ایجنڈوں اور ان کے منصوبوں کو فائلوں کے قبرستان میں دفن ہوتے دیر نہ لگی' ذوالفقار علی بھٹو ہو یا جنرل ضیاء الحق' جونیجو ہو یا بے نظیر' نواز شریف ہو یا پرویز مشرف' میر ظفر اللہ جمالی ہوں یا شوکت عزیز یہ لوگ بیوروکریسی کے سوئمنگ پول میں اترے تو پھر انہیں سطح آب پر ابھرنا نصیب نہ ہوا اور وہ میٹنگ' کمیشن' بریفنگ' رول' رپورٹ کمنٹس اور فائل کے غوطے کھا کھا کر ہی فنا ہو گئے۔ میں نے اپنی ان گنہگار آنکھوں سے فائلوں سے بھرے چھ' چھ صندوق وزیر اعظموں کے ساتھ لاہور اور کراچی جاتے پھر وہاں سے بے نیل و مرام واپس آتے دیکھے' میں نے بے نظیر کو رات رات بھر فائلوں سے آنکھیں پھوڑتے اور سیکشن افسروں کے اف اینڈ بٹ ٹھیک کرتے دیکھا' میں نے اپنے ان گنہگار کانوں سے سینئر بیوروکریٹس کو کہتے سنا' دستخط کر کر کے محمد خان جونیجو کی کلائی میں موچ آ جاتی تھی' کمیشنوں کی رپورٹیں پڑھتے پڑھتے جنرل ضیاء الحق کے کندھے جھک گئے تھے اور مسلسل کرسی اور میز پر بیٹھے رہنے کے باعث بھٹو صاحب کے مہروں میں درد شروع ہو گیا تھا لیکن اس نظام کی دیوار وہیں کھڑی رہی اور سسٹم کا بیل اسی طرح ایک ہی دائرے میں گھومتا رہا' سفر بہت کیا' پاؤں میں چھالے پڑ گئے' ہم سفر ایک ایک کر کے ہمت ہار گئے لیکن منزل اتنی ہی دور رہی جتنی آغاز سفر کے وقت تھی۔

میرا دعویٰ ہے اگر کبھی کسی نے پاکستانی نظام پر تحقیق کی' اگر کوئی بیوروکریسی کے اس جوہڑ میں اترا تو اسے اس میں

جا بجا ہیوی مینڈیٹ کی ہڈیاں ‘ نیم پختہ انقلابوں کے ڈھانچے ‘ ترقی ‘ خوشحالی اور عزت نفس کے کفن اور روٹی کپڑے اور مکان کی کرچیاں ملیں گی ‘ یہ ساری کرچیاں ‘ یہ سارے کفن ‘ یہ سارے ڈھانچے اور یہ ساری ہڈیاں ان ان پارٹیوں اور ان لیڈروں کی ہیں جو پوری طاقت کے ساتھ اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئے لیکن بعدازاں انہوں نے بیوروکریٹس کو اپنا پیغمبر اور فائلوں کو اپنا خدا مان لیا لہٰذا ان کی داستان بھی داستانوں کی راکھ میں مل کر بے نشان ہو گئی ‘ لوگ مر گئے اور قبریں پیچھے رہ گئیں ‘ ہمارے نئے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی بھی وہی غلطی دہرا رہے ہیں جو ان کے پیش رو دہراتے رہے تھے۔

ہمارے وزیراعظم بھی اعلانات پر اعلانات کئے جا رہے ہیں ‘ کبھی وہ فرماتے ہیں قوم کو ججز کی بحالی کی بہت جلد خوشخبری دیں گے ‘ مہنگائی پر قابو پائیں گے ‘ غریبوں کو امداد دی جائے گی ‘ ذخیرہ اندوزی ختم کی جائے گی ‘ سرمایہ کاروں کو تحفظ دیا جائے گا ‘ لوڈشیڈنگ پر جلد قابو پا لیا جائے گا ‘ کبھی اعلان کرتے ہیں تنخواہوں اور پنشن میں اضافہ کیا جائے گا ‘ صحت اور روزگار کے یکساں مواقع دیں گے لیکن سوال یہ ہے آخر کب دیں گے ؟ اگر حکومت کی پچھلے تین ماہ کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہو گا حکومت نے سوائے اعلانات کے کچھ نہیں کیا ‘ حکومت نے 100 دن کے ایجنڈے کا اعلان کیا تھا اور یہ ایجنڈا بھی فائلوں ‘ رپورٹوں ‘ کمیشن ‘ کمنٹس ‘ میٹنگز ‘ بریفنگز اور کانفرنسز تک محدود رہا۔ یقین کیجئے جس نظام میں اعلانات اور وعدے روزمرہ کا وتیرہ بن جائیں ‘ جس نظام میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پانچویں گریڈ کے کلرک کی میز سے چل کر انتہائی گریڈ کے چیف ایگزیکٹو کے دفتر پہنچ کر بھی ادھورا رہے اور جو کاغذ سے فائل بن کر بھی نامکمل ہو وہ سسٹم نہیں پھندہ ہے ‘ وہ نظام نہیں دھوکہ ہے ‘ وہ حقیقت نہیں فریب ہے اور فریب کی اس انڈسٹری ‘ دھوکے کے ان تاجروں اور پھندوں کے ان صنعتکاروں کا ایک ہی علاج ہے ‘ ہٹلر کا علاج ‘ اگر حکومت نے یہ علاج نہ کیا تو دستخط کرتے کرتے وزیراعظم کی کلائی میں بھی موچ آ جائے گی ‘ ان کے کندھے جھک جائیں گے اور ان کے مہروں میں درد ہونے لگے گا لیکن حالات کی دیوار آنے والے کل بھی اسی جگہ کھڑی رہے گی جس جگہ وہ گزرے کل کھڑی تھی۔

چیک افسانہ نویس فرانز کافکا کے ایک کردار پر قتل کا الزام لگ جاتا ہے' پولیس ملزم کو گرفتار کرنے آتی ہے تو وہ اہلکاروں کو کہتا ہے "حضور آپ میری عرض سنیں' میں ...."کانسٹیبل فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے "نہیں' تم کچھ نہیں کہہ سکتے تم ملزم ہو" تھانے پہنچ کر ملزم تھانیدار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے کی کوشش کرتا ہے' تھانیدار اسے گھور کر کہتا ہے "تم ملزم ہو' تم کچھ نہیں بول سکتے' اب تم نے جو کچھ کہنا ہے عدالت میں جاکر کہنا" کیس عدالت میں پہنچ جاتا ہے' پیشیاں شروع ہو جاتی ہیں' وکیل بحث کا آغاز کر دیتے ہیں' ہر سماعت پر ملزم جج سے بولنے کی اجازت طلب کرتا ہے لیکن جج اس کی طرف غصے سے دیکھتا ہے اور سرد لہجے میں حکم جاری کرتا ہے "تم تحریری طور پر اپنا بیان دے چکے ہو' اب تم صرف اپنے وکیل کو بولنے دو" ملزم اپنے وکیل سے عرض کرنے کیلئے منہ کھولتا ہے لیکن وکیل اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر پھنکارتا ہے "تم ملزم ہو تم کچھ نہیں بول سکتے" یوں کیس چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وکیلوں کی بحثیں ختم ہو جاتی ہیں' فیصلے کا دن آجاتا ہے اور جج حاضرین کو گواہ بنا کر ملزم کو موت کی سزا سنا دیتا ہے' ملزم فیصلہ سنتا ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک بار پھر عرض کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جج یہ کہہ کر عدالت برخاست کر دیتا ہے "عدالت اپنا فیصلہ سنا چکی ہے' اب تم نے جو کچھ کہنا ہے اپیل میں کہو" ملزم مجرم بن کر جیل چلا جاتا ہے وہاں وہ جیلر کے سامنے عرض کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جیلر بھی اس کی فائل بند کر کے کہتا ہے "اب تم مجرم ہو' تم کچھ نہیں کہہ سکتے" مجرم کو کال کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا ہے' وہاں بھی اس سے جو ملنے آتا ہے وہ اسے روک کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہر ملاقاتی اسے مجرم کہہ کر سننے سے انکار کر دیتا ہے' آخر میں جب اسے پھانسی گھاٹ لے جایا جاتا ہے تو وہ جلاد سے مخاطب ہونے کی سعی کرتا ہے لیکن جلاد بھی اس کی بات سننے سے انکار کر دیتا ہے' رسہ کھینچنے سے چند لمحے پہلے مجرم آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور پھر وہاں موجود عملے پر نظر ڈال کر کہتا ہے "کوئی ہے جس کے کانوں تک میری آواز پہنچ سکے جو میری بات سن سکے" سب خاموش رہتے ہیں' مجرم ٹھنڈا سانس بھرتا ہے اور پھر پھندے کو مخاطب کر کے کہتا ہے "یہ کیسے لوگ ہیں جو ملزم کی بات سنے بغیر اس کا فیصلہ کر دیتے ہیں" ابھی لفظ اس کے منہ ہی میں ہوتے ہیں کہ جیلر رومال لہراتا ہے اور جلاد تختہ کھینچ دیتا ہے۔

معلوم نہیں کافکا اس کہانی کے ذریعے اپنے قارئین کو کیا سمجھانا چاہتا تھا' اس کا یہ ملزم کس جذبے' کس طبقے کا نمائندہ تھا اور وہ کون سے طبقے اور کون سے جذبے تھے جو اس کی سنے بغیر اسے پھانسی چڑھا دیتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا اور ہمارے ملک کا تعلق ہے یہ کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے وہ ملزم اس ملک کے 16 کروڑ عوام ہیں اور اس کہانی کے کانسٹیبل' تھانیدار' وکیل' جج اور عدالتیں اس ملک کی وہ مقتدر طاقتیں ہیں جن کے ہاتھ میں ان ملزموں کی تقدیر ہے' یہ 16 کروڑ ملزم اس ملک کے ہر تھانیدار' ہر جج اور ہر عدالت سے درخواست کرتے ہیں" حضور آپ ہماری بھی عرض سن لیں" لیکن ہر عدالت' ہر جج اور ہر تھانیدار انہیں گھور کر چپ کرا دیتا ہے۔ ذرا سوچئے ایوب خان نے سکندر مرزا کو گرفتار کر کے راتوں رات جلاوطن کر دیا اور خود اس ملک کے بلاشرکت غیرے مالک بن گئے اور انہوں نے ایک لمحے کیلئے نہ سوچا کہ وہ اس ملک کے لوگوں سے یہ ہی پوچھ لیں کہ انہیں سکندر مرزا چاہیے یا ایوب خان۔ یحییٰ خان آئے' حکومت کی اور جاتے جاتے 7 کروڑ لوگ بھٹو کے حوالے کر گئے' ان 7 کروڑ ملزموں سے پوچھے بغیر کہ انہیں بھٹو چاہیے بھی یا نہیں۔ جنرل ضیاء تشریف لائے تو انہوں نے بھی ان "ملزموں" سے پوچھے بغیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی' پھر ان کا جی چاہا تو انہوں نے ملزمان سے بغیر پوچھے محمد خان جونیجو اور نواز شریف کو اس ملک کا جیلر مقرر کر دیا۔ صدر اسحاق خان آئے تو انہوں نے پہلے بے نظیر اور پھر نواز شریف کو "حکمران" بنانے کا فیصلہ کیا اور پھر عوام کو اعتماد میں لئے بغیر خود ہی انہیں چلتا کر دیا' درمیان میں کسی مقتدر طاقت کو معین قریشی پسند آگئے اور اس نے ان 16 کروڑ "ملزمان" کو اطلاع دیئے بغیر انہیں پلیٹ میں رکھ کر معین قریشی کے سامنے "سرو" کر دیا' کسی نے فیصلہ کیا اور بے نظیر ایک بار پھر پاکستان کی تقدیر بن گئیں' کسی نے فیصلہ کیا اور بے نظیر گھر واپس چلی گئیں' کسی نے نواز شریف کو ایک اور چانس دینے کا فیصلہ کیا اور نواز شریف کو ہیوی مینڈیٹ مل گیا' کسی کا جی چاہا اور نواز شریف اقتدار کے برج سے اٹر کر اٹک پہنچ گئے اور پھر کسی نے فیصلہ کیا اور نواز شریف کو خاندان سمیت عزت و آبرو کے ساتھ ملک سے باہر بھجوا دیا گیا اور اس کے بعد کسی تھانیدار کے دماغ میں خیال آیا اور محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف واپس آگئے' محترمہ شہید کر دی گئیں' 18 فروری کے الیکشن ہوئے' اتحادی حکومت بنی' مسلم لیگ ن وزارتوں سے الگ ہوئی اور آج نئے آپشنز پر گفتگو

شروع ہو چکی ہے‘ ہر آپشن زیر غور ہے‘ وزارت عظمٰی اور صدارت کیلئے نئے امیدوار ڈسکس ہو رہے ہیں اگر ڈسکس نہیں ہو رہے‘ اگر کسی کو غور کے قابل نہیں سمجھا جا رہا تو وہ اس ملک کے عوام ہیں‘ وہ کافکا کی کہانی کے ملزمان ہیں جنہیں مرنے تک عرض کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہماری بدقسمتی دیکھئے ہمارے سب فیصلے اوپر ہی اوپر ہو رہے ہیں اور کوئی ان ملزموں سے نہیں پوچھ رہا‘ کوئی ان سے نہیں پوچھ رہا انہیں کون سا لیڈر چاہیے اور انہیں کون سا نظام درکار ہے؟۔

یقین کیجئے ایک کوچوان‘ ایک ساربان اور ایک کمہار بھی کبھی کبھار اپنے گدھے‘ اپنے اونٹ اور اپنے گھوڑے سے پوچھ لیا کرتے ہیں کہ اسے کون سا چارہ چاہیے ”وہ پھک“ کھانا پسند کرے گا یا لوسن‘ وہ صحن میں بندھنا چاہے گا یا اندر باڑے میں اور اسے لکڑی کی کھرلی چاہیے یا سیمنٹ کی پکی ناند لیکن یہ لوگ جی ہاں یہ لوگ حکومتیں بناتے اور حکومتیں توڑتے وقت 16 کروڑ لوگوں پر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالتے اور اقتدار میں آنے کے بعد انہیں عوام کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا‘ انہیں اتنی زحمت نہیں ہوتی وہ عوام سے پوچھ لیں کہ انہیں کیا چاہئے۔ عوام فاقوں پر مجبور ہوں‘ غربت اور بے روزگاری کا شکار ہوں یا پٹڑیوں‘ چوکوں اور چوراہوں میں خودکشیاں کر رہے ہوں ان حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی‘ ان کے غیر ملکی دورے اور ان کی میٹنگز ہی ختم نہیں ہوتیں اور یہ ہر پندرھویں دن اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں یہ حکومت پٹرول کی قیمتوں میں پانچ بار اضافہ کر چکی ہے اور گزشتہ روز وزیراعظم نے چھٹی بار پٹرول کی قیمت میں 10 روپے 97 پیسے‘ ڈیزل کی قیمت میں 7 روپے 45 پیسے اور مٹی کے تیل میں 8 روپے 64 پیسے کا ریکارڈ اضافہ کر دیا‘ وزیراعظم نے اس اضافے کی سمری پر دستخط کرنے سے پہلے ایک لمحے کیلئے رک کر اتنا نہیں سوچا جو عوام بھوک سے مر رہے ہیں ان پر اس اضافے کے کیا اثرات پڑیں گے اور شاباش ان 16 کروڑ لوگوں کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری پر جو اس اضافے پر بھی چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ یہ حقیقت ہے ایک گھوڑا لگام کھینچنے‘ اونٹ ٹانگ باندھنے اور گدھا حد سے زیادہ بوجھ ڈالنے پر کبھی کبھار دولتی جھاڑ دیتا ہے‘ بلبلا اٹھتا ہے‘ ہنہنا لیتا ہے لیکن صدقے جاؤں ان 16 کروڑ شہزادوں پر کہ جس نے چاہا‘ جب چاہا اور جتنا چاہا ان پر بوجھ لاد دیا اور جس کے ہاتھ میں چاہی ان کی لگام تھما دی مگر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی احتجاج کیا‘ واہ بھائی واہ۔ میں جوں جوں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں‘ میں جوں جوں زندگی کی رو میں آگے بڑھتا جا رہا ہوں‘ میں جوں جوں اس ملک کے حالات دیکھتا ہوں‘ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ ملک اس وقت تک نشیب اور زوال کی طرف بڑھتا رہے گا جب تک اس ملک کے 16 کروڑ لوگ اپنے لئے ملزم کی بجائے منصف کا کردار پسند نہیں کریں گے‘ جب تک لوگوں کے مقدر کے فیصلے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئیں گے‘ جب تک عوام حکمرانوں کو اپنی بات نہیں سنائیں گے‘ جب تک لوگ احتساب نہیں کریں گے‘ جب تک لوگ حکمرانوں کو یہ نہیں بتائیں گے ”ہم انسان ہیں‘ جانور نہیں“۔

بارش اچانک تیز ہو گئی' میں نے بھاگ کر گاڑی تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن گلی میں ٹخنوں تک پانی تھا' میں نے سوچا اگر میں نے یہ کوشش ترک نہ کی تو میرا قیمتی سوٹ اور مہنگے بوٹوں کا ستیاناس ہو جائے گا' میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے دیکھا' سامنے ایک دکان کا برآمدہ تھا' میں بھاگ کر وہاں پناہ گزین ہو گیا' میرے بال' میرا چہرہ اور میرا کوٹ سب کچھ بھیگ چکا تھا' میں نے نیم گیلے رومال سے عینک صاف کی' پھر چہرہ صاف کیا اور آخر میں وہی رومال سر پر پھیر کر جیب میں رکھ لیا' اب ماحول کچھ کچھ واضح ہو گیا تھا' وہ ایک قدیم عمارت تھی جس کی ڈیوڑھی کو کسی ستم ظریف نے لوہے کا شٹر لگا کر دکان کی شکل دے دی تھی' اس روز شاید بارش کی وجہ سے دکان بند تھی یا پھر مندے کے باعث دکاندار اپنی دکان بڑھا گیا تھا' نیم تاریک برآمدے میں اس وقت دو انسان' ایک بھیگی چڑیا اور ایک خونخوار بلی پناہ گزین تھے' دوسرا انسان ایک تھکا ہارا' حالات کا مارا مزدور تھا اور وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر بارش تھمنے کا انتظار کر رہا تھا' رہی چڑیا اور بلی تو وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں' چڑیا بری طرح بھیگ چکی تھی' اس کے پر بھاری تھے' وہ اڑنے کی کوشش کرتی تھی لیکن پھدک کر رہ جاتی تھی اور بلی اسے مسلسل کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی' میں نے بلی کی "نشست و برخاست" سے اندازہ لگایا اگر وہ مزدور اور میں یہاں نہ ہوتے تو وہ اب تک چڑیا کو کھا پی چکی ہوتی' میں آگے بڑھا' میں نے کانپتی ہوئی چڑیا کو اٹھایا اور اسے اٹھا کر شٹر کے قریب طاق میں رکھ دیا' اب وہ بلی سے ذرا محفوظ فاصلے پر تھی' میں نے فاتحانہ نظروں سے مزدور کی طرف دیکھا' مزدور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میرے اس "جہاد" کی داد دی' میں منہ پھیر کر بارش کا نظارہ کرنے لگا' گلی میں پانی کی سطح بلند ہو رہی تھی' آسمان سے گرتے قطروں کا جلال بڑھ رہا تھا' مجھے منہ پھیرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ "دھپ" کی آواز آئی' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' چڑیا طاق سے گر چکی تھی اور بلی اپنی لمبی زبان سے اس کے پر چاٹ رہی تھی' میں نے منہ سے ہش ہش کی آواز نکالی' پاؤں سے بلی کو "دبکا" مارا' بلی نے مجھے غصے بھری نظروں سے گھورا اور چڑیا سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی' میں نے چڑیا کو اٹھا کر دوبارہ طاق میں رکھ دیا' مزدور نے سر ہلا کر میری نیکی کی داد دی۔

میں دوبارہ باہر دیکھنے لگا' میں نے سوچا وقت گزارنے کیلئے بارش کا کھیل شروع کر دیتا ہوں' میں اور میرے چھوٹے بھائی ہم بچپن میں بارش کے قطرے گننے کی کوشش کرتے تھے' یہ ایک تیز رفتار بلکہ خوفناک کھیل تھا لیکن ہم کھیلتے تھے اور انجوائے کرتے تھے' میں ابھی بارش کے قطرے گننے کی نیت ہی باندھ رہا تھا کہ ایک بار دھپ ہوئی' چڑیا نیچے گری اور بلی اٹھ کر چڑیا کی طرف لپکی' میں بھی فوراً مڑا اور بلی پر "ہش ہش" کی تلوار چلا دی' بلی سہم کر رک گئی' میں نے چڑیا کو اٹھا کر ایک بار پھر طاق میں رکھ دیا' دراصل وہ طاق چھوٹا تھا اور چڑیا کمزور' وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتی تھی تو لڑکھڑا کر گر جاتی تھی' نیچے بلی اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے کھڑی ہوتی تھی' مجھے اب ایک نیا شغل مل گیا' میں اسے اٹھا کر طاق میں رکھتا' وہ کپکپاتی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتی' وہ نیچے گرتی اور بلی اس کی طرف لپکتی لیکن میں عین موقع پر پہنچ کر اسے بچا لیتا' یہ کھیل بڑی دیر تک جاری رہا' شروع شروع میں مزدور اس میں دلچسپی لیتا رہا لیکن پھر وہ لاتعلق ہو کر اپنی "لوئی" کی بکل میں گم ہو گیا مگر میں کھیلتا رہا' کھیلتا رہا یہاں تک کہ بور ہو گیا' اب میں چڑیا کو اٹھانے کے بجائے بلی کو ڈرانے میں مصروف ہو گیا' وہ چڑیا کی طرف ایک قدم اٹھاتی' میں فرش پر ایڑی مار کر لمبی سی "شی" کرتا' وہ اسی قدم پر رک جاتی' وہ تھوڑی دیر تک مجھے گھورتی رہتی' جب اسے محسوس ہوتا میری توجہ ہٹ رہی ہے اور اب میں چور آنکھوں سے بارش کا جائزہ بھی لے رہا ہوں تو وہ ایک قدم اور اٹھا لیتی' میں چونک کر "شی" کرتا وہ سہم جاتی' یہ شی اور آگے بڑھنے کا سلسلہ چلتا رہا' جب مجھے محسوس ہوتا بلی چڑیا کے قریب پہنچ چکی ہے اور اب وہ کسی بھی وقت اس پر جھپٹ سکتی ہے تو میں آگے بڑھ کر چڑیا کو طاق میں رکھ دیتا' بلی واپس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی۔

یہ کھیل طول پکڑ گیا یہاں تک کہ میں بری طرح اکتا گیا اور میں نے چڑیا کو اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' میں نے طاق سے منہ موڑ لیا' بکل میں حرکت ہوئی' مزدور نے چادر سے منہ نکالا' کھنگورا مارا اور کانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا "کیا آپ واقعی چڑیا کو بچانا چاہتے ہیں یا پھر ٹائم پاس کر رہے ہیں" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' اس کی سرخ آنکھوں میں عجیب قسم کی تپش تھی' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا' مزدور نے بکل کے اندر سے رسی کا ایک ٹکڑا نکالا' میری طرف لہرایا اور آہستہ آواز میں بولا "پھر آپ چڑیا کو بار بار طاق میں رکھنے کی بجائے بلی کو باندھ دیں' چڑیا محفوظ ہو جائے گی' آپ یہاں رہیں یا نہ رہیں" مجھے اس کی تجویز میں وزن محسوس ہوا' میں

نے رسی پکڑی‘ اس کے سرے پر پھندا بنایا اور پھر آہستہ آہستہ بلی کی طرف بڑھنے لگا‘ بلی ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگی‘ مجھے معلوم تھا گلی میں فٹ فٹ پانی بھر چکا ہے اور بلی باہر نکلنے کا رسک نہیں لے گی لہٰذا اسے پکڑنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا دوسرا مزدور بھی بیٹھے بیٹھے منہ سے آوازیں نکال کر میری مدد کر رہا تھا‘ میں یونہی چلتے چلتے بلی کے سر پر پہنچ گیا‘ جب وہ پوری طرح میری رینج میں آ گئی تو میں نے جھپٹا مارا اور اسے قابو کر لیا‘ بلی میرے ہاتھوں میں کسمسائی لیکن میں نے اس کے گلے میں پھندہ ڈال کر تھوڑا سا کسا اور رسی کا دوسرا سرا دکان کے تالے میں اڑوس کر چھوڑ دیا‘ فارمولہ کامیاب ہو گیا‘ اب چڑیا کو طاق میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی‘ بلی اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی‘ بلی نے ایک آدھ کوشش کی لیکن جب اسے ہر کوشش کے بعد پھندہ کستا ہوا محسوس ہوا تو اس نے مزید کوشش ترک کر دی۔

بارش تھم گئی‘ میں نے جوتے اتارے‘ ہاتھ میں اٹھائے اور مزدور کا شکریہ ادا کیا اور گلی میں اتر گیا‘ اگلے موڑ پر میری گاڑی کھڑی تھی‘ میں نے مری روڈ پر ٹرن لیا‘ سامنے سگنل بند تھا‘ میں رک گیا‘ وہیں رکے رکے میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ”کیا اب چڑیا محفوظ ہے؟“ میرے دل نے گواہی دی ”ہاں جب تک بلی بندھی ہے اس وقت تک چڑیا کو کوئی خطرہ نہیں“ میں نے سوچا ”کیا بلی تمام زندگی بندھی رہے گی“ میرے دل نے جواب دیا ”نہیں‘ بلی کل تک کھل جائے گی“ میں نے سوچا ”پھر کل چڑیا کا کیا بنے گا“ میرے دل نے جواب دیا ”کل سے کہیں پہلے چڑیا کے پر سوکھ جائیں گے اور وہ بلی کھلنے سے پہلے اڑ جائے گی“ میں نے سوچا ”دنیا کی تمام چڑیوں کو بس اتنی سی مہلت درکار ہوتی ہے کہ کوئی ان کے حصے کی بلی باندھ دے اور اس دوران وہ اپنے پر سوکھا لیں اگر انہیں اس نازک وقت میں کوئی مددگار مل جائے تو ان کی زندگی بچ جاتی ہے بصورت دیگر وہ بلی کا نوالہ بن جاتی ہیں“ سگنل کھل گیا‘ میں ٹریفک کا حصہ بن گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ٹریفک میں بالکل گم ہو جاتا‘ میں نے اپنے آپ سے مزید پوچھا ”کہیں اس ملک کا مسئلہ بھی یہی تو نہیں‘ ہم بلیاں باندھنے کی بجائے چڑیاں طاق میں رکھتے رہتے ہیں اور ہم اس مشقت کے دوران خود بھی تھک جاتے ہیں اور چڑیاں بھی مر جاتی ہیں“ میں نے سوچا کاش میں یہ کہانی آصف علی زرداری کو سنا سکتا اور ان سے عرض کر سکتا وہ خواہشوں کی چڑیوں کو طاق میں رکھنے کی بجائے مسائل کی بلیاں باندھ دیں‘ یہ ملک بھی ترقی کی شاہراہ پر آ جائے گا اور ان کی حکومت بھی خطروں سے باہر نکل جائے گی۔

ان کے پاس وقت نہیں

1990ء میں ایک انٹرنیشنل ٹیلی ویژن نیٹ ورک سے عراق کے بارے میں ایک رپورٹ ٹیلی کاسٹ ہوئی تھی' یہ رپورٹ بنیادی طور پر ماحولیاتی آلودگی سے متعلق تھی' رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا عراق کے ساحلوں پر بے تحاشا گندا تیل جمع ہو رہا ہے جس سے پوری دنیا کی سمندری اور زمینی حیات متاثر ہو سکتی ہے' رپورٹ میں ہنسوں کا ایک جوڑا بھی دکھایا گیا' دونوں ہنسوں کے پر تیل میں لتھڑے ہوئے تھے' وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتے تھے لیکن اپنے ہی پروں کے بوجھ سے نیچے گر جاتے تھے' کمنٹیٹر نے دونوں ہنس دکھا کر تبصرہ کیا ''خواتین و حضرات یہ دونوں معصوم پرندے وسطی ایشیا سے نقل مکانی کر کے یہاں پہنچے' ساحل پر اترے اور پھر دوبارہ اڑنے کے قابل نہ رہے' آج جب سورج غروب ہو گا تو یہ دونوں مر جائیں گے اور پھر ان کے ڈھانچے بھی تیل کے اس کیچڑ میں ہزاروں لاکھوں دوسرے پرندوں کے ساتھ دفن ہو جائیں گے لیکن ان کی سسکیاں' ان کی چیخیں..........'' اس کے ساتھ ہی سکرین پر ساحل کی پوری پٹی دکھائی جاتی ہے' کمنٹیٹر ٹھنڈا سانس بھرتا ہے اور پھر دکھ بھرے لہجے میں فقرہ مکمل کرتا ہے ''لیکن ان کی سسکیاں' ان کی چیخیں ہمیشہ اس ساحل اور اس ساحل سے پرے آباد انسانی ضمیر سے اپنا جرم پوچھتی رہیں گی''۔

جب یہ رپورٹ چلی تو میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ رپورٹ ٹیلی کاسٹ ہونے کے بعد پورے امریکہ میں ہنسوں کے اس مقتول جوڑے کی حمایت میں تحریک شروع ہو گئی' جنگلی حیات کیلئے کام کرنے والے اداروں نے فنڈز کا بندوبست کیا' ماحولیاتی آلودگی کے خلاف لڑنے والی تنظیموں نے عراقی ساحلوں کی صفائی کیلئے ٹاسک فورس بنائی' عام شہریوں نے تیل کے کیچڑ میں پھنسے پرندوں کو ''گود'' لینے کی حامی بھری جبکہ امریکی حکومت نے اس کھلم کھلے ظلم کے ذمہ داروں کو کڑی سے کڑی سزا دینے کا اعلان کیا' ان دنوں امریکی اخبارات اور رسائل دیکھنے کے بعد محسوس ہوتا تھا اگر عراق کی حکومت نے ان دو ہنسوں کا خون بہا ادا نہ کیا تو امریکہ تیسری عالمی جنگ چھیڑتے دیر نہیں لگائے گا' بہر حال یہ دنیا کی خوش نصیبی تھی امریکہ عراق پر بمباری تک محدود رہا اور کرہ ارض ہنسوں کے جوڑے کے قصاص سے بچ گیا' ان دنوں میرے سمیت دنیا کے تمام نیم خواندہ اور رقیق القلب لوگ امریکہ کی جانوروں' پرندوں اور چرندوں سے ہمدردی کے قائل ہو گئے' ہمیں محسوس ہوا اگر زندگی کے بارے میں ناانصافی' ظلم اور زیادتی کے سلسلے میں کوئی قوم حساس ہے تو وہ صرف اور صرف امریکی قوم ہے' یہ تصور چار پانچ سال تک برقرار رہا' جب میں نے عملی زندگی کا سفر شروع کیا اور زندگی کو اپنی عقل سے پرکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا وہ امریکی معاشرہ جو ہنسوں کے ایک جوڑے کی موت پر سوگ میں ڈوب گیا تھا اس کے پاس دنیا کے ہزاروں' لاکھوں معصوم اور بے گناہ لوگوں کو کفن پہنانے' ان کو دفن کرنے اور پھر ان کی قبروں پر پانی چھڑکنے کی فرصت نہیں' ہو سکتا ہے میرے قارئین میں سے چند حضرات اس دعوئ کو ایک سستی اور وقتی قسم کی جذباتیت قرار دیں لیکن ٹھنڈے ٹھار اور متحمل صاحبان ادراک کو کسی دور دراز علاقے اور تاریخ کے دھندلکے میں ہلکورے لیتے سسکتے تڑپتے واقعات کا گھونگھٹ اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور ان لوگوں کو دیدہ و دل وا کرنے کیلئے 2003ء کے بعد کا عراق اور افغانستان اور 2008ء کا فاٹا کافی ہو گا۔ میں آگے بڑھنے سے قبل آپ کو 1998ء میں جلال آباد پر امریکی حملے کی طرف لے جانا چاہتا ہوں' جلال آباد میں کڑم نام کا ایک گاؤں ہے' وہ کڑم گاؤں جس میں گیارہ اکتوبر 1998ء کی رات تک زندگی سانس لیتی اور خواب بوتی تھی لیکن پھر امریکہ کے طیارے اس کی فضا میں داخل ہوئے اور ایک ایک ٹن وزنی' ڈیڑھ ڈیڑھ میٹر لمبے اور ایک ایک میٹر موٹے 25 بم گرا کر چلے گئے اور اس کے بعد کڑم میں کٹے پھٹے اعضاء' جلی سڑی نعشوں اور بھربھری اینٹوں کے سوا کچھ نہ بچا' یہ بھربھری اینٹیں' یہ جلی سڑی نعشیں اور یہ کٹے پھٹے اعضاء دنیا کو چلا چلا کر بتا رہے تھے ابھی چند گھنٹے پہلے یہاں دو سو زندہ انسان سانس لیتے اور خواب دیکھتے تھے' مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے ایک صحافی دوست نے 1998ء میں جلال آباد کے ہسپتال میں 3 سال کا ایک بچہ دیکھا تھا' اس کے قریب اس کی ایک سالہ بہن لیٹی تھی اور ان دونوں بچوں کا پورا خاندان امریکی بمباری کا لقمہ بن گیا تھا' وہیں اسی ہسپتال میں رحمت بی بی بھی تھی' تین سال کی معصوم رحمت بی بی جس کا پورا جسم پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا' اس بچی کا بھی دنیا میں کوئی اپنا نہیں بچا تھا' اسی گاؤں میں صدوی خان تھا جس کے خاندان کے دس افراد شہید ہوئے تھے' لال خان تھا اس کے خاندان کے گیارہ افراد شہید ہوئے تھے اور محمد شاہ خان تھا جس کے گھر کے پانچ افراد شہید ہوئے تھے' یہ سب لوگ بے گناہ بھی تھے اور معصوم بھی لیکن معصومیت دیکھنے اور بے گناہی جانچنے کیلئے تو آنکھیں چاہئیں' ضمیر چاہیے اور یہی دو

چیزیں ہیں جو طاقت کے پاس نہیں ہوتیں۔

میں ان دنوں کرُم گاؤں پر اترنے والی قیامت کو اپنی زندگی کا خوفناک ترین واقعہ سمجھتا تھا لیکن پھر نا

کے بعد امریکہ نے پورے افغانستان کو کرُم گاؤں بنادیا' 2001ء کے دسمبر اور 2002ء کی جنوری میں پورے افغانستان میں لاکھوں نعشیں بکھری پڑی تھیں اور ان کی تدفین کا کوئی بندوبست نہیں تھا' میں نے بارہا ٹیلی ویژن چینلز پر ایسی نعشیں اور تباہی دیکھی اور ہر بار میرا دل خون کے آنسو روتا رہا' پھر میں نے عراق پر امریکی چڑھائی کے منظر دیکھے اور اپنی آنکھوں سے شہر کے شہر تباہ ہوتے اور برباد ہوتے دیکھے' امریکہ نے پانچ برسوں میں عراق کے پندرہ لاکھ لوگ مار دیئے' عراق کے چار شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور سینکڑوں گاؤں پیوند خاک ہوگئے اور پھر میری گناہ گار آنکھوں نے فاٹا میں امریکی میزائلوں کی تباہی دیکھی' افغانستان کے نامعلوم مقام سے ایک میزائل اڑتا اور فاٹا اور قبائلی علاقوں کے کسی نہ کسی گاؤں میں تباہی پھیلا کر بجھ جاتا' امریکہ نے پچھلے تین برسوں میں مدارس کے بے شمار نہتے بچوں کو قتل کر دیا' ان بچوں کا واحد قصور نمازیں' قرآن مجید اور داڑھیاں تھا' امریکہ کا خیال ہے دنیا کا ہر داڑھی والا مسلمان نوجوان اسامہ بن لادن ہے اور اگر امریکی توپوں اور میزائلوں نے داڑھی والے یہ نوجوان ختم نہ کئے تو یہ نوجوان کسی بھی وقت امریکہ اور یورپ کی بربادی کا باعث بن سکتے ہیں' امریکہ کی اس سوچ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور بدقسمتی سے ہماری اپنی افواج اور حکومت بھی امریکہ کی اس سوچ کا حصہ بنتی چلی جارہی ہے۔ ہم نے قبائلی علاقوں اور سوات میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف آپریشنز شروع کئے' ہمارے حکمرانوں کے ''ایک اور نائن الیون ہو سکتا ہے'' جیسے بیانات کا نتیجہ ہے نیٹو افواج نے ٹینک' توپیں اور فورسز پاکستانی سرحد پر پہنچادی ہیں اور وہ قبائلی علاقہ جات پر گولہ باری کر رہی ہیں' امریکی جاسوس طیارے پروازیں کر رہے ہیں اور مقامی لوگ نقل مکانی پر مجبور ہیں جبکہ آنے والے چند دن انتہائی الارمنگ ہیں۔

یہ سارے رویئے افسوسناک اور دردناک ہیں لیکن ان دردناک اور افسوسناک رویوں کے مقابلے میں اصل دردناک اور افسوسناک بات امریکی شہریوں کا رویہ ہے' میں حیران ہوں امریکہ کے جن شہریوں نے 1990ء میں ہنسوں کے ایک جوڑے کیلئے آسمان سر پر اٹھالیا تھا وہ آج ہزاروں بلکہ لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کی ہلاکت پر کیوں خاموش ہیں' ان لوگوں کو عراق' افغانستان اور قبائلی علاقوں میں مرتے ہوئے لوگ نظر کیوں نہیں آتے ؟ انہیں دہشت گردی کی آڑ میں بے گناہ اور معصوم لوگوں کا قتل عام نظر کیوں نہیں آتا؟ کہیں ان لوگوں کا یہ قصور تو نہیں کہ یہ انسان ہیں ہنس نہیں' مسلمان ہیں جانور نہیں اور یہ عراقی' افغانی اور پاکستانی قبائلی ہیں یورپ اور امریکہ کی پالتو بلیاں اور کتے نہیں' افسوسناک بات تو یہ ہے جس امریکہ اور یورپ کے پاس 1990ء میں ہنسوں کے جوڑے کیلئے بے تحاشا وقت تھا وہ یورپ اور امریکہ آج انسانوں کی ہلاکت پر خاموش ہے' اس امریکہ اور یورپ کے پاس ان مرتے اور دم توڑتے انسانوں کیلئے کوئی وقت نہیں۔

میرے ایک دوست چند دن قبل سنگاپور گئے اور وہاں ان کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے یہ دوست سنگاپور میں ٹیکسی میں سفر کر رہے تھے' دوران سفر انہیں سگریٹ کی طلب ہوئی توانہوں نے ٹٹول کر جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی' اس میں سے چن کر ایک سگریٹ نکالا' سگریٹ کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان مسل کر نرم کیا' اسے دونوں ہونٹوں میں دبایا' لائیٹر جلایا لیکن اس سے قبل کہ شعلہ تمباکو سے بغل گیر ہوتا ٹیکسی ڈرائیور نے بیک مرر سے انہیں دیکھا اور تمباکو نوشی سے منع کر دیا۔ میرے دوست نے لائیٹر نیچے سرکایا' سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر چٹکی میں دبایا اور حیرانی سے اس نادر شاہی حکم کی وجہ دریافت کی۔ ڈرائیور نے سرد لہجے میں جواب دیا ''سر سنگاپور میں ٹیکسیوں میں تمباکو نوشی جرم ہے''۔ میرے دوست نے آگے پیچھے دیکھا' ٹیکسی ساحلی سڑک پر رواں دواں تھی' دور دور تک کسی دوسری گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا' میرے دوست نے اطمینان کا سانس بھرا اور ہلکے پھلکے انداز میں بولے ''سگریٹ پینے میں کوئی حرج نہیں' یہاں مجھے کون دیکھے گا؟'' ڈرائیور نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیا' ٹیکسی کے پہیے چرچرائے اور وہ تار کول کی سیاہ سڑک پر لہرا کر رک گئی' ڈرائیور نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور غصے سے چلا کر بولا ''میں دیکھ رہا ہوں؟''۔

میرے دوست کو اس وقت معلوم ہوا سنگاپور کی اس ویران سڑک پر وہ ٹیکسی ڈرائیور عدالت بھی تھا' جج بھی اور قانون بھی اور اس قانون' اس جج اور اس عدالت کا لہجہ اس قدر قطعی اور اٹل تھا کہ میرے دوست نے فوراً لائیٹر بجھایا' سگریٹ ڈبیا میں رکھا' ڈبیا جیب میں رکھی' ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر معذرت کی اور گاڑی کی نشست سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دوست کو آنکھیں بند کر ہی لینی چاہیے تھیں کیونکہ ان کا تعلق ایک ایسے ملک' ایک ایسے معاشرے سے تھا جس میں ہر مضبوط شخص کے نزدیک سگریٹ نوشی سے لے کر قتل تک کوئی جرم' جرم نہیں ہوتا' جس میں مجرم کا معاشرتی درجہ دیکھ کر' اس کا سٹیٹس' اس کا اختیار دیکھ کر قانون ہو یا عدالت' منصف ہو یا محتسب اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں' جس میں تمام ادارے مل کر کہتے ہیں ''ہم نے کچھ نہیں دیکھا' یہ قتل تو قتل ہے ہی نہیں' یہ خلاف ورزی تو خلاف ورزی ہے ہی نہیں' یہ تو ان کا استحقاق تھا' یہ تو ان کا قانون اور آئین کے مطابق صوابدیدی اختیار تھا''۔

آپ چند سو میل پر محیط سنگاپور سے لے کر لاکھوں مربع میل پر پھیلے امریکہ تک دنیا کے تمام جدید اور مہذب ممالک کو دیکھ لیجئے' انہوں نے احتسابی عمل کو چند اداروں' چند افراد اور چند عدالتوں تک محدود نہیں رہنے دیا تھا' انہوں نے اسے ہر شخص تک پھیلا دیا تھا' اسے اکاؤنٹیبلٹی بیورو کا حصہ بنا دیا تھا' انہوں نے ہر شخص' ہر فرد کو عدل قائم رکھنے' احتساب کرنے اور برائی کو زبان اور ہاتھ کی طاقت سے روکنے کا شعور دے دیا تھا لہٰذا آج وہاں لوگ پولیس کا انتظار نہیں کرتے خود آگے بڑھ کر خلاف ضابطہ حرکت کرنے والے شخص کو ''ایکسکیوز می'' کہہ دیتے ہیں' اسے روکتے ہیں' اسے ٹوکتے ہیں' اگر وہ ٹوکنے کے باوجود نہیں رکتا تو پھر قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اطلاع دے دی جاتی ہے جس کے بعد گرفتاری' پیشی اور سزا کا عمل شروع ہو جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس ہم پاکستان میں احتساب کمیشن بناتے ہیں اور سیف الرحمٰن کو اس کا سربراہ بنا دیتے ہیں' پھر اس پر کرپشن اور اقدام قتل کا الزام لگاتے ہیں' اسے لانڈھی جیل میں بند کرتے ہیں اور احتساب کمیشن کا بورڈ اتار کر اس کی جگہ قومی احتساب بیورو کا بینر لگا دیتے ہیں' جنرل امجد حسین کو اس کا سربراہ بناتے ہیں اور پھر راجہ بازار کی نالیوں سے لے کر ہیلی کاپٹر کی خریداری تک کرپشن کے ہزاروں کیس ان کی میز پر رکھ کر معجزوں کا انتظار کرنے لگتے ہیں لیکن پھر چیئرمینوں پر چیئرمین بدلتے رہتے ہیں لیکن ملک میں احتساب کا عمل مکمل نہیں ہوتا یہاں تک کہ نئی حکومت آتی ہے اور وہ نیب کو پاکستان ریلوے جیسا فضول ادارہ بنا دیتی ہے لیکن ہم روز اٹھتے ہیں اور اس امید پر دروازہ کھول کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ابھی کوئی شخص گلی میں داخل ہو گا اور ہر گھر کے سامنے رک کر اعلان کرے گا ''لوگو! احتساب ہو چکا ہے'' اور ہم لوگ اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے سے گلے ملیں گے' ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے اور پھر اطمینان سے سو جائیں گے۔ بتائیے کیا یہ ممکن ہے' کیا یہ ہو سکتا ہے؟۔

یقین کیجئے جب تک اس ملک کا بچہ بچہ احتسابی عمل کا حصہ نہیں بنتا' جب تک تمام لوگ جرم' بدعنوانی' بے ایمانی' کرپشن اور اختیارات سے تجاوز جیسے گناہوں کے خلاف سینہ سپر نہیں ہوتے' جب تک عام آدمی قانون اور ضابطے کی خلاف ورزی کرنے والے کا ہاتھ پکڑ کر یہ نہیں کہتا ''سر آپ یہ نہیں کر سکتے کیونکہ میں آپ کو دیکھ رہا ہوں'' اس وقت تک ملک میں احتساب کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا' اس وقت تک برائی کی زنجیر نہیں ٹوٹ سکتی اور

جرم کا پراسیس ختم نہیں ہو سکتا خواہ آپ ایک عام سی پیپر پن کی چوری کی سزا پھانسی رکھ دیں‘ ملک میں احتساب کے ایک سو سولہ ادارے‘ چار لاکھ عدالتیں اور ایک کروڑ پولیس سٹیشن بنا دیں‘ آپ ہر گھر کے سامنے ٹکٹکی لگا دیں اور پھر برطانیہ سمیت پوری دنیا کو کرپشن کی نئی تعریف وضع کرنے پر قائل کر لیں۔

دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ جرم کو پولیس روک سکتی ہے اور نہ ہی عدالت‘ جرم کو صرف گواہ روک سکتا ہے لیکن ہم لوگ 16 کروڑ ججوں‘ انسپکٹروں اور احتساب افسروں کو ”موبلائز“ کرنے کی بجائے صرف چند تھانوں‘ چند سو عدالتوں اور چند ہزار پولیس اہلکاروں پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں‘ ہم نے بدقسمتی سے آج تک پاکستان کی عوام کو پاکستان کا حصہ نہیں سمجھا‘ ہم نے آج تک ان لوگوں کو شہری کا سٹیٹس نہیں دیا‘ ہم نے انہیں معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری ہی نہیں سونپی چنانچہ ہماری اس غفلت کے نتیجے میں ملک تین طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے‘ ایک طرف ظالم لوگ ہیں‘ دوسری طرف مظلوم ہیں جبکہ تیسری طرف اس ملک کے 16 کروڑ تماشائی کھڑے ہیں‘ دنیا کے تمام جدید ممالک نے اپنی تماشائی کلاس کو قانون اور انصاف کا حصہ بنا دیا تھا لہٰذا وہ ممالک آج امن و امان کو بھی انجوائے کر رہے ہیں‘ ترقی اور خوشحالی کو بھی اور معیار زندگی کو بھی جبکہ ہمارے ملک میں اب سڑک‘ گلی اور مارکیٹ تک جانا ممکن نہیں رہا‘ ہر طرف خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں‘ تمام گھروں‘ دکانوں اور مارکیٹوں میں گارڈز کھڑے ہیں‘ گھروں کی چھتوں پر توپیں لگی ہیں اور لوگوں نے دکانوں کے سامنے مورچے بنا رکھے ہیں‘ پورا ملک جنگ زدہ علاقہ دکھائی دیتا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں‘ ہم اس صورتحال سے کیسے باہر نکل سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے‘ ہم اس ملک کی تماشائی کلاس کو ”موبلائز“ کریں‘ ہم اسے بتائیں یہ ملک تمہارا ہے اور اگر تم اس ملک کو بچانے کیلئے باہر نہ نکلے تو یہ ملک برباد ہو جائے گا‘ جون میں کراچی میں چند واقعات ہوئے تھے‘ کراچی کے چند لوگوں نے ڈاکوؤں کو پکڑ کر سرے عام آگ لگا دی تھی‘ گو یہ ایک افسوس ناک واقعہ اور تباہ کن رجحان تھا لیکن اس کے نتیجے میں کراچی میں ڈاکے کی وارداتیں بہت کم ہو گئیں‘ کیوں؟ کیونکہ ڈاکوؤں کو معلوم ہو گیا عام شہری موبلائز ہو چکا ہے اور اسے جہاں کہیں کوئی ڈاکو نظر آتا ہے وہ اسے پکڑ کر وہیں جلا دیتا ہے چنانچہ جن ڈاکوؤں کو پولیس‘ تھانے اور عدالتیں نہ ڈرا سکیں وہ ڈاکو عوام کے خوف سے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ آپ دو دن پہلے کے واقعہ کو ہی لے لیجئے‘ 15 جولائی 2008ء کو پی ٹی سی ایل کے ملازمین نے تنخواہوں میں اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک گیر احتجاج کیا‘ ٹیلیفون ایکسچینجوں کو تالے لگائے اور اسلام آباد ہیڈ کوارٹر کے سامنے دھرنا دیا‘ اس دوران ملازمین نے حکومت مخالف نعرے لگانا شروع کر دیئے چنانچہ رینجرز نے ان پر آنسو گیس پھینکی اور لاٹھی چارج کیا‘ جواباً ملازمین نے رینجرز کے اہلکاروں پر پتھراؤ کیا یوں پی ٹی سی ایل کا ہیڈ کوارٹر میدان جنگ بن گیا‘ اس جھڑپ میں پی ٹی سی ایل کے 25 سے زائد کارکن اور رینجرز کے دس اہلکار زخمی ہوئے اور تادم تحریر ملک بھر کی ٹیلی فون ایکسچینجز بند پڑی ہیں۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے جب عوام کو عدالتیں انصاف اور حکمران حقوق نہیں دیتے تو وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور وہ لڑنے مرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں یہ رجحان غلط ہے کیونکہ اس قسم کے رجحانات ملکوں کو خانہ جنگی کی طرف لے جایا کرتے ہیں‘ قانون نافذ کرنا قانون کے اداروں کا کام ہے‘ عوام کو حقوق کی فراہمی حکومت کا فریضہ ہے اور انصاف قائم کرنا عدالتوں کی ذمہ داری لیکن جب تھانے‘ حکومت اور عدالتیں کام نہ کر رہی ہوں تو عوام کو ضرور موبلائز ہونا چاہیے‘ اگر اس نازک وقت میں عوام بھی بے حس ہو جائیں گے تو پھر ملکوں کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

میری حکومت سے درخواست ہے وہ عوام کو حقوق اور انصاف دے‘ وہ انہیں جرائم کے خلاف موبلائز کرے‘ عام آدمی کو جرائم‘ برائی اور لاقانونیت کے خلاف ابھارے‘ اسے جرائم کے خلاف جہاد کرنے والے اداروں کا حصہ بنائے تاکہ ملک آگے بڑھے‘ اگر ہم نے 16 کروڑ لوگوں کو صرف تماشائی بنائے رکھا تو پھر یہ حکومت واقعی بحران کا شکار ہو جائے گی اور ہمارے اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہے گا۔

یہ سوویت یونین کے مشہور حکمران خروشیف کا واقعہ ہے' جب وہ سوویت یونین کا صدر بنا تو اس نے پارلیمنٹ میں اپنے پہلے خطاب میں سابق صدر سٹالن اور اس کی پالیسیوں پر تنقید شروع کر دی' اس کا کہنا تھا سٹالن میں برداشت نہیں تھی' وہ ایک بدبودار آمر تھا' وہ ظالم تھا' وہ اختلاف کرنے والے ساتھیوں تک کو دشمن سمجھ لیتا تھا' اس کے خوشحالی اور معاشی استحکام کے دعوے بھی جھوٹے تھے اور سوویت یونین کو جتنا نقصان سٹالن نے پہنچایا اتنا ساری سرمایہ دار دنیا مل کر نہیں پہنچا سکی وغیرہ وغیرہ' خروشیف جب ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا تو معزز ارکان میں سے کسی نے چٹ پر کچھ لکھا اور اس تک پہنچا دیا' خروشیف نے ایک لمحے کیلئے رک کر چٹ پڑھی' لکھا تھا ''آپ کو سٹالن کے قریب رہنے کا موقع ملا جب وہ سوویت یونین کو نقصان پہنچا رہا تھا تو آپ نے اس وقت اس کو کیوں نہیں روکا تھا'' خروشیف کا چہرہ سرخ ہو گیا' اس نے وہ چٹ ایوان کی طرف لہرائی اور چلا کر کہا ''یہ کس گستاخ نے لکھا ہے'' ایوان میں ''پن ڈراپ سائلنس'' ہو گئی اور تمام ارکان بغلیں جھانکنے لگے' خروشیف دوبارہ چلایا ''میں پوچھ رہا ہوں' یہ گستاخ کون ہے'' ایوان میں خاموشی رہی' خروشیف نے قہقہہ لگایا' چٹ پھاڑی اور پرزے ہوا میں اچھال کر بولا ''جب سٹالن سوویت یونین کو نقصان پہنچا رہا تھا تو ہم بھی ایسی ہی چٹیں لکھا کرتے تھے اور خاموش رہتے تھے''۔

یہ اقتدار کی ٹریجڈی ہے' شاہوں کی قربت میں امام یوسف ہوں' نصیر الدین طوسی ہوں' جنرل جمشید گلزار کیانی' شیخ رشید یا پھر اعجاز الحق اختلاف رائے ہمیشہ مزاج شاہ کے تابع ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا عالم' بڑے سے بڑا فلاسفر' بڑے سے بڑا دانشور اور بڑے سے بڑا جرنیل بھی جب حلقہ بگوش شاہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اختلاف کی طاقت کھو بیٹھتا ہے' بادشاہوں کی صحبت میں تو کلمہ حق کہنے کیلئے بھی شاہ کی اجازت درکار ہوتی ہے لہٰذا جب تک اقتدار کا سورج سوا نیزے پر رہتا ہے بڑے سے بڑا حق گو بھی فقط چٹیں لکھنے اور جلال شاہی کے وقت سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے رہنے پر اکتفا کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے اس وقت سر اٹھانے کی جرأت کی تو اس کا سر سلامت نہیں رہے گا اور اگر سر بچ بھی گیا تو بھی وہ قربت شاہی سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھے گا اور ظاہر ہے ایوان اقتدار سے باہر کھڑے سیاستدانوں اور دریا کے خشک کناروں پر پڑی مچھلی میں کوئی فرق نہیں ہوتا' قربت شاہی میں زندگی بسر کرنے والے لوگ اس ماحول اور اس ماحول کے پروٹوکول سے اتنے آشنا ہوتے ہیں کہ اگر انہیں کبھی بادشاہ سلامت خود بھی اختلاف رائے کا حق عنایت کر دیں تو بھی وہ چٹ لکھنے تک ہی محدود رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں اختلاف کا یہ حق کسی بھی وقت گستاخی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں گستاخی کی سزا موت ہوتی ہے' جسمانی یا سیاسی موت! روشن خیال اور وسیع القلب بادشاہ ڈاکوؤں کے اس سردار کی طرح ہوتے ہیں جس نے ڈاکے کا ایک منصوبہ بنایا' اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھا اور آخر میں پوچھا' اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ کھڑا ہو کر اختلاف کر لے میں بڑا لبرل سردار ہوں' میں اختلاف رائے کو ہمیشہ پسند کرتا ہوں' سردار کا اعلان سن کر ایک نوجوان ڈاکو کھڑا ہوا اور جرأت سے بولا' یہ ایک بالکل خام منصوبہ ہے اور مجھے یقین ہے اس منصوبے کے آخر میں ہم سب پکڑے جائیں گے' سردار نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور جب وہ نوجوان خاموش ہوا تو سردار نے جیب سے ریوالور نکالا' نوجوان ڈاکو کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی' نوجوان پیچھے گر گیا' سردار نے ریوالور کی نلی پر پھونک ماری اور پسینہ پونچھتے ہوئے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا ''کسی اور کو اعتراض ہو تو وہ بھی کھڑا ہو جائے''۔

میں پچھلے کچھ عرصے سے سابق حکومت میں شامل چند وزراء کو سچ بولنے کے ہیضے میں مبتلا دیکھ رہا ہوں' اعتراف جرم کا یہ معاملہ شروع میں شیخ رشید تک محدود تھا' انہوں نے سب سے پہلے فرمایا تھا لال مسجد آپریشن اور چیف جسٹس کی معطلی شوکت عزیز حکومت کی سب سے بڑی غلطی تھی' پھر شیر افگن کا ضمیر جاگا' پھر وصی ظفر بولے' اس کے بعد آفتاب احمد شیر پاؤ بولنے لگے' پھر مخدوم فیصل صالح حیات نے اعتراف شروع کر دیا' اسی دوران سید مشاہد حسین نے پچھلی حکومت کی غلطیاں تسلیم کیں اور اب اعجاز الحق کا فرمانا ہے کہ وہ لال مسجد آپریشن کے حوالے سے اپنے رویئے پر پشیمان ہیں اور معافی کے خواستگار ہیں' صدر پرویز مشرف نے جون کے وسط میں میرے ساتھ ایک خصوصی ملاقات میں شوکت عزیز کی خامیوں کا اعتراف کیا' صدر صاحب کا کہنا تھا میں نے شوکت عزیز کو تین بار پاکستان بلایا لیکن وہ خوف کا شکار ہیں چنانچہ انہوں نے واپس آنے سے انکار کر دیا' میں نے جب سابق حکومت کے سابق وزراء کے منہ سے یہ اعترافی بیانات سنے تو مجھے خروشیف کا واقعہ یاد آ گیا اور میرا دل چاہا میں ان حضرات سے پوچھوں جب 9 مارچ کو چیف جسٹس کو معطل کیا گیا تھا یا جولائی میں مدرسہ حفصہ اور

لال مسجد پر فوج کشی کی جا رہی تھی تو اس وقت آپ لوگ کہاں تھے' آپ اس وقت کیوں نہیں بولے؟ اس وقت صدر پرویز مشرف اور شوکت عزیز جو فیصلہ چاہتے تھے کر گزرتے تھے اور آپ خاموشی سے ان کے فیصلے پر گردن ہلا دیتے تھے لیکن آج آپ کا ضمیر بھی جاگ گیا' آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہو گیا ہے اور آپ میں اعتراف کی جرأت بھی پیدا ہو گئی ہے' واہ کیا لوگ ہیں آپ!

دنیا میں سچ کا ایک دور اور ایک وقت ہوتا ہے' اگر سچ اس وقت' اس دور میں نہ بولا جائے تو وہ سچ انکشاف تو کہلا سکتا ہے لیکن سچ نہیں' دنیا میں سقراط کہلانے کا حق صرف اس شخص کو پہنچتا ہے جو ایتھنز کے اس قید خانے میں اس وقت زہر کا پیالہ پیئے جب اس کے شاگرد فرار کے لئے دروازے کھلوا چکے ہوں اور منصور بھی صرف وہی شخص کہلا سکتا ہے جو موت کو انچ انچ اپنی طرف بڑھتا دیکھے لیکن مسلسل اناالحق کے نعرے لگاتا رہے' مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک میں سیاستدان تو بہت ہیں' ابوالفضل' طوسی اور ابو یوسف بھی بہت ہیں' انکشافات کرنے والے حق گو بھی بہت ہیں لیکن سقراط اور منصور کوئی نہیں اور یہ سچ ہے قوموں اور ملکوں کو جابر سلطان کے سامنے چٹیں لکھنے والے ابو یوسف اور انکشاف کرنے والے ابوالفضل کی نہیں بلکہ درباروں میں سچ بولنے والے سقراط اور وقت کی دہلیز پر حق کہنے والے منصوروں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم اس معاملے میں ایک بدقسمت قوم ہیں اور ہمارے تمام باضمیر سیاستدانوں کا ضمیر صرف اپوزیشن میں جاگتا ہے' یہ لوگ اقتدار سے فارغ ہو کر سچ بولنا شروع کر دیتے ہیں' معافیاں مانگنا شروع کر دیتے ہیں اور جوں ہی انہیں اقتدار میں شامل ہونے کا دوبارہ موقع ملتا ہے یہ لوگ اپنے ضمیر کو کسی گہری کھائی میں جا پھینکتے ہیں' یہ اسے زمین کی سات تہوں میں دفن کر دیتے ہیں اور جب تک اقتدار میں ان کی شراکت برقرار رہتی ہے یہ لوگ بادشاہ سلامت کی بڑی سے بڑی غلطی اور بڑی سے بڑی حماقت پر سر ہلاتے رہتے ہیں' واہ واہ کرتے رہتے ہیں لیکن جوں ہی بادشاہ سلامت کے پنجے اور دانت جھڑ جاتے ہیں تو ان لوگوں کا ضمیر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے اور یہ میں نے کہا تھا' میں اس آپریشن کا مخالف تھا اور میں نے بڑا سمجھایا تھا کا راگ الاپنے لگتے ہیں' ہم حقیقتاً ایک ایسی بدقسمت قوم ہیں جسے ہمیشہ نماز کے بعد وضو یاد آتا ہے اور تدفین کے بعد غسل۔

حاجی صاحب لان میں چہل قدمی کر رہے تھے' وہ گلاب کی کیاریوں سے اپنا سفر شروع کرتے' نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے چنبیلی کی قطار تک پہنچتے' رکتے' منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لیتے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر واپس گلاب کی طرف چل پڑتے' یہ پچھلے آدھ گھنٹے میں ان کا آٹھواں چکر تھا' ان کی مشہور زمانہ چھڑی امرود کے تنے سے ٹیک لگائے ہوئی تھی اور ملازم کوریڈور میں ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے' میں حیرت سے کبھی چھڑی کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی لکے کبوتروں کی طرح سینہ پھلا کر واک کرتے حاجی صاحب کو اور پھر بے چین ہو کر ''لان چیئر'' پر پہلو بدلنے لگتا۔

میں حاجی صاحب کو پچھلے دس برس سے جانتا ہوں' حاجی صاحب دائم المرض ہیں' ان کا جگر سکڑ کر پندرہ فیصد رہ گیا تھا' وہ پچھلے کئی برسوں سے ہر ہفتے پیٹ سے چار بوتل پانی نکلواتے تھے' ان کے گردے تقریباً ناکارہ ہو چکے تھے' وہ ایک وقت میں آدھے سلائس سے زائد خوراک نہیں کھا سکتے تھے' ان کے پھیپھڑوں میں اکثر پانی بھر جاتا تھا جس سے انہیں سانس لینے میں دقت ہوتی تھی' نقاہت اس قدر تھی کہ ملازم انہیں اٹھا کر ٹوائلٹ لے جاتے تھے' ڈاکٹروں کی کوششوں سے کبھی سال چھ مہینے بعد ان کی طبیعت ذرا دیر کیلئے سنبھل جاتی تھی تو وہ چھڑی (ڈنڈے) کی مدد سے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے' تین برس پہلے ایک بار وہ بالکل تندرست ہو گئے اور ان دنوں میں وہ چھڑی کا سہارا لے کر بیڈ سے کرسی تک چلے جاتے تھے' یہ بیماری کے دوران حاجی صاحب کی زندگی کا سب سے اچھا وقت تھا' یہ حاجی صاحب میرے ایک قریبی دوست کے والد ہیں' خاندانی رئیس ہیں اور انہوں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی' مجھے اچھی طرح یاد تھا چار ماہ قبل میں انہیں سلام کرنے کیلئے ان کے کمرے میں گیا تھا' وہ اس وقت لیٹ کر ریڈیو کی ناب گھمانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن رعشے کے باعث ناب ان کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی' میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ناب گھمائی اور ان کی مرضی کا سٹیشن لگا کر ریڈیو ان کے سرہانے رکھ دیا' ممنونیت سے حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جبکہ ان کی بے بسی دیکھ کر میرا حلق نمکین ہو گیا' چار ماہ بعد جی ہاں صرف چار ماہ بعد میں ان کے گھر داخل ہوا اور حاجی صاحب کو سہارے کے بغیر لان میں چہل قدمی کرتے دیکھا تو حیرت سے میرا منہ کھل گیا' میں لان چیئر پر بیٹھ گیا' حاجی صاحب نے دور سے ہاتھ ہلا کر مجھے خوش آمدید کہا اور خود اسی طرح واک کرتے رہے' دسواں پھیرا مکمل ہوتے ہی وہ مڑے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کرسیوں کے نزدیک آ گئے' میں ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا' حاجی صاحب نے بازو آگے بڑھا کر مجھ سے ہاتھ ملایا' میری خیریت پوچھی اور پھر مسکرا کر میرے سامنے بیٹھ گئے' میں بھی بیٹھ گیا' حاجی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے' گردن میں صحت مند لوگوں جیسا تناؤ تھا اور آواز میں راجپوتوں کی روایتی گھن گرج تھی' ملازم نے ان کے کندھوں پر تولیہ ڈال دیا' حاجی صاحب نے رگڑ کر منہ صاف کیا اور ہنس کر بولے ''میں تمہاری پریشانی سمجھ رہا ہوں' تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا یہی ردعمل ہوتا'' انہوں نے تولیہ واپس کیا اور اشارے سے چھڑی لانے کا حکم دیا' ملازم امرود کے پیڑ کی طرف چل پڑا۔

''لیکن یہ معجزہ ہوا کیسے' کوئی دوا' کوئی دعا' کوئی پیتھی یا کوئی تھراپی' کس نے یہ کمال دکھایا؟'' مجھے اپنے سوال کیلئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے' حاجی صاحب مسکرائے تو ڈوبتے سورج کی کرنیں ان کے دودھ جیسے اجلے دانتوں پر اتر آئیں' ملازم ان کی چھڑی لے آیا' انہوں نے چھڑی کے دستے پر دونوں ہاتھ جمائے اور پھر ہاتھوں کے کوہان پر ٹھوڑی جما کر بولے ''میرے ہاتھ صحت کا ایک ایسا نسخہ آ گیا ہے اگر دنیا کو معلوم ہو جائے تو سارے ڈاکٹر بے روزگار ہو جائیں' سارے ہسپتال بند ہو جائیں اور سارے میڈیکل سٹوروں پر تالے پڑ جائیں'' میں مزید حیران ہو گیا' حاجی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا ''یار کاکا جی میرے ملازم کی ماں مر گئی تھی اور وہ چھٹی پر گاؤں چلا گیا' میرے بچوں نے عارضی طور پر مجھے چھ سات سال کا ایک بچہ دے دیا' یہ بچہ تازہ تازہ ہمارے گھر ملازم ہوا تھا' وہ بچہ تھا لہٰذا اسے مجھے سنبھالتے ہوئے بڑی دقت ہوتی تھی' ایک روز میں نے سوچا پتہ نہیں کون سی مجبوری ہے جس نے اس معصوم کو مجھ جیسی نعش سنبھالنے پر مجبور کر دیا' میں نے اس سے وہ مجبوری پوچھی تو پتہ چلا اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سیلاب میں بہہ گئے تھے' ڈور ڈنگروں اور زمین جائیداد پر عزیز رشتے داروں نے قبضہ کر لیا تھا اور خود وہ تین وقت کے کھانے اور دو کپڑوں کے عوض ہمارے گھر ملازم ہو گیا' بچے کی کہانی سن کر میرا دل پسیج گیا' میں نے بچے سے پوچھا ''بیٹا تم پڑھو گے؟'' بچے نے ہاں میں گردن ہلا دی' میں نے اپنے منیجر کو بلوایا اور بچے کو شہر کے سب سے اچھے سکول میں داخل کرا دیا' تم یقین کرو اس روز میں نے تین سال بعد پیٹ بھر کر کھانا

کھایا' میں اور میرے ڈاکٹر حیران رہ گئے' اگلے روز میں نے اس بچے کو ہوسٹل میں داخل کرا دیا' اس شام ملازم نے مجھے ٹوائلٹ لے جانے کیلئے اٹھایا تو میں سہارے کے بغیر پلنگ سے اٹھ گیا' میں ٹوائلٹ سے واپس آیا تو [illegible] ملازم بلوائے اور انہیں کل تک ایسے پانچ بچے لانے کا حکم دے دیا جن کا اس دنیا میں کوئی نہ ہو' اگلے روز پانچ بچے آ گئے' میں نے انہیں بھی اسی سکول میں داخل کرا دیا'' حاجی صاحب خاموش ہو گئے۔

''پھر کیا ہوا حاجی صاحب'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا ''پھر یہ سب کچھ ہوا جو تمہارے سامنے ہے' میں اپنی ٹانگوں پر چل رہا ہوں' کھا پی رہا ہوں اور قہقہے لگا رہا ہوں'' حاجی صاحب نے چھڑی گھاس پر پھینکی' کرسی سرکائی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے' میں بھی کھڑا ہو گیا' وہ مسکرائے اور کھنکتی آواز میں بولے ''تم بیٹھ کر چائے پیو میں نے ابھی مزید دس پھیرے لگانے ہیں'' میں بیٹھ گیا' حاجی صاحب سینہ پھلا کر گلاب کی کیاریوں کی طرف چل پڑے۔

''حاجی صاحب احتیاط سے چلیں کہیں گر نہ جائیں؟'' میں نے ہانک لگائی' حاجی صاحب نے مڑے بغیر قہقہہ لگایا اور اسی طرح لکے کبوتروں کی طرح چلتے چلتے بولے ''میں اب نہیں گروں گا' میں گر گیا تو ان چھ یتیم بچوں کو ہر مہینے ہزار روپے کون دے گا' میں نہیں گروں گا' اب میں اس وقت تک نہیں گروں گا جب تک یہ بچے اپنے ستر قدموں پر کھڑے نہیں ہو جاتے'' حاجی صاحب گلاب کی کیاریوں کے قریب پہنچ کر رک گئے' میری طرف دیکھا اور ذرا اونچی آواز میں بولے ''قدرت یتیموں کو چھاؤں دینے والے درختوں کے سائے لمبے کر دیا کرتی ہے' یہ میرا تجربہ ہے'' وہ رکے اور میری طرف مڑ کر بولے ''انسان کو مقصد زندہ رکھتا ہے' جب میری زندگی کے سارے مقصد دم توڑ گئے تو میرے جسم کے اعضاء بھی ایک ایک کر کے مرنا شروع ہو گئے تھے لیکن جب میں نے یتیم بچوں کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو قدرت نے میری توانائیاں مجھے واپس کر دیں' میں اب صحت مند بھی ہوں اور خوش بھی' تم تمام لوگوں کو میرا یہ پیغام دے دو اگر وہ اچھی' صحت مند' خوبصورت' توانا اور مطمئن زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کا کوئی اچھا سا مقصد تلاش کر لیں' وہ کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیں' وہ کسی بیوہ کے رزق کا بندوبست کر دیں' وہ کسی بیمار کے لئے دواء دارو کا انتظام کر دیں' وہ بھوکوں کیلئے روٹی کا سلسلہ شروع کر دیں اور کچھ نہیں تو وہ دس بیس پچاس درخت لگا دیں اور روزانہ درختوں کو پانی دینا شروع کر دیں اللہ تعالیٰ اس نیکی کے صدقے انہیں لمبی عمر' صحت مند زندگی اور خوشیاں دے گا' جاؤ سب کو بتا دو اللہ تعالیٰ بے مقصد لوگوں کو اپنی زمین کا بوجھ سمجھتا ہے چنانچہ وہ انہیں زیادہ مہلت نہیں دیتا'' حاجی صاحب نے کمر پر ہاتھ رکھا اور دوبارہ واک شروع کر دی' میں انہیں حیرت سے دیکھتا رہا' حاجی صاحب نے چکر لگایا اور پھر بولے ''نیکی انسان کی صحت اور صدقہ زندگی میں اضافہ کرتا ہے اور میں قدرت کے اصول کو سمجھ گیا ہوں'' میں نے ہاں میں سر ہلایا' اٹھا' حاجی صاحب کو سلام کیا اور ان کے گھر سے باہر آ گیا۔

سینٹرل جیل گوجرانوالہ میں قید سزائے موت کے قیدی اسحاق ولد ناظر حسین نے اپنے خط میں مزید لکھا" جاوید صاحب! Mystrugaleforfreedom دیکھئے' انسان کے اندر محبت کا ایک فطری جذبہ ہے وہ جہاں کچھ عرصہ رہتا ہے وہاں کے انسانوں ہی سے نہیں بلکہ درودیوار تک کو یاد رکھتا ہے اور مصیبت کے وقت گزرا ہوا وقت تو بندہ بھول ہی نہیں سکتا۔ میں جن کو مخاطب کرنے جا رہا ہوں وہ بھی کبھی ہماری طرح قید میں مصیبت کے دن کاٹ رہے تھے لیکن اب وہ آزاد ہیں اور اللہ پاک ان پر مہربان ہے اور اس وقت وہ اقتدار میں ہیں' اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔ آمین ثم آمین۔ لیکن ہم قیدی لوگ آج کے حکمرانوں اور ماضی کے قیدیوں سے رحم کی اپیل کرتے ہیں' سب سے پہلے میاں نواز شریف صاحب یاد کریں وہ دن۔ اللہ آپ کو حیاتی دے۔ آمین۔ کتاب کا نام ہے "میری زندگی" تحریر بل کلنٹن' بل کلنٹن کی خود نوشت' بل کلنٹن لکھتے ہیں" پاکستان میں میرا اسٹاپ انتہائی متنازعہ تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں حال ہی میں فوجی حکومت آئی تھی مگر پھر بھی مجھے پاکستان جانا تھا' اس کی کئی وجوہات تھیں جن میں پہلی وجہ یہ تھی کہ میرا ارادہ تھا میں وہاں جلد از جلد عوامی حکومت کے قیام پر زور دوں گا اور کشمیر پر کشیدگی کم کرنے کی بات کروں گا' دوسرا جنرل پرویز مشرف سے کہوں گا کہ وہ معزول وزیراعظم نواز شریف کو سزائے موت نہ دیں جن پر اس وقت مقدمہ چل رہا تھا"۔ میاں نواز شریف صاحب اللہ کا لاکھ' لاکھ بار شکر ہے کہ وہ بھیانک وقت آپ پر نہیں آیا' ماں کی دعاؤں سے' عوام کی دعاؤں سے آپ کال کوٹھڑی سے بچ کر نکل گئے۔ میری آپ سے درخواست ہے' آپ پارلیمنٹ میں بیٹھ کر سزائے موت کے قیدیوں کو ضرور یاد رکھئے گا' ہم آپ سے رحم کی اپیل کرتے ہیں' ایک دفعہ عام معافی کا اعلان کیا جائے' سزائے موت کو تبدیل کر کے 25 سال کر دیا جائے' اب میں ذکر کروں گا زرداری صاحب کا۔ آپ واقعی بہادر انسان ہیں' اتنا بڑا صدمہ ہو جانے کے بعد بھی آپ نے صبر و تحمل کا نہ صرف مظاہرہ کیا بلکہ پارٹی کو مستحکم کیا اور محترمہ کا جمہوریت کا خواب پورا کیا (Dreamofdemocracyneverdie) جمہوریت کا خواب کبھی نہیں مرتا۔ جناب محترم المقام زرداری صاحب! آپ نے ایک عرصہ جیل میں گزارا' آپ کی زندگی کے جو ماہ و سال جیل کی نذر ہو گئے وہ واپس نہیں آ سکتے' انہیں عدالتوں نے آپ کو ملزم اور پھر باعزت بری کر دیا' اللہ پاک کا آپ پر خاص فضل و کرم ہوا' قتل جیسا مقدمہ بنا اور آپ بری ہو گئے۔ ہماری دعا ہے آپ آنے والے دنوں میں عزت کی سب سے اونچی مسند پر بیٹھیں۔ آمین لیکن ہمیں ضرور یاد رکھیں۔ ہم آپ سے رحم کی اپیل کرتے ہیں' آپ سے زیادہ ہمارے دکھ کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟۔ ایک دفعہ عام معافی کا اعلان کیا جائے' سزائے موت کو ختم کر کے عمر قید یعنی پچیس سال کر دیا جائے۔ بھٹو صاحب کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھانسی دے دی گئی' محترمہ صاحبہ (اللہ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے) ان کے دل میں سزائے موت کے قیدیوں کیلئے درد تھا لہٰذا انہوں نے برسر اقتدار آتے ہی سزائے موت کے قیدیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ جناب پرائم منسٹر یوسف رضا گیلانی صاحب! آپ وہ دن یاد کریں جب آپ بھی سزائے موت کے سیلوں میں رہے۔ آپ کو تو سارے حالات و واقعات کا علم ہے جب بندے کی ڈیتھ لگتی ہے' اس کو تختہ دار پر لے جا کر پھانسی دے دی جاتی ہے تو اس دن ساری جیل افسوس کرتی ہے۔ اس دن قیدی جیل میں اپنے طور پر چولہا نہیں جلاتے' فاتحہ خوانی ہوتی ہے' دعا کی جاتی ہے' آپ جانتے ہیں ہر سال کتنے بے گناہ لوگ سولی چڑھ جاتے ہیں۔ اب ماشاءاللہ آپ اقتدار میں ہیں' ہم آپ سے سہولتیں نہیں مانگتے اور نہ ہی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ہمیں موبائل کی سہولت دے دیں۔ جناب پرائم منسٹر صاحب! ہم یہ سہولتیں لے کر اذیت ناک موت نہیں مرنا چاہتے' ہم تو آپ کے آگے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ ایک دفعہ عام معافی کا اعلان کیا جائے۔ ایک دفعہ' ایک دفعہ ہم آپ سے رحم کی اپیل کرتے ہیں۔ پاکستان سے سزائے موت کو ختم کر کے پچیس سال میں تبدیل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ میری یہ آرزو پوری کرے۔ جاوید ہاشمی صاحب! آپ بھی اس موت کے شہر سے واقف ہیں۔ جناب شیخ رشید صاحب' اللہ پاک آپ کو بھی لمبی زندگی' پختہ ایمان اور اقتدار نصیب کرے' جناب جاوید ہاشمی اور جناب شیخ رشید صاحب سیاست میں ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن جب سزائے موت کی بات آئے گی تو ضرور ہمارے حق میں بات کریں گے۔ جناب شیخ رشید صاحب کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ میں سزائے موت کو ختم کروانے کیلئے ارباب اختیار کے سامنے آپ کے حق میں بات اٹھاؤں گا۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں' ہم آپ کو دوبارہ پارلیمنٹ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جناب مشاہد حسین صاحب آپ بھی اس خوف کی کیفیت سے گزر چکے ہیں' آپ کو وزارت سے اٹھا کر کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا تھا' آپ نے کہا تھا

آپ نے زندگی کی کئی حقیقتوں کو قید کے دنوں میں سمجھا تھا۔ میڈم عاصمہ جہانگیر صاحبہ! تنظیم انسانی حقوق کی علمبردار' آپ نے اپنی سالانہ رپورٹ میں گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ سربجیت سنگھ سمیت سزائے موت کے تمام قیدیوں کو معافی دی جائے۔ جناب انصار برنی صاحب! آپ ہمارے لئے بہت کوشش کر رہے ہیں' اللہ پاک آپ کو جزا دے گا' آپ نے ہمارے لئے صدر صاحب کو سفارشات لکھ کر دی ہیں۔ آپ نے سزائے موت کے ایک غیر ملکی قیدی کو معافی دلوائی تھی' ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں' وہ دن دور نہیں جب آپ کی کوشش سے پاکستان میں سزائے موت ختم ہو جائے گی' انشاءاللہ تعالیٰ۔ آپ نے جیلوں کا دورہ کیا' گوجرانوالہ جیل میں آئے' ہمارے مسائل کو دیکھا' ہم سے ہمدردی کی' اللہ پاک آپ کو اس نیک کام میں کامیابی عطا فرمائیں۔ آمین۔ آخر میں عزت مآب جناب صدر مشرف صاحب! آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت۔ وہ دن جب آپ کا جہاز رن وے پر نہیں اتر رہا تھا اور جہاز میں فیول بھی ختم ہو رہا تھا' میں مانتا ہوں آپ نڈر ہیں' بہادر ہیں' کمانڈو ہیں' بہادر فوج کے بہادر کمانڈر ہیں لیکن موت کی جو وحشت ہوتی ہے' وہ لمحہ جس میں موت اور زندگی کے درمیان بالکل نہ نظر آنے والی لکیر کا فاصلہ رہ جاتا ہے موت کا خوف۔۔۔رب قرآن میں فرماتا ہے کہ جب کھلے سمندر میں کشتی ڈولتی ہے تو موت کے خوف سے تم کس ہستی کو پکارتے ہو' جناب صدر! آپ کی زندگی میں چند سیکنڈ کیلئے وہ لمحہ آیا اور ہو کر گزر گیا' آپ بہادر تھے' آپ ثابت قدم رہے' اللہ پاک کا آپ پر خاص فضل و کرم ہوا لیکن جناب صدر' ہم کدھر جائیں' ہم اس موت کے شہر میں موت کی چکی میں موت کا انتظار کر رہے ہیں' ہمارے لئے موت کا لمحہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ ساٹھ فیصد بے گناہ موت کی چکیوں میں گل سڑ رہے ہیں' خدا کیلئے ہمارے لئے نرم گوشہ پیدا کریں' اللہ نے آپ کو اختیار دیا ہے' آپ کا ایک فیصلہ پچپن ہزار قیدیوں کی جان بخشی کا باعث بن سکتا ہے' آپ کے ایک فرمان اور ایک دستخط سے پچپن ہزار قیدیوں کی گردنیں آزاد ہو سکتی ہیں۔ جناب صدر ہم آپ سے رحم کی اپیل کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں پاکستان میں سزائے موت ختم کی جائے اور سزائے موت کو عمر قید یعنی پچیس سال میں تبدیل کیا جائے۔ جناب صدر! اگر برطانیہ کے کہنے پر ایک پاکستانی نژاد برطانوی شہری کو معافی مل سکتی ہے' انصار برنی صاحب کی سفارش پر ایک غیر مسلم کو معافی مل سکتی ہے تو ہم پاکستانیوں کو کیوں معافی نہیں مل سکتی۔ اللہ پاک آپ کا دل ہمارے لئے نرم کرے' ہم آپ سے رحم کی اپیل کرتے ہیں۔

جاوید صاحب! واقعات کے تسلسل کو سمجھانے کیلئے رب قرآن میں قلم کی قسم اٹھاتے ہیں' آپ کے پاس قلم کی طاقت ہے' آپ ہماری آواز کو ارباب اختیار تک ضرور پہنچائیں۔ یقین کیجئے اس تحریر کا ایک ایک لفظ پچپن ہزار قیدیوں کی فریاد ہے' ہم رحم کی اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے لئے عام معافی کا اعلان کیا جائے۔ اقوام متحدہ میں بھی سزائے موت کے متعلق کسی نہ کسی حد تک سزائے موت کو ختم کرنے کی مہم چل رہی ہے' آپ اس ملک کے قیدیوں پر بھی مہربانی فرمائیں' پچپن ہزار سزائے موت کے قیدیوں کے پیچھے کم از کم دس لاکھ لوگ متاثر ہو رہے ہیں' یہ سب آپ کے احسان مند رہیں گے" اسحاق ولد ناظر حسین' عارضی قیدی سزائے موت' بلاک نمبر دو' سنٹرل جیل گوجرانوالہ۔

(نوٹ: آپ نے تصویر اور مسئلے کا ایک رخ دیکھ لیا اگر کچھ احباب اس مسئلے کے دوسرے رخ پر روشنی ڈالنا چاہیں تو یہ کالم حاضر ہے)

مجھے چند روز قبل سنٹرل جیل گوجرانوالہ سے سزائے موت کے ایک قیدی نے خط لکھا' یہ خط میں دو قسطوں میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے اور اس رخ میں سزائے موت کے قیدی اسحاق نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہماری جیلوں میں بند سزائے موت کے 60 فیصد قیدی بیگناہ ہیں اور ہماری سماجی روایات اور قانون کی کمزوریوں کے باعث ہر سال سینکڑوں بے گناہ لوگ پھانسی چڑھ جاتے ہیں۔ سزائے موت کے قیدی اسحاق کا کہنا ہے حکومت کو سزائے موت ختم کر دینی چاہئے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے جبکہ دوسرے رخ کے مطابق ہماری جیلوں میں بے شمار ایسے سفاک اور ظالم لوگ بھی بند ہیں جنہوں نے پورے پورے خاندان ذبح کر دیئے تھے یا جلا کر راکھ کر دیئے تھے' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ان لوگوں کی سزا بھی معاف ہو جانی چاہئے؟ بہر حال تصویر کا پہلا رخ ہو یا دوسرا یہ ایک حساس مسئلہ ہے اور حکومت کو اس حساسیت کو مد نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔ میں اسحاق ولد ناظر حسین کا خط آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں' اس خط میں سزائے موت کے قیدی کے تمام احساسات اور جذبات موجود ہیں' آپ اس خط کی تحریر اور طرز تحریر کو محسوس کیجئے۔

"میں موت اور قیامت کے دن کے بارے میں لکھنے جا رہا ہوں' میں 12 بائی 10 کی کال کوٹھڑی سے آپ کی ملاقات پر ہوں' زندہ بندوں کا قبرستان۔ یہاں پر موت رقص کرتی ہے حالانکہ سانس کا آنا جانا زندگی کی علامت ہے مگر ہمارے نام کے ساتھ لفظ موت لکھا جاتا ہے لیکن ہمیں اپنے انجام تک پہنچنے کیلئے بارہ تا پندرہ سال لگ جاتے ہیں' ہمارے جذبات انتہا کو چھو کر بالکل ہی ختم ہو چکے ہیں' ہم نہ گرمی کی شدت میں چیختے ہیں' نہ سردی کی آمد سے خوش ہوتے ہیں' نہ خزاں میں اداس ہوتے ہیں اور نہ ہی بہار میں چہکتے ہیں' ہم مرے ہوئے زندہ انسان ہیں۔ سزائے موت کا قیدی' موت کے دروازے پر کھڑا ہو کر مقررہ تاریخ کا انتظار کر رہا ہوتا ہے پھر ایک دن موت سے ملاقات کرنے کیلئے اپنے قدموں پر چل کر تختہ دار پر جاتا ہے۔ مقدر میں پتہ نہیں کیا ہے؟ کچھ لوگ مارنے کیلئے اور کچھ زندگی بچانے کیلئے اپنی سی کوشش کرتے ہیں' یہ ان سے پوچھئے جن کے پیارے تختہ دار پر جھول جاتے ہیں' میرا ایمان ہے اللہ پاک ایک قطرہ پانی نہ برسائے اور نہ ہی ایک دانہ گندم اگائے اگر اچھے لوگ دنیا میں موجود نہ ہوں' ان ہی اللہ کے درویش بندوں میں سے ایک آپ ہیں۔ میں بڑی امید لے کر کشکول پکڑے آپ کے در پر کھڑا ہوں' امید ہے کہ آپ مجھے خالی ہاتھ نہیں بھیجیں گے۔

قتل ہو گیا؟ کیوں ہوا؟ زن' زر یا زمین ان میں سے کوئی مسئلہ ہو گا؟۔ ازل سے ابد تک یہ سلسلہ تو چلے گا' قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے تو اس کی تہہ میں معاشرتی اونچ نیچ' مال کی ہوس' اقتدار کی خواہش اور اپنے مفاد کا خیال چھپا ہے۔ زن' زر' زمین' اشتعال میں' غصہ میں' عداوت میں' نفرت میں' قتل ہو گیا۔ ٹھیک ہے' قتل کا بدلہ قتل۔ رب نے اور رب کے رسول ﷺ نے بتایا' قصاص لو' مطلب' بدلہ۔ لیکن یہاں کیا ہوتا ہے' میں آپ کو بتاتا ہوں۔ قانون کا مرحلہ آیا تو ایف آئی آر کٹی اور مقتول خاندان نے قاتل کے تمام گھر والوں کے نام لکھوا دیئے' مقدمہ عدالت میں پہنچا تو عدالت نے نہ صرف بے گناہوں کو سزا سنا دی بلکہ سزا پر عملدرآمد بھی ہو گیا اور یوں بے گناہ بندے تختہ دار پر جھول گئے' ان کا قصور صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ قاتل کے باپ ہیں' بھائی ہیں یا چچا ہیں۔ ہماری جیلوں میں 60 فیصد لوگ بے گناہ ہیں۔ آپ یقین کیجئے ہمارے قانون کی وجہ سے ہر سال سینکڑوں بے گناہ لوگ پھانسی چڑھ جاتے ہیں' قتل' قانون اور عدالت کی بات ہو گئی' اب میں آتا ہوں کہ ہم اپنے شب و روز کیسے گزارتے ہیں۔ سزائے موت کی کوٹھڑی دنیا میں دوزخ ہے' بارہ بائی دس کی کال کوٹھڑی میں دس بندے ہیں اور اسی میں رفع حاجت کیلئے دو بائی تین فٹ کا بیت الخلاء ہے' وہیں پر کھانا کھاتے ہیں اور وہیں پر بول و براز کرتے ہیں' ہم دس تالوں میں بند ہیں' ہمارے ہر طرف لوہے کے جنگلے ہیں' چوبیس گھنٹوں میں صرف تین گھنٹے کھولا جاتا ہے' سونے کیلئے قبر سے بھی کم جگہ ملتی ہے' نہ رات کو سکون ہے' نہ دن کو چین ہے' جو تھوڑی بہت نیند آتی ہے وہ لمحے ہی سکون سے گزرتے ہیں جونہی جاگ آئی تو سزائے موت کی حقیقت ایک دم سامنے آ کھڑی ہوتی ہے' کتنی اذیت ناک قبر ہے' اللہ ویری' دشمن کو بھی اس جگہ پر نہ لائے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمارے ملک میں سب سے غیر مہذب ادارہ پولیس کا ہے' جب ہماری مائیں' بہنیں ہماری ملاقات کیلئے آتی ہیں تو یہ پولیس والے کس طرح کا رویہ اپناتے ہوں گے۔ افسوس۔ بہر حال The tragedy is ڈیتھ وارنٹ آ چکے ہیں' تاریخ مقرر ہو چکی ہے' آخری ملاقات ہے' بہن اپنے بھائی کی ملاقات پر آتی ہے' جب تدبیریں ہار جائیں تو تقدیر مسکرایا کرتی ہے' گرمی بہت ہے' پسینہ آ رہا ہے' بہن بھائی کو غور سے دیکھ رہی ہے تاکہ ہمیشہ کیلئے اپنے بھائی کی شبیہہ کو

آنکھوں میں محفوظ کر لے کیونکہ کل جو صبح ہو گی' بھائی اس دنیا سے جاچکا ہو گا۔ گرمی ہے' پسینہ آرہا ہے' بھائی' بہن خاموش ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں' کوئی بات بن نہیں پارہی' بہن بھائی کے ماتھے سے پسینہ صاف کرتی ہے اور گویا ہوتی ہے' بھائی! ہم مدعیوں کے پاس گئے تھے' ان کو کہا تھا آپ کو بھی معلوم ہے ہمارا بھائی بے گناہ ہے آپ کے اصل مجرم تو بری ہو چکے ہیں' ہمارے بھائی کو معاف کر دیں لیکن بھائی! وہ پتھر دل کہہ رہے ہیں' ہمارا کیا قصور' عدالتوں نے سزا دی اور اصل مجرموں کو بری کر دیا' ہم کیا کریں؟۔ بھائی! ان لوگوں کو یہاں تک کہہ دیا کہ رب کو سجدہ ہے اس کے علاوہ جو آپ کہیں ہم کرنے کو تیار ہیں' ہمارے بھائی کو معاف کر دیں لیکن وہ نہیں مان رہے' انکاری ہیں' بھائی بہن کے آنسو کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے جس طرح میری بہن کا آنسو آنکھ سے ٹپکتا ہے اور مٹی میں گھل مل جاتا ہے اسی طرح کل میں بھی حرف غلط کی طرح مٹ جاؤں گا' مٹی میں گھل مل جاؤں گا۔ بہن رومال سے اپنے پیارے بھائی کا پسینہ ماتھے سے صاف کرتی ہے اور اس کو سنبھال لیتی ہے اور کہتی ہے کہ بھائی جب تمہاری یاد آئے گی تو میں یہ رومال نکال کر تمہارے پسینے کی خوشبو سونگھ کر تمہیں یاد کر لیا کروں گی۔ اللہ اللہ اللہ۔ ماں کا کیا حال ہو گا' وہ تو جیتے جی مر جائے گی' باپ کو اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنا پڑے گا' ملاقاتیوں کے درمیان جنگلہ حائل ہے' وہ اپنی معصوم بچی کو سینے سے بھی نہیں لگا سکتا' شریک حیات رو رہی ہے' وہ گویا ہوتا ہے' میری بچی کو قرآن سکھانا' اس کی اچھی تربیت کرنا اور اس کو بتانا تمہارے پاپا قاتل نہیں تھے' چھوٹی معصوم بچی کہتی ہے پاپا' ماما کیوں رو رہی ہے' پاپا آپ کب گھر آرہے ہیں' بیٹی! میں کل صبح ضرور گھر آجاؤں گا' بیٹی خوش ہو گئی اور کہتی ہے پاپا ''پرامز'' وعدہ۔ ہاں وعدہ۔ کل میں سکول نہیں جاؤں گی' میں سارا دن پاپا کے ساتھ کھیلوں گی' ساتھ کھانا کھاؤں گی' ٹی وی دیکھوں گی۔۔ اللہ اللہ اللہ۔۔ اتنے میں وارڈن کی گرجدار آواز آئی' بی بی وقت ختم ہو چکا ہے' بھائی' بہن' ماں' باپ رو رہے ہیں' وارڈن رو رہا ہے' میں رو رہا ہوں' آپ رو رہے ہیں' اے اللہ جیسے تیری رضا' اے اللہ جیسے تو چاہے' اے اللہ جیسے تیری مرضی۔ سارے ملاقاتی مل کر واپس جا رہے ہیں' دروازے پر کھڑے ہو کر الوداعی نظروں سے دیکھ رہے ہیں' ماں کی ہمت نہیں پڑ رہی کہ پلٹ کر اپنے لخت جگر کو دیکھ سکے' گھر والے چلے گئے۔

آپ اندازہ کریں' ابھی بندہ جیل میں زندہ ہے لیکن جنازہ پڑھنے کیلئے لوگ پہلے سے اس کے گھر آگئے ہیں' گھر میں ہر کوئی افسردہ ہے' آپ اندازہ کر سکتے ہیں اس کے کیا جذبات ہوں گے' دماغ میں ساری بیتی ہوئی زندگی کی فلم چل رہی ہے' صبح کو رخصت ہونا ہے' اے اللہ تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ پس اے اللہ مجھے معاف کر دے اور بخش دے' ساری رات سجدہ ریز ہے' بارہ کے بعد ایک اور ایک کے بعد دو اور دو کے بعد گھڑی نے تین بجائے' ایک عدد گرم پانی کی بالٹی غسل کیلئے آگئی' غسل ہو گیا' ہتھکڑی لگا کر لے جا رہے ہیں' سپرنٹنڈنٹ صاحب' جیل کا عملہ' سب افسردہ ہیں لیکن موت کا مسافر اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کیلئے ہمت جمع کر رہا ہے' جوان جا رہا ہے' کالے کپڑے سے چہرہ ڈھانپ دیا جائے گا' آخری وصیت'' ہاں۔۔ خدارا اہل اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والو! خدا کے واسطے' آپ کو رب کعبہ اور روضہ رسول کا واسطہ' سزائے موت کے قیدیوں کی حالت زار پر رحم کھاؤ' رحم کھاؤ' میں تو یہاں تک آگیا' سولی چڑھ جاؤں گا لیکن میرے بعد کوئی بے گناہ بندہ سولی نہ چڑھے' ایک دفعہ عام معافی کا اعلان کر دو' سزائے موت کو پاکستان سے ختم کر دو' سزائے موت کی سزا کو 25 سال قید میں تبدیل کر دو' کچھ کرو' بے گناہوں کو بچاؤ'' لیکن وصیت مکمل ہونے سے پہلے کالے کپڑے سے چہرہ ڈھانپ دیا گیا' رسے کو گلے میں ڈال دیا گیا' جلاد نے لیور کھینچا' بلند آواز سے کلمہ طیبہ کی آواز گونجی' رسے پر تڑپا اور چند سیکنڈ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ ان للہ وانا الیہ راجعون''۔

(جاری ہے)

گورنر ہاؤس لاہور کے باہر ہجوم جمع تھا' لوگ ہائے' ہائے' اوئے' اوئے کے نعرے لگا رہے تھے' نعروں کی آوازیں گورنر ہاؤس کی دیواریں عبور کر کے سبزہ زار تک پہنچ رہی تھیں' سبزہ زار سے ہو کر دیوان خاص تک آ رہی تھیں اور وہاں سے گورنر کے آفس تک پہنچ رہی تھیں۔ جنرل یحییٰ خان نے جنرل عتیق الرحمان کی طرف دیکھا اور غصے سے پوچھا "عتیق یہ لوگ کیا چاہتے ہیں" جنرل عتیق الرحمان حالات سے بری طرح چڑ چکے تھے' انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور وہ تاریخی فقرہ کہہ دیا جو بعد ازاں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جنرل یحییٰ خان کے ساتھ چپک گیا۔ وہ فقرہ کیا تھا؟ میرا خیال ہے اس فقرے تک پہنچنے سے پہلے اگر ہم جنرل عتیق الرحمان کے بارے میں کچھ جان لیں تو زیادہ اچھا ہو گا کیونکہ جب تک ہم جنرل عتیق الرحمان کی عظمت تک نہیں پہنچیں گے' ہم اس وقت تک اس فقرے کی کاٹ سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔

جنرل عتیق الرحمٰن نے 1940ء میں برٹش آرمی جوائن کی تھی اور دوسری جنگ عظیم میں "ملٹری کراس" حاصل کیا تھا' وہ قیام پاکستان کے بعد پاک فوج میں شامل ہوئے اور مختلف حیثیتوں میں فوج کی کمان کرتے رہے' وہ 1966ء میں لیفٹیننٹ جنرل بنا دیئے گئے' جنرل عتیق الرحمٰن 1970ء میں مغربی پاکستان کے گورنر بنائے گئے' ان دنوں پاکستان مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم تھا اور اس تقسیم کو آئینی زبان میں "ون یونٹ" کہا جاتا تھا لیکن جب جنرل یحییٰ خان پاکستان کے صدر بنے تو انہوں نے ون یونٹ توڑ دیا جس کے بعد پاکستان کے پانچ صوبے ہو گئے تھے' چار صوبے یہ ہیں جن پر آج پاکستان مشتمل ہے جبکہ پانچواں صوبہ مشرقی پاکستان تھا جو آج کل بنگلہ دیش کہلاتا ہے۔ ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد جنرل عتیق الرحمٰن پنجاب کے گورنر بنا دیئے گئے' جنرل صاحب دسمبر 1971ء تک پنجاب کے گورنر رہے' جنرل یحییٰ خان نے 1970ء میں الیکشن کرائے' یہ تاریخ کے شفاف ترین الیکشن تھے لہٰذا الیکشنوں کے نتائج جنرل یحییٰ خان کی توقع کے برعکس نکلے اور جنرل یحییٰ خان نے الیکشنوں میں کامیاب ہونے والی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات پیدا کرنا شروع کر دیئے' جنرل یحییٰ خان کی خواہش تھی وہ اُس پارٹی کو اقتدار سونپیں جو انہیں پانچ سال کیلئے صدر تسلیم کر لے لیکن دونوں پارٹیاں ان کا یہ مطالبہ ماننے کیلئے تیار نہیں تھیں چنانچہ اس کے ردعمل میں یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں تاخیر شروع کر دی۔ یہ بات بے شمار قارئین کیلئے نئی ہو گی کہ جنرل یحییٰ خان پاکستان کے پہلے حکمران تھے جنہوں نے آئین میں "ایل ایف او" کی بنیاد رکھی تھی' جنرل یحییٰ خان کی سازشوں کے باعث ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور ان اختلافات کے باعث پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ 1971ء کے آخر میں پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کے خلاف احتجاجی تحریکیں شروع ہو گئیں' پورے ملک میں جلوس نکلنے لگے' لوگ جنرل یحییٰ خان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کرنے لگے اور یہ ان دنوں کا واقعہ ہے۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا' 1971ء کا سن تھا اور لاہور کا مقام تھا' صدر جنرل یحییٰ خان لاہور کے گورنر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے' گورنر ہاؤس کے باہر ہزاروں لوگ جمع تھے اور یہ لوگ ایک ہی نعرہ لگا رہے تھے" جنرل یحییٰ ہائے ہائے' جنرل یحییٰ اوئے اوئے" ہجوم کی آوازیں گورنر ہاؤس کے اندر تک آ رہی تھیں' جنرل یحییٰ خان تھوڑی دیر تک یہ آوازیں سنتے رہے جب ان کی برداشت جواب دے گئی تو انہوں نے جنرل عتیق الرحمٰن سے پوچھا "عتیق یہ لوگ کیا چاہتے ہیں" جنرل عتیق الرحمٰن اس وقت تک ملکی صورتحال سے بری طرح چڑ چکے تھے' وہ آگے بڑھے اور جنرل یحییٰ خان کے سامنے کھڑے ہو کر بولے "سر یہ لوگ آپ کا سر چاہتے ہیں" جنرل یحییٰ خان اپنے ماتحت سے اس خوفناک جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے چنانچہ انہوں نے جنرل عتیق الرحمٰن کو گھور کر دیکھا اور غصے سے باہر جانے لگے' جنرل یحییٰ جب دروازے کے پاس پہنچے تو جنرل عتیق الرحمٰن نے انہیں روک کر ایک دوسرا تاریخی فقرہ کہا تھا' میرا خیال ہے اگر پاکستان کے تمام فوجی ڈکٹیٹر یہ فقرہ لکھ کر اپنی میز پر لگا لیتے تو شائد آج پاکستان کی تاریخ یکسر مختلف ہوتی۔ جنرل عتیق الرحمان نے جنرل یحییٰ خان سے کہا تھا "جنرل صاحب میں تاریخ کا کیڑا ہوں' میں نے تاریخ میں پڑھا ہے آج تک کوئی آمر عزت کے ساتھ اقتدار سے رخصت نہیں ہوا' میرا خیال ہے آپ بھی عزت کے ساتھ نہیں جائیں گے لیکن اس کے باوجود میری آپ سے درخواست ہے آپ اپنا اور ہمارا سر بچائیں اور عزت کے ساتھ استعفیٰ دے دیں' یہ ملک بھی بچ جائے گا اور ہم بھی"۔

مجھے یہ واقعہ کل سے شدت کے ساتھ یاد آ رہا ہے' جولائی کی چھ تاریخ کو شام پونے چھ بجے میلوڈی مارکیٹ میں ایک خودکش دھماکہ ہوا تھا' اس دھماکے میں 19 افراد جان سے گئے جبکہ 40 کے قریب لوگ شدید زخمی ہوئے۔

میں رات دیر گئے تک ٹیلی ویژن چینلز پر اس سانحے کی کوریج دیکھتا رہا' جائے حادثے پر دور دور تک خون اور انسانی اعضاء بکھرے پڑے تھے اور پولیس کے اہلکار خون کے اس جوہڑ میں کھڑے ہو کر حادثے کے شواہد اکٹھے کر رہے تھے۔ تمام چینلز کے نیوز اینکرز' نیوز کاسٹر اور نیوز رپورٹر بار بار انکشاف کر رہے تھے' خودکش حملہ آور کا سر مل گیا اور ڈاکٹر سر کی پلاسٹک سرجری کر کے اسے عوام کے سامنے جلد پیش کر دیں گے وغیرہ' وغیرہ۔ میڈیا پر جب یہ انکشاف ہو رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا ہم لوگ اس قسم کے ہر سانحے کے بعد خودکش حملہ آور کا سر کیوں تلاش کرتے ہیں؟ ہم ان لوگوں کا سر کیوں تلاش نہیں کرتے جن کی وجہ سے حالات اس نہج تک پہنچ چکے ہیں' جنہوں نے ہمیں خوف کے اس بازار میں لا کھڑا کیا ہے کہ اب ہمیں ہر اجنبی شخص' ہر گاڑی اور ہر تھیلے سے خوف آتا ہے جن کی وجہ سے اب ہم لوگ گھر سے باہر نکلتے ہوئے سو' سو بار سوچتے ہیں اور کسی اجنبی سے ملاقات نہیں کرتے' جن کی وجہ سے پاکستان کی ہر مسجد' ہر مارکیٹ' ہر بازار' ہر پارک اور ہر سرکاری عمارت خوف گاہ بن چکی ہے' جن کی وجہ سے ہم قبرستانوں کے باسی لگتے ہیں۔ میں نے دیکھا ٹیلی ویژن پر جائے حادثہ دکھائی جا رہی تھی لیکن لوگ اطمینان سے کھا پی رہے تھے' بچے ٹیلی ویژن سکرین کی طرف دیکھے بغیر اچھل کود رہے تھے' کھیل رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے اور لوگ میوزک سن رہے تھے' کیوں؟ کیونکہ ہمارے معاشرے نے دس' پندرہ بیس لوگوں کی ہلاکت اور ایک آدھ خودکش حملے کو روٹین سمجھ لیا ہے' ہم لوگ اندر سے مر چکے ہیں چنانچہ اب ہمیں بیس' تیس نعشیں دیکھ کر افسوس نہیں ہوتا' ہم خون کے جوہڑ سے بھی گزر کر ریستوران پہنچتے ہیں اور ٹشو سے ہاتھ صاف کر کے کھانا شروع کر دیتے ہیں' ہم ہر حادثے کے بعد ان لوگوں کے سر تلاش کیوں نہیں کرتے جنہوں نے معاشرے کو بے حسی کی اس قبر تک پہنچا دیا ہے' ہم ان لوگوں کے سر تلاش کیوں نہیں کرتے جو صرف اپنے اقتدار کیلئے' جو چند دن کی صدارت' وزارت عظمیٰ اور وزارت کیلئے روزانہ بیسیوں لوگوں کی موت دیکھتے ہیں اور کروٹ لے کر دوبارہ سو جاتے ہیں' ہم ان لوگوں کے سر تلاش کیوں نہیں کرتے جو بیس' بیس بم پروف' میزائل پروف اور بلٹ پروف گاڑیوں کے قافلوں میں سفر کرتے ہیں لیکن انہوں نے بے گناہ شہریوں' معصوم پولیس اہلکاروں اور کمزور سرکاری ملازموں کو مرنے کیلئے سڑکوں پر چھوڑ رکھا ہے' جو ہر سانحے' ہر حادثے کے بعد خودکش حملہ آوروں کو اسلام دشمن اور سماج دشمن قرار دیتے ہیں اور اگلے دن دوبارہ موج مستی میں لگ جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے جب تک ہم ان لوگوں کے سر تلاش نہیں کریں گے' ہم اس وقت تک اسی طرح خودکش حملہ آوروں کے سر جمع کرتے رہیں گے اور سر شماری کے اس عمل کے دوران خود بھی کسی دن نعشوں کے ڈھیر تلے دفن ہو جائیں گے۔

صدر پرویز مشرف نے چند روز قبل کراچی میں بزنس مینوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا "اگر میرے استعفیٰ سے مسائل حل ہو سکتے ہیں تو میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا" میرا خیال ہے وہ لمحہ آ چکا ہے چنانچہ ہمارے محترم صدر صاحب کو ہمارے سروں کی سلامتی کیلئے اپنی کرسی کی قربانی دے دینی چاہئے کیونکہ اگر صدر صاحب نے عہدے کی قربانی نہ دی تو یہ پورا ملک قربان گاہ بن جائے گا اور ہم میں سے ہر شخص اپنا' اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اس قربان گاہ کا طواف کر رہا ہو گا۔ صدر صاحب کو تاخیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ان کی تاخیر سے ہم سب تاخیر کا شکار ہو جائیں گے اور زندگی کی بعض تاخیریں انسان کو تاریخ کے اندھیروں میں بھٹکا دیتی ہیں اور ہم تاریخ کی اس گلی کی نکڑ پر کھڑے ہیں جس سے آگے اندھیرے ہی اندھیرے اور سر ہی سر ہیں۔ اللہ ہم پر کرم کرے۔

وکٹری سٹینڈ

ریچل ڈائیر مونٹروز امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا بزنس مین ہے‘ اس کی کمپنی ہوائی کمپنیوں کو مختلف قسم کی سروسز فراہم کرتی ہے اور یہ کمپنی امریکہ میں تیزی سے ترقی کرنے والی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے۔ مونٹروز کی کمپنی میں پانچ سو لوگ ملازم ہیں‘ مونٹروز‘ مونٹروز کی کمپنی اور اس کمپنی کی ترقی کوئی حیران کن واقعہ نہیں‘ امریکہ میں اس وقت ایسی ڈیڑھ لاکھ کمپنیاں ہیں اور یہ کمپنیاں اور ان کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو تیزی سے ترقی کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود مونٹروز اور اس کی کمپنی میں ایک دلچسپ بلکہ حیران کن بات ہے اور یہ وہ بات ہے جس کی وجہ سے یہ کالم لکھا جا رہا ہے۔ آپ اگر مونٹروز کے دفتر میں داخل ہوں تو آپ کو دفتر کی ریسیپشن پر ایک قد آدم تصویر نظر آئے گی‘ یہ کسی ائیرپورٹ پر کھینچی ہوئی تصویر ہے اور اس میں ریچل ڈائیر مونٹروز امریکہ کی ایک ہوائی کمپنی کی یونیفارم میں ملبوس ہے اور اس کے ساتھ ایک بوڑھا شخص کھڑا ہے۔ بوڑھا شخص چہرے سے بیمار دکھائی دیتا ہے‘ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا ہے‘ اس کی ایک ٹانگ پر پٹی بندھی ہے‘ بوڑھے نے اپنا ہاتھ مونٹروز کے کندھے پر رکھا ہوا ہے جبکہ مونٹروز نے اسے کمر سے تھام رکھا ہے اور دونوں کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ تصویر کے نیچے ایک سطر کا یہ کیپشن تحریر ہے ”میری زندگی کی شاندار ترین کرسمس“ اور یہ تصویر اور مونٹروز کی زندگی کی یہ شاندار ترین کرسمس اس کالم کا اصل محرک ہیں۔

ریچل مونٹروز 1998ء تک امریکہ کی ایک ہوائی کمپنی کا معمولی سا ملازم تھا‘ وہ ائیرپورٹ پر مسافروں کو بورڈنگ کارڈ جاری کرتا تھا‘ اس نے اس کام کیلئے باقاعدہ ٹریننگ لی تھی اور وہ بڑی حد تک اپنے کام سے مطمئن تھا۔ اس کا خیال تھا وہ ترقی کرتے کرتے کبھی نہ کبھی کمپنی کا ائیرپورٹ منیجر بن جائے گا اور یہ اس کے وژن کی انتہا تھی‘ وہ اس کمپنی سے ماہانہ بارہ سو ڈالر تنخواہ پاتا تھا‘ اس نے شہر میں قسطوں پر ایک سٹوڈیو فلیٹ خرید رکھا تھا اور اس کا منصوبہ تھا جب فلیٹ کی ساری قسطیں پوری ہو جائیں گی تو وہ کیتھی کے ساتھ شادی کر لے گا اور یوں اس کی زندگی ایک ڈھب پر آ جائے گی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی یہ سوچتا تھا ”کیا میں بھی زندگی میں کبھی کسی کمپنی کا مالک بن سکتا ہوں؟ کیا میرے وزیٹنگ کارڈ پر بھی کبھی چیف ایگزیکٹو کے الفاظ لکھے جائیں گے“ وہ جب بھی یہ سوچتا تھا تو اس کے منہ سے ایک آہ نکلتی تھی‘ وہ قہقہہ لگاتا تھا اور سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا لیکن پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا دن‘ ایک ایسا لمحہ آیا جب اس نے چیف ایگزیکٹوز کی دہلیز پر قدم رکھ دیا اور اس کے بعد وہ آگے سے آگے بڑھتا چلا گیا‘ یہ دن کون سا تھا؟ اور اس دن کی کیا کہانی تھی؟ یہ 1998ء کی کرسمس تھی اور رات کے نو بجے تھے‘ آخری فلائٹ جا چکی تھی‘ وہ کاؤنٹر بند کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا‘ اس نے ساڑھے دس بجے اپنے دوستوں کی کرسمس پارٹی میں شریک ہونا تھا‘ وہ کمپیوٹر بند کر رہا تھا کہ اچانک ایک بوڑھا شخص بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا کاؤنٹر پر آ گیا‘ مونٹروز نے فوراً اپنے چہرے پر سیلز مین کی مسکراہٹ سجائی اور اس کی طرف دیکھ کر بولا ”سر میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں“ بوڑھے نے نحیف آواز میں جواب دیا ”میں ڈیلاس جانا چاہتا ہوں‘ کیا مجھے اس وقت کوئی فلائٹ مل جائے گی“ مونٹروز نے فوراً انکار میں سر ہلایا اور خوش اخلاقی سے بولا ”نہیں سر! ہماری آخری فلائٹ آدھ گھنٹہ پہلے جا چکی ہے“ بوڑھے کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے چند لمحے رک کر پوچھا ”اس کے بعد کون سی فلائٹ جائے گی“ مونٹروز نے دوبارہ کمپیوٹر آن کیا اور فلائٹس کا شیڈول دیکھ کر بولا ”ہماری اگلی فلائٹ کل دن ساڑھے گیارہ بجے جائے گی“ بوڑھے نے چند لمحے سوچا اور بولا ”ٹھیک ہے میں اس فلائٹ کا انتظار کر لیتا ہوں“ مونٹروز نے اثبات میں سر ہلایا اور بوڑھے کی بکنگ میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران بوڑھے کے منہ سے سسکی نکلی‘ وہ نیچے جھکا اور کاؤنٹر کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا‘ مونٹروز گھبرا گیا اور بوڑھے کو سہارا دینے کیلئے آگے بڑھا‘ اس نے دیکھا بوڑھے کی ایک ٹانگ پر پٹی بندھی تھی اور اس پٹی کے ایک کونے سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔ مونٹروز نے بوڑھے سے پوچھا ”آپ تو مجھے شدید زخمی دکھائی دے رہے ہیں“ مونٹروز کے اس سوال پر بوڑھے نے اسے عجیب کہانی سنائی‘ بوڑھے نے بتایا دو دن پہلے اس کا بائی پاس آپریشن ہوا تھا‘ ڈاکٹروں نے بائی پاس کیلئے اس کی ٹانگ سے خون کی نالی نکالی تھی اور یہ خون ٹانگ کے اس زخم سے نکل رہا ہے۔

مونٹروز مزید پریشان ہو گیا کیونکہ اس کے سامنے جو بوڑھا بیٹھا تھا اس کا صرف دو دن پہلے بائی پاس ہوا تھا اور وہ اس نازک وقت پر ائیرپورٹ پر دھکے کھا رہا تھا۔ مونٹروز نے تھوڑی سی مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا‘ بوڑھا اپنے ایک بیٹے کے پاس مقیم تھا‘ چند دن پہلے اسے ہارٹ اٹیک ہوا‘ بیٹے نے سرکاری ہسپتال سے اس کا آپریشن کرایا‘ آپریشن کے بعد کرسمس آ گئی اور اس کے بیٹے نے کرسمس کی چھٹیاں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ فلاڈیلفیا میں منانا تھیں لیکن

بوڑھا ان چھٹیوں کے راستے میں حائل ہو گیا تھا' بیٹے نے بوڑھے کی طرف سے ہسپتال میں ایک جعلی سرٹیفکیٹ جمع کرا دیا کہ میں کرسمس اپنے دوسرے بیٹے کے پاس ڈیلاس میں گزارنا چاہتا ہوں' ہسپتال نے بوڑھے کو چھٹی دے دی' بیٹے نے گرل فرینڈ اور باپ کو گاڑی میں بٹھایا' ائر پورٹ پہنچا' باپ کو ائر پورٹ کے سامنے اتارا اور گرل فرینڈ کو ساتھ لے کر ائر پورٹ سے بھاگ گیا۔

مونٹروز یہ کہانی سن کر دکھی ہو گیا' اس نے بوڑھے سے پوچھا "تم یہ سرد رات کہاں گزارو گے" بوڑھے نے بے چارگی سے کندھے جھٹکے اور نرم آواز میں بولا "ائر پورٹ کے کسی کونے میں" مونٹروز نے دیکھا بوڑھے کا جسم بخار سے تپ رہا تھا اور ٹانگ سے تیزی سے خون رس رہا تھا' مونٹروز نے فوراً سٹریچر منگوایا' بوڑھے کو اس سٹریچر پر ڈالا اور اسے اپنے گھر لے گیا اور کرسمس کی ساری چھٹیوں میں بوڑھے کی خدمت کرتا رہا۔ وہ اسے دوائیں کھلاتا' اسے اپنے ہاتھ سے سوپ بنا کر پلاتا' وہ اسے اٹھا کر واش روم میں لے جاتا اور وہ گرم تولئے سے بوڑھے کا جسم دھوتا' وہ سات دن تک مسلسل بوڑھے کی خدمت کرتا رہا یہاں تک کہ ساتویں دن بوڑھا صحت مند ہو گیا' مونٹروز اس دوران بوڑھے کے دوسرے بیٹے کو تلاش کرتا رہا لیکن اس کا بیٹا بھی کرسمس کی چھٹیوں پر گیا ہوا تھا' سات دن بعد مونٹروز کا ڈیلاس میں بوڑھے کے دوسرے بیٹے سے رابطہ ہوا اور یوں بوڑھے کا ڈیلاس جانے کا سبب بن گیا۔ بوڑھا جب ائر پورٹ پر مونٹروز سے الوداع ہو رہا تھا تو اس نے اس وقت آسمان کی طرف دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے مونٹروز کیلئے دعا کی' یہ قبولیت کی گھڑی تھی چنانچہ بوڑھے کی دعا سیدھی آسمان پر پہنچی اور اس دعا نے مونٹروز کیلئے کامیابی کے سارے دروازے کھول دیئے۔ مونٹروز کو چند دن بعد اس کی کمپنی نے "فائر" کر دیا' وہ بے روزگار ہو گیا اور بے روزگاری کے اسی عالم میں اس نے اپنی کمپنی بنانے کا فیصلہ کیا' کمپنی بنی اور تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی' ریچل ڈائر مونٹروز جوں جوں ترقی کر رہا ہے اس کے اندر یہ بات راسخ ہوتی چلی گئی کہ یہ سب کچھ اس بوڑھے کی خدمت کا صلہ ہے۔ ریچل کا خیال ہے وہ کرسمس قبولیت کی کرسمس تھی' اس دن اس نے بوڑھے کی خدمت کی اور اللہ نے اس کے صلے میں اس پر ترقی کے سارے دروازے کھول دیئے۔

ریچل مونٹروز کی بات غلط نہیں تھی کیونکہ قدرت انسانوں کو زندگی میں دوسروں کی خدمت کے چند لمحے عنایت کرتی ہے اور اگر لوگ اس لمحے کو پکڑ لیں تو ان پر کامیابی' ترقی اور فراوانی کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں' دنیا کے تمام کامیاب لوگوں کی کامیابی اور ترقی کے پیچھے اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہوتی ہیں' کامیاب لوگ اپنے برے حالات میں کسی بوڑھے کا ہاتھ پکڑتے ہیں' کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں' کسی مریض کیلئے دواؤں کا بندوبست کرتے ہیں' چڑیا کے کسی بیمار بچے کو اٹھا کر ہیٹر کے پاس رکھ دیتے ہیں' کسی بھوکے کو ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر کھانا کھلا دیتے ہیں' سردیوں میں ٹھٹھرتے ہوئے لوگوں کو رضائی دے دیتے ہیں' برساتوں میں کسی غریب کی چھت بنوا دیتے ہیں' کسی طالب علم کو سائیکل لے دیتے ہیں اور کسی بوڑھی خاتون کی ٹانگوں کی مالش کر دیتے ہیں اور اللہ ان پر راضی ہو جاتا ہے اور یوں ان پر کامرانی اور کامیابی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ نیکی کے بغیر اللہ کسی کو رزق کی فراوانی نہیں دیتا اور یہ ہماری چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہوتی ہیں جو ہمیں بالآخر وکٹری سٹینڈ تک لے جاتی ہیں چنانچہ ہمیں زندگی میں کبھی کسی چھوٹی نیکی کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہماری کوئی بھی چھوٹی سی نیکی ہمیں ریچل مونٹروز بنا سکتی ہے' ہمیں وکٹری سٹینڈ تک لے جا سکتی ہے۔

نعش جوتوں اور کپڑوں سے پہچانی گئی' سیاہ رنگ کے بوٹ کی آب و تاب ابھی تک باقی تھی' تلوے کے ایک کونے میں مگر مچھ کی تصویر بھی موجود تھی اور بکل کی سنہری نکل بھی قائم تھی' کمپنی کا دعویٰ سچ نکلا' جوتوں کی شان و شوکت تیس برس بعد بھی قائم رہی' سوئٹزر لینڈ کی کمپنی دنیا کے صرف ایک ہزار خاندانوں کیلئے جوتے بناتی تھی' جوتوں کے تلوے نیوزی لینڈ کی گائے کے چمڑے سے بنائے جاتے تھے' یہ سنہری چمڑے اور نیلے سینگوں والی گائے ہے اور دنیا کے کسی دوسرے خطے میں گائے کی یہ قسم نہیں ملتی۔ جوتے کی "ٹو" برازیل کے مگر مچھوں کی جلد سے بنائی جاتی ہے' جوتے کا "کوا" افریقہ کے سیاہ ہاتھیوں کے کانوں کے چمڑے سے تیار کیا جاتا تھا اور جوتے کے اندر ہرن کے نرم چمڑے کی تہ چپکائی جاتی تھی اور پیچھے رہ گیا دھاگہ تو ان جوتوں کیلئے بلٹ پروف جیکٹ میں استعمال ہونے والے دھاگے استعمال کئے جاتے تھے۔ کمپنی کا دعویٰ تھا پچاس برس تک جوتے کی پالش خراب نہیں ہوتی جبکہ مٹی میں دفن ہونے کے ایک سو سال بعد تک جوتے کی آب و تاب برقرار رہتی ہے۔ افغانستان کا بادشاہ ظاہر شاہ اس کمپنی کا ممبر تھا' ظاہر شاہ جلاوطن ہوا تو سردار داؤد نے اس کمپنی کی ممبر شپ لے لی اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ اس کمپنی کا جوتا استعمال کیا یہاں تک کہ جب 1978ء کو اسے خاندان کے ساتھ قتل کر دیا گیا اور قتل کے بعد اس کی نعش جیپ کے ساتھ باندھ کر کابل شہر میں گھسیٹی گئی تو اس وقت بھی اس نے یہی جوتا پہن رکھا تھا۔ وہ ایک بدقسمت حکمران تھا' اسے مرنے کے بعد غسل' کفن اور جنازہ نصیب نہیں ہوا تھا' لوگوں نے دو بڑی بڑی قبریں کھودی تھیں اور اسے اس کے خاندان کے 30 افراد کے ساتھ ان میں سے کسی ایک قبر میں دفن کر دیا تھا' اس کے خاندان کے کسی فرد کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تھا۔ وہ تیس برس تک اس قبر میں پڑا رہا لیکن 26 جون 2008ء کو ایک اتفاقی کھدائی کے دوران یہ دونوں قبریں دریافت ہوئیں اور یوں جوتوں کے باعث اس کی نعش شناخت کر لی گئی' یہ جوتوں کے ذریعے شناخت ہونے والی دنیا کی پہلی نعش تھی اور دنیا کو پہلی بار جوتوں نے بتایا ان کا مالک جنرل سردار محمد داؤد خان تھا۔

سردار محمد داؤد خان افغانستان کے شاہی خاندان محمد زئی سے تعلق رکھتا تھا' وہ 18 جولائی 1909ء کو پیدا ہوا' اس نے ابتدائی تعلیم جلیلی سکول کابل' ثانوی تعلیم امینیہ کالج اور اعلیٰ تعلیم فرانس سے حاصل کی' وہ سینٹ کرائی ملٹری اکیڈمی کا گریجوایٹ تھا' اس نے واپسی پر افغان فوج جوائن کی اور 24 برس کی عمر میں میجر جنرل بنا دیا گیا۔ وہ 1932ء میں محض 25 سال کی عمر میں صوبہ ننگرہار کا جی او سی بن گیا' 1935ء میں وہ قندھار کا جی او سی بنا اور اسی سال اسے لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر پروموٹ کر دیا گیا' وہ دنیا کا کم عمر ترین جنرل تھا۔ 1946ء میں اسے یونیفارم کے ساتھ وزیر دفاع بنا دیا گیا' وہ پیرس' برن اور برسلز کیلئے سفیر بھی بنایا گیا اور اسی دوران افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ نے اسے اپنی ہمشیرہ شہزادی زینب کا رشتہ بھی دے دیا۔ وہ 1952ء میں شاہ کے ذاتی ایلچی کی حیثیت سے سوویت یونین کے صدر مارشل سٹالن کی تدفین کیلئے ماسکو گیا اور یہاں سے اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ وہ روسی حکمرانوں اور کے جی بی کا منظور نظر بنا اور اس نے اس کی پشت پناہی کا آغاز کر دیا۔ ستمبر 1953ء کو شاہ نے اسے افغانستان کا وزیراعظم بنا دیا' وہ دنیا کا یونیفارم میں پہلا وزیراعظم تھا' وہ وزیراعظم بھی تھا' وزیر دفاع بھی اور آرمی چیف بھی۔ اس نے وزیراعظم کا حلف اٹھاتے ہی اپنے بھائی سردار محمد عظیم کو افغانستان کا وزیر خارجہ بنا دیا اور آہستہ آہستہ پورے ملک کے اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے' وہ سوویت یونین کا فکری حلیف تھا چنانچہ اس نے روس کے کہنے پر پاکستان میں پشتونستان کی تحریک شروع کرا دی۔ ظاہر شاہ سردار داؤد کے عزائم اور طالع آزما فطرت کو پہچان گیا چنانچہ اس نے 3 مارچ 1963ء کو اس سے استعفیٰ لے لیا جس کے بعد سردار داؤد نے شاہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ شاہ کو اطلاع ملی تو اس نے یکم اکتوبر 1964ء کو افغانستان کا آئین بدل دیا جس کی رو سے اب افغانستان کے شاہی خاندان کا کوئی رکن سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ شاہ نے سردار داؤد کا راستہ روکنے کا بندوبست تو کر دیا لیکن وہ یہ بھول گیا دنیا کا مضبوط سے مضبوط ترین آئین بھی فوج کا راستہ نہیں روک سکتا چنانچہ 17 جولائی 1973ء کو ظاہر شاہ علاج کے سلسلے میں اٹلی گیا اور پیچھے سے سردار داؤد نے شاہ کا تختہ الٹ دیا اور ملک میں مارشل لگا دیا' اس نے 1964ء کا آئین منسوخ کیا' افغانستان کو جمہوریہ افغانستان کا نام دیا اور بیک وقت افغانستان کا صدر' وزیراعظم اور سنٹرل کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھال لیا' اس نے 28 جولائی کو پارلیمنٹ بھی توڑ دی اور وہ ملک کا مطلق العنان حکمران بن گیا۔

وہ ایک روشن خیال اور اعتدال پسند شخص تھا' اس نے اقتدار سنبھالتے ہی ملک میں پردے اور داڑھی پر پابندی لگا دی'

اس نے زنانہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکرٹ لازمی قرار دے دی' مسجدوں پر تالے لگوادیئے اور ملک کے آٹھ بڑے شہروں میں شراب خانے اور ڈسکو کلب بنوائے' سردار داؤد کے دور میں کابل دنیا بھر کے سیاحوں کیلئے عیاشی کا اڈہ بن گیا۔ اس دور میں ''یورپ'' کابل سے شروع ہوتا تھا' کابل کے بعد تہران عیاشی کا دوسرا اڈہ تھا' استنبول تیسرا اور اس کے بعد پورا مشرقی یورپ عیاشوں پر کھل جاتا تھا۔ سردار داؤد نے پورے ملک میں سینکڑوں کی تعداد میں عقوبت خانے بھی بنا رکھے تھے' خفیہ اداروں کے اہلکار اس کے مخالفین کو دن دیہاڑے اٹھا لے جاتے تھے اور اس کے بعد کسی کو ان کا نام اور پتہ تک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سردار داؤد کے زمانے میں تیس ہزار کے قریب لوگ ''مسنگ پیپل'' کہلائے اور ان لوگوں کے لواحقین کو بعد ازاں ان کی قبروں کا نشان تک نہ ملا۔ جنوری 1974ء کو اس کے خلاف ایک چھوٹی سی بغاوت ہوئی لیکن اس نے تمام باغیوں کے سر قلم کرادیئے' ایک طرف اس کے مظالم جاری تھے اور دوسری طرف وہ عالمی میڈیا کو ایک جمہوریت پسند اور روشن خیال لیڈر کا چہرہ پیش کر رہا تھا۔ اس نے روس کے ساتھ ساتھ مغرب کے ساتھ بھی تعلقات استوار کئے' 27 فروری 1977ء کو اس نے ملک کو نیا آئین دیا' ملک میں صدارتی طرز حکومت اور یک جماعتی نظام قائم کر دیا اور یہ وہ وقت تھا جب اس کا اعتماد آسمان کو چھونے لگا' اس نے مارچ 1977ء کو نئی کابینہ بنائی اور اس کابینہ کے سارے عہدے اپنے خاندان اور دوستوں میں تقسیم کر دیئے' اس وقت تک ملک میں اس کے خلاف لاوا پک چکا تھا چنانچہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں خلق اور پرچم پارٹی اس کی مخالف ہو گئیں' ملک میں ہنگامے' سیاسی قتل و غارت گری اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ وہ ظالم انسان تھا لہٰذا اس نے اپنی عادت کے مطابق مخالفین کو قتل کرانا شروع کر دیا' اس نے 17 اپریل 1978ء کو اپنے سب سے بڑے مخالف کمیونسٹ لیڈر میر اکبر خان کو قتل کرادیا اور یہ وہ قتل تھا جس نے سردار داؤد خان کے خلاف نفرت کو ایک نقطے پر جمع کر دیا اور میر اکبر کے قتل کے محض دس دن بعد 27 اپریل کو سردار داؤد کے خلاف فوجی بغاوت ہوئی اور فوج نے اسے' اس کے بھائیوں' بیویوں' بیٹیوں' پوتوں اور پوتیوں کو گولی ماردی' اس بغاوت میں اس سمیت اس کے خاندان کے 30 افراد ہلاک ہو گئے' داؤد کی نعش کو جیپ کے ساتھ باندھا گیا اور کابل شہر میں گھسیٹا گیا' داؤد کی نعش جس جگہ سے گزرتی تھی لوگ اس پر تھوکتے تھے اور اسے ٹھڈے مارتے تھے' شام کو جب نعش کا سفر مکمل ہوا تو اسے جنازے' غسل اور کفن کے بغیر خاندان کی دوسری نعشوں کے ساتھ اجتماعی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ یوں سردار محمد داؤد خان کی نعش 30 برس تک ایک گمنام قبر میں پڑی رہی لیکن پھر 26 جون 2008ء کو کھدائی کے دوران کابل شہر میں دو اجتماعی قبریں دریافت ہوئیں' دونوں قبروں میں سولہ' سولہ نعشیں تھیں' ان نعشوں میں سے ایک نعش کے پاؤں پر مگرمچھ کی کھال کا جوتا تھا' جوں ہی جوتے پر پڑی خاک جھاڑی گئی اس کی پالش چمکنے لگی اور یوں اس جوتے نے یہ راز فاش کر دیا اور سردار داؤد کی نعش سامنے آ گئی۔

میں نے یہ خبر پڑھی تو میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ کا نظام بھی کیسا عجیب ہے' وہ جب کسی ظالم سے نفرت کرتا ہے تو اس کی قبر کی بھی بخشش نہیں ہوتی اور ظالم کے مرنے کے 30 برس بعد اس کی سزا ختم نہیں ہوتی' بے شک ظالم پورے ملک کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن یہ لوگ وقت کو شکست نہیں دے سکتے۔ یہ اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے اور جب اللہ کسی سے نفرت کرتا ہے وہ جوتوں کو اس کی نعش کا حوالہ اور قبر کا کتبہ بنا دیتا ہے۔ وہ اسے مرنے کے بعد بھی مرنے نہیں دیتا۔

وہ واپس مڑا' آہستہ آہستہ چلتا ہوا الباسو کے قریب پہنچا' الباسو گھبرا گیا' وہ اس کے قریب پہنچ کر اس کے کان پر جھکا اور آہستہ سے بولا "ہمارے پاس کیلے ہیں' ہم ثابت کر دیں گے کیلا توپ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے" وہ مڑا' دروازے کی طرف بڑھا' ایک لمحے کیلئے رکا' جنرل کی طرف ہاتھ لہرایا اور باہر نکل گیا' پورچ میں اس کے گارڈز کھڑے تھے' وہ گاڑی میں بیٹھا اور عمارت سے باہر نکل گیا۔ وہ ہنڈورس میں کیلوں کا سب سے بڑا بیوپاری تھا' وہ چھٹی نسل سے اس کاروبار کے ساتھ وابستہ تھا' اس کے پردادا کا پردادا کولمبس کے ساتھ ہنڈورس آیا تھا اور ملک میں ہزاروں ایکڑ پر پھیلے کیلے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا' وہ تاجرانہ ذہنیت کا مالک تھا' اس نے فوراً بھانپ لیا تھا یہ کیلے مستقبل میں سونے کی کان ثابت ہوں گے چنانچہ اس نے کیلے کے جنگلات پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

یہ ایک طویل داستان ہے اور میرا خیال ہے جب تک آپ اس داستان کا پس منظر نہیں جانیں گے اس وقت تک آپ کو اس کھیل کی سمجھ نہیں آئے گی۔ میں سب سے پہلے آپ کو ہنڈروس کے بارے میں بتاتا ہوں' ہنڈورس لاطینی امریکہ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے' یہ ملک گھنے جنگلات' صاف پانی اور کیلے کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے' یہ ملک کولمبس نے 1502ء میں دریافت کیا تھا اور 1525ء میں ہسپانوی جہاز رانوں نے ہنڈورس میں پہلی کالونی بنائی تھی۔ 1525ء کے بعد سپین سے یورپی باشندوں کے جہاز ہنڈورس آتے رہے اور یہاں آباد ہوتے رہے' یہ ہسپانوی لوگ مقامی آبادی میں "مکس" ہو گئے اور یوں آہستہ آہستہ یہاں ایک نئی نسل نے جنم لے لیا۔ 1800ء کے شروع میں ہنڈورس پر ہسپانویوں کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا جس کے بعد 1838ء میں ہنڈورس کے لوگوں نے سپین سے آزادی حاصل کر لی۔ 1901ء میں اس ملک میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا اور یہ واقعہ آگے چل کر سفارت کاری کی ایک خوبصورت اصطلاح بن گیا تھا۔ دنیا میں سب سے زیادہ کیلے ہنڈورس میں پیدا ہوتے تھے اور اس وجہ سے یہ ملک اس وقت تک دنیا میں کیلوں کا سب سے بڑا ایکسپورٹر تھا' انیسویں صدی میں ہنڈورس میں فروٹس کی دو بڑی کمپنیاں تھیں' ایک کا نام یونائیٹڈ فروٹ تھا جبکہ دوسری کمپنی سٹینڈرد فروٹ کے نام سے جانی جاتی تھی' یہ دونوں کمپنیاں سالانہ اربوں ڈالرز کے کیلے اور فروٹ شمالی امریکہ' جنوبی امریکہ' کینیڈا اور یورپ ایکسپورٹ کرتی تھیں' 1901ء میں کسی تجارتی لین دین کی وجہ سے ان دونوں کمپنیوں میں لڑائی ہوئی اور یہ لڑائی آگے چل کر جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت الباسو نام کا ایک جنرل ہنڈورس میں بارسوخ سمجھا جاتا تھا' یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کا مالک الباسو سے ملا اور اس سے مدد مانگی لیکن الباسو نے جواب دیا "تم لوگ تاجر ہو جنگ لڑنا تم لوگوں کے بس کی بات نہیں' تم لوگ یہ سلسلہ فوراً بند کر دو" یونائیٹڈ کمپنی کے مالک نے جواب دیا "جب انا درمیان میں آ جاتی ہے تو تاجر کو سپاہی بنتے دیر نہیں لگتی" الباسو نے اس کے جواب میں اس سے کہا "لڑنے کیلئے ہتھیار اور حوصلہ چاہئے اور تمہارے پاس کیا ہے" تاجر اس جواب پر غصے میں آ گیا اور اس کے بعد اس نے جنرل کو للکار کر کہا "ہمارے پاس کیلے ہیں اور ہم ثابت کر دیں گے کیلا توپ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے" یونائیٹڈ کمپنی کے مالک نے اتنا کہا اور واپس جا کر کیلے کو توپ کی شکل دینا شروع کر دی' یونائیٹڈ فروٹ کمپنی نے سیاست میں قدم رکھ دیا' اس نے سب سے پہلے ہنڈورس کے تمام وزراء خریدے' پھر وزیراعظم کو اپنا ملازم رکھ لیا' پھر اپنی مرضی کا پولیس چیف لگا دیا' پھر بدمعاشوں کا گینگ بنایا اور اسے ہنڈورس کی فوج کا نام دے دیا اور پھر اپنے منشیوں کو جج بنا دیا' یوں پورے ملک کے طاقتور اداروں پر قبضہ کر لیا۔ یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے اس سیاسی اثر رسوخ سے سٹینڈرڈ فروٹ کمپنی کو نقصان پہنچنے لگا چنانچہ اس نے امریکہ اور یورپ کی ان کمپنیوں سے رابطہ کیا جن کو وہ کیلے فروخت کرتی تھی' یورپ اور امریکہ کی فروٹس کمپنیوں نے سٹینڈرڈ فروٹ کمپنی کو مالی' سفارتی اور فوجی مدد دینا شروع کر دی' یوں ہنڈورس میں دونوں فروٹس کمپنیوں کے درمیان طاقت کی لڑائی شروع ہو گئی' یہ جنگ جب امریکہ کے مشہور لکھاری او ہنری کے نوٹس میں آئی تو اس نے دنیا کی اس عجیب و غریب جنگ پر ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں اس نے ہنڈورس کو بنانا ری پبلک کا نام دے دیا اور وہ دن ہے اور یہ دن ہے' دنیا نہ صرف ہنڈورس کو بنانا ری پبلک کہتی ہے بلکہ ہر وہ ملک جو سیاسی طور پر غیر مستحکم ہو' جس کی پارلیمنٹ بے اختیار ہو' جس میں مافیا حکمرانی کرتے ہوں' جس میں سرکاری افسر اور ادارے حکمران کلاس کے ذاتی ملازم سمجھے جاتے ہوں' جس کی عدالتیں سیاستدانوں کی تابع ہوں' جس کے الیکشنز میں دھاندلی ہوتی ہو' جہاں ڈکٹیٹر شپ ہو' جس میں کرپشن عام ہو' جس میں سرکاری ملازمتیں رشتے داروں اور دوستوں میں تقسیم ہوتی ہوں' جس کی سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو' جس میں فوج پارلیمنٹ سے زیادہ مضبوط ہو' جس میں جرنیل اقتدار پر قبضے کرتے رہتے

ہوں‘ جس میں قانون اور انصاف بکتا ہو‘ جس میں امن وامان نہ ہو‘ جس میں بیرونی طاقتوں کا اثرور سوخ ہو‘ جس کی اکانومی ورلڈ بینک‘ آئی ایم ایف اور دوسرے ممالک کے زیر اثر ہو اور جس میں اقتدار کرپٹ تاجروں‘ نااہل سیاستدانوں اور مفاد پرست جرنیلوں کے دائرے میں گھومتا ہو‘ اس ملک کو بھی بنانا ری پبلک کہا جاتا ہے۔

پاکستان کو 27 دسمبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پہلی بار یورپی پریس نے بنانا ری پبلک لکھنا شروع کیا تھا‘ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس کے جواب میں 22 جنوری 2008ء کو صدر پرویز مشرف نے غیر ملکی صحافیوں کے ساتھ گفتگو کی تھی اور اس گفتگو کے دوران صدر پرویز مشرف نے دعویٰ کیا تھا ”پاکستان بنانا ری پبلک نہیں‘ ہم ایک خود مختار‘ امن پسند اور غیرت مند قوم ہیں“ مجھے اچھی طرح یاد ہے صدر مشرف کے اس اعلان پر وہاں موجود تمام غیر ملکی ہنس پڑے تھے‘ مجھے اس وقت غیر ملکی صحافیوں کی ہنسی پر حیرت ہوئی تھی لیکن پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا‘ مجھے اس ہنسی کی وجہ معلوم ہوتی چلی گئی اور آج جون کے آخری لمحات میں بیٹھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے پاکستان میں نہ صرف بنانا ری پبلک کے تمام آثار موجود ہیں بلکہ ہم بڑی تیزی سے بنانا ری پبلک بن رہے ہیں۔ ہمارے پاس پارلیمنٹ ہے لیکن اس کے پاس کوئی اختیار نہیں‘ ہمارے پاس صدر ہیں لیکن وہ غیر مقبول ہیں‘ ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی شوکت عزیز کا نیا ایڈیشن ہیں‘ شوکت عزیز سانس لینے سے قبل ایوان صدر کی طرف دیکھتا تھا اور گیلانی صاحب پانی بھی زرداری ہاؤس کی طرف منہ کر کے پیتے ہیں‘ ہمارے پاس چیف منسٹرز ہیں لیکن بے اختیار ہیں‘ سپریم کورٹ ہے لیکن ملک میں دو چیف جسٹس ہیں‘ فوج ہے لیکن امریکی جہاز پاکستان کی حدود میں آکر ہمارے فوجی جوانوں کو شہید کر جاتے ہیں‘ ہمارے ملک میں پولیس ہے لیکن مجرم کھلے پھر رہے ہیں‘ کھمبے ہیں لیکن بجلی نہیں اور دفتر ہیں لیکن ان میں کام نہیں ہو رہا۔ آپ ہماری کمزوری کی حد ملاحظہ کیجئے‘ پچھلے دنوں افغانستان کے صدر حامد کرزئی نے بھی پاکستان میں فوجیں اتارنے کی دھمکی دے دی تھی۔ آپ ذرا سوچئے افغانستان اور حامد کرزئی کون ہیں؟ حامد کرزئی دنیا کے کمزور ترین حکمران ہیں‘ ان کی حکومت کابل میں صرف دس کلومیٹر تک محدود ہے جبکہ افغانستان دنیا کا واحد ملک ہے جسے پاکستان امداد دیتا ہے۔ افغانستان کے عوام پاکستانی آٹا کھاتے ہیں لیکن آپ ہماری کمزوری کی حد ملاحظہ کیجئے افغانستان بھی اب ہمیں جنگ کی دھمکی دے رہا ہے۔ ہمارے لئے اس سے بڑی شرمندگی بلکہ ذلت کی بات کیا ہو گی؟۔ میں جب ان حالات کو دیکھتا ہوں اور اس کے بعد ہنڈورس میں بننے والی بنانا ری پبلک دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر ترس آتا ہے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ہم اگر بنانا سٹیٹ نہیں ہیں تو ہم اس سے زیادہ دور بھی نہیں ہیں۔

آپ فاٹا اور صوبہ سرحد کے تازہ ترین آپریشن کو لے لیجئے‘ اس آپریشن سے قبل یہ خبریں آنا شروع ہوئیں طالبان پشاور شہر کی سرحدوں تک پہنچ چکے ہیں‘ پشاور شہر سے اوسطاً روزانہ 17 کے قریب لوگ اغوا ہوتے ہیں اور بھاری تاوان دے کر رہا ہوتے ہیں‘ نامعلوم لوگوں نے سرکاری عمارات‘ سکولوں اور دکانوں کو آگ لگانا شروع کر دی اور حکومتی مشینری معطل ہو کر رہ گئی۔ ان خبروں کے بعد حکومت نے آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کو صوبہ سرحد کا ”چارج“ دے دیا جس کے بعد پیرا ملٹری فورسز نے فاٹا میں آپریشن شروع کر دیا۔ اس آپریشن کے بعد یہ سوال پوچھنے میں کوئی ہرج نہیں کہ کیا ہم حقیقتاً بنانا ری پبلک کی سرحدوں پر کھڑے ہیں‘ کیا یہ ملک مکمل طور پر مافیاز کے قبضے میں چلا جائے گا اور جس کے پاس جتنی طاقت ہو گی وہ ملک کے اتنے حصے پر قبضہ کر لے گا اور اپنا سکہ چلانا شروع کر دے گا اور خدانخواستہ وہ وقت آ گیا تو حکمران تو باہر چلے جائیں گے لیکن ہم لوگ کہاں جائیں گے؟ میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میری روح تک کانپ جاتی ہے۔ کاش اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کے دل میں رحم ڈال دے اور یہ آگ سے کھیلنا بند کر دیں‘ یہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کر لیں ورنہ ہمیں 1971ء کی پوزیشن پر جاتے دیر نہیں لگے گی کیونکہ جس طرح ہنڈورس کے تاجروں کے پاس کیلے اور مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کے پاس پٹ سن کی طاقت تھی بالکل اسی طرح قبائلی علاقوں کے پاس پوست کی ”دولت“ موجود ہے اور یہ دولت جنگ لڑنے اور جیتنے کیلئے کافی ہے۔

یہ 27 جون کی شام تھی اور 2008ء کا سن'

اس نے کاغذ پر دستخط کئے' فائل بند کی اور کاغذوں کا پلندہ اپنی سیکرٹری کے ہاتھ میں دے دیا' اس کے سٹاف کے پچاس افراد نے تالیاں بجائیں اور اس کی زندگی کا ایک باب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا' اس کی دائیں آنکھ کے کونے سے پانی کا ایک قطرہ ابھرا' قطرہ ایک لمحہ کیلئے رکا' لکیر بنا اور ٹھوڑی پر آ کر تھم گیا' اس نے فوراً آنکھوں پر ٹشو رکھ لیا' سامنے مائیکرو سافٹ کا چیف ایگزیکٹو سیٹو بالمر بیٹھا تھا' اس نے بل گیٹس کو روتے ہوئے دیکھا تو اس کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی اور یوں پورا دفتر آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گیا' وہ زندگی میں صرف تین بار رویا تھا' پہلی بار اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے جب وہ ہاورڈ یونیورسٹی کا ایک نالائق طالب علم تھا' ایک بار اس کا استاد اس کے ساتھ ناراض ہوا اور اس نے اسے ڈانٹ کر کہا ''بل تم میری بات کان کھول کر سن لو' تم زندگی میں زیادہ سے زیادہ ٹرک ڈرائیور بن سکتے ہو'' پوری کلاس نے قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس دن اس نے ہاورڈ یونیورسٹی چھوڑ دی' شام وہ اپنے جگری دوست پال ایلن سے ملا اور اس نے اس کو دعوت دی ''آؤ پال ہم اس دنیا کی بنیاد رکھیں جو آج تک صرف ہمارے ذہن میں تھی'' پال ایلن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ 28 اکتوبر 1955ء کو واشنگٹن ریاست کے شہر سیاٹل میں پیدا ہوا' اس کے والد وکیل تھے' سارا گھرانہ پڑھا لکھا اور معزز تھا لیکن بل پڑھائی میں کمزور تھا' اس میں یکسوئی نہیں تھی' اس کی سوچیں منتشر ہو جاتی تھیں لہٰذا اس کے والدین اس کی وجہ سے پریشان رہتے تھے' اس کے والد کی خواہش تھی وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لے لیکن یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا' اس کے والد کو شدید صدمہ پہنچا لیکن بل مطمئن تھا' اس کا خیال تھا ہارورڈ یونیورسٹی کسی نہ کسی دن اپنے اس نالائق طالب علم پر فخر کرے گی۔ آنے والے دنوں میں اس کی بات سچ ثابت ہوئی اور ہارورڈ یونیورسٹی نے نہ صرف اپنے گیٹ پر اس کے نام کی تختی لگا دی تھی بلکہ خود کو بل گیٹس کی یونیورسٹی کہلانے لگی لیکن یہ بہت بعد کی بات تھی' ہم ابھی 1975ء میں ہیں' 1975ء میں اس نے اپنے دوست پال ایلن کے ساتھ مل کر دنیا کی پہلی سافٹ ویئر کمپنی بنائی' اس کمپنی کا نام انہوں نے ''مائیکرو سافٹ'' رکھا' لوگ اس کے آئیڈیاز اور کمپنی کے نام دونوں پر ہنستے تھے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری' وہ کام کرتا چلا گیا یہاں تک کہ 1979ء تک کمپنی نے پر پرزے نکال لئے اور وہ ٹھیک ٹھاک امیر ہو گیا لیکن ابھی وہ اس کامیابی سے دور تھا جو بچپن سے اس کے ذہن پر دستک دیتی آ رہی تھی' 1980ء میں سٹیو بالمر نے کمپنی جوائن کی اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے مائیکرو سافٹ واشنگٹن ریاست کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی اور اس پر دولت بارش کی طرح برسنے لگی یہاں تک کہ 1994ء میں وہ صرف 39 برس میں دنیا کا امیر ترین شخص بن گیا' وہ اتنا مشہور ہو گیا کہ امریکی صدر یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گیا ''وی آر دی نیشن آف بل گیٹس'' یہ ہارورڈ یونیورسٹی کے اس نالائق طالب علم کا پہلا اعزاز تھا اور یہ اعزاز پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' یہ دوسری بار تھی جب وہ دروازہ بند کر کے رو پڑا تھا۔ جی ہاں اس شخص کا نام بل گیٹس ہے اور یہ پچھلے 14 برس سے دنیا کا امیر ترین شخص چلا آ رہا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا واحد شخص ہے جو 39 برس کی عمر میں دنیا کا امیر ترین شخص بنا اور اس نے مسلسل 14 سال تک یہ اعزاز برقرار رکھا' مائیکرو سافٹ دنیا کی پانچ بڑی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے' اس میں اس وقت 63 ہزار 5 سو 64 لوگ ملازم ہیں' اس کا کاروبار 102 ممالک تک پھیلا ہے جبکہ یہ کمپنی اب تک دنیا کے ایک لاکھ 28 ہزار لوگوں کو ارب پتی بنا چکی ہے' مائیکرو سافٹ کے ملازمین اوسطاً 89 ہزار 6 سو ڈالر سالانہ تنخواہ لیتے ہیں' مائیکرو سافٹ کے پانچ ڈائریکٹر ہیں اور بل گیٹس کے پاس سب سے زیادہ شیئرز ہیں' وہ 97 کروڑ 74 لاکھ' 99 ہزار 3 سو 36 شیئرز کا مالک ہے اور پچھلے 15 برسوں میں میڈیا نے بل گیٹس کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ کوریج دی' وہ دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے' لوگ اس کے ساتھ ہاتھ ملانا اور اس کے ساتھ تصویر کھنچوانا اعزاز سمجھتے ہیں جبکہ اسے دنیا کے 35 ممالک میں سربراہ مملکت کا پروٹوکول دیا جاتا ہے' بل گیٹس نے 15 جون 2006ء کو اعلان کیا تھا وہ جولائی 2008ء کو مائیکرو سافٹ چھوڑ دے گا اور باقی زندگی فلاح عامہ کے کاموں کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا وہ یکم جولائی 2008ء سے اپنا سارا وقت فلاح عامہ کیلئے صرف کرے گا' اس اعلان کے بعد وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص بن گیا تھا' اس سے پہلے دنیا میں عورتوں کیلئے تخت اور تاج چھوڑنے والے بے شمار لوگ تھے' دنیا میں مہاتما بدھ جیسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سکون کیلئے اقتدار تیاگ دیا تھا لیکن یہ تاریخ کا پہلا شخص تھا جس نے عام لوگوں کیلئے دنیا کی سب سے بڑی کمپنی چھوڑنے کا اعلان کیا تھا اور اس نے باقی زندگی بل اینڈ میلینڈا

گیٹس فاؤنڈیشن کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

بل گیٹس نے اپنی بیوی میلینڈا کے ساتھ مل کر جنوری 2000ء میں فلاح عامہ کی ایک فاؤنڈیشن بنائی تھی اس کا نام ''بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن'' تھا' اس وقت یہ دنیا کا ویلفیئر کا سب سے بڑا ادارہ ہے' فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹس میں 29 بلین ڈالر ہیں یہ کتنی بڑی رقم ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے بجٹ سے لگا لیجئے پاکستان کا ٹوٹل بجٹ 12 بلین ڈالر ہوتا ہے' بل گیٹس کی یہ فاؤنڈیشن پوری دنیا میں صحت' تعلیم' لائبریریوں اور کمپیوٹر کی تربیت کے لئے کام کرتی ہے' یہ فاؤنڈیشن ہر سال غریب ممالک کے ذہین طالب علموں کو ایک ارب ڈالر کے وظائف دیتی ہے' یہ تنظیم غیر امریکی لائبریریوں کو ایک ملین ڈالر کا ایوارڈ دیتی ہے' فاؤنڈیشن ہر سال تیسری دنیا کے سو ذہین طالب علموں کو اپنے خرچ پر کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم دلاتی ہے' فاؤنڈیشن ڈیوک یونیورسٹی کی ہر کلاس کے دس ذہین طالب علموں کو وظیفے دیتی ہے' بل گیٹس نے پندرہ ملین ڈالر سے کمپیوٹر ہسٹری میوزیم بنایا' اس نے چاول کی نئی قسم دریافت کرائی' وہ ہر سال دنیا کے کروڑوں بچوں پولیو ویکسین فراہم کرتا ہے' اس کی فاؤنڈیشن ایڈز کا علاج دریافت کر رہی ہے اور بل گیٹس کی یہ فاؤنڈیشن سات سال سے پوری دنیا میں کام کر رہی ہے' بل گیٹس نے اعلان کیا وہ جولائی 2008ء کو مائیکروسافٹ سے فاؤنڈیشن کے دفتر شفٹ ہو جائے گا اور اپنی باقی زندگی لوگوں کی صحت اور تعلیم کے لئے وقف کر دے گا' اس کا کہنا تھا وہ انتقال سے قبل اپنے بچوں کو صرف ایک ایک ملین ڈالر دے گا اور اپنی باقی ساری دولت دنیا کے ضرورت مندوں کے حوالے کر دے گا' اس کا کہنا تھا یہ دولت ضرورت مندوں کی امانت ہے اور وہ یہ امانت ان لوگوں کو لوٹا کر واپس جائے گا' بل گیٹس کے اس اعلان کے بعد دنیا بڑی شدت سے 27 جون 2008ء کا انتظار کرتی رہی' دنیا دیکھنا چاہتی تھی کیا بل گیٹس واقعی اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔ اس دوران بے شمار تھیوریز آئیں' لوگوں نے کہا 60 ارب ڈالر کی دولت اور 200 بلین ڈالر کی کمپنی چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں' بل گیٹس 2008ء میں اپنا ارادہ بدل دے گا لیکن پھر 27 جون آ گیا' بل گیٹس دفتر آیا' اس نے اپنے ملازمین کو جمع کیا اور کمپنی چھوڑنے کا اعلان کر دیا' بل گیٹس کے اعلان نے تمام لوگوں کی آنکھیں گیلی کر دیں' اس کی اپنی آنکھ سے آنسو نکلا اور ٹھوڑی پر آ کر رک گیا' بل گیٹس زندگی میں تیسری بار رویا تھا۔

میں نے واشنگٹن پوسٹ میں اس کی آخری تقریر کے اقتباسات پڑھے تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے' آپ ذرا سوچئے خیرات' صدقہ اور فلاح و بہبود اسلام میں عبادت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن دنیا کے سب سے بڑے مخیر کا اعزاز کسی مسلمان کو نصیب نہ ہوا' دنیا کے امیر ترین لوگوں کی فہرست میں تین مسلمان بھی شامل تھے لیکن لوگوں کی خدمت کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے بل گیٹس کو عطا فرمائی' آپ سوچئے دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص ایک عرب مسلمان شہزادہ ولید بن طلال ہے' اس کی دولت جوا خانوں میں خرچ ہو رہی ہے جبکہ بل گیٹس اپنی دولت ایڈز کے علاج پر خرچ کر رہا ہے' وہ مسلمان بچوں کو تعلیم دے رہا ہے' آپ سوچئے کیا یہ چا بل گیٹس جیسے لوگ نہیں ہیں جنہیں حقیقتاً رول ماڈل سمجھنا چاہیے' ذرا سوچئے پوری اسلامی دنیا رئیس لوگوں سے بھری پڑی ہے' اسلامی دنیا میں ایسے ایسے لوگ ہیں جو ہیروں کی کئی کئی کانوں کے مالک ہیں' جن کی زمینوں سے سونا نکلتا ہے اور جو تیل کے درجنوں کنوؤں کے مالک ہیں لیکن انہیں کسی ضرورت مند کو دس روپے دینے کی توفیق نہیں ہوتی جبکہ بل گیٹس اپنی ساری دولت لے کر ضرورت مندوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے' میں نے سوچا 62 اسلامی ممالک کی اس دنیا میں ایک ارب 45 کروڑ مسلمان آباد ہیں لیکن ان ڈیڑھ ارب لوگوں میں ایک بھی بل گیٹس نہیں' ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو 53 سال کی عمر میں اپنی کمپنی کا دروازہ کھولے اور اپنا سارا مال' اپنی ساری زندگی اللہ کے بندوں کے لئے وقف کر دے' جو لوگوں میں دوا اور کتاب بانٹے' جو لوگوں کے زخم دھوئے' جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور جو لوگوں کے آنسو پونچھے' میں ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا عالم اسلام پر یورپ اور امریکہ کیوں غالب ہیں؟ مجھے آج معلوم ہوا امریکہ اور یورپ بل گیٹس جیسے لوگوں کی وجہ سے ہم پر غالب ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے پاس بڑے انسان ہیں جبکہ عالم اسلام بڑے تاجروں' بڑے بیوپاریوں اور بڑے صنعت کاروں کی غلامی میں زندگی گزار رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوا مغرب کے پاس انسان ہیں جبکہ ہم لوگ آدمیوں کی چاکری میں عمر گزار رہے ہیں' کاش پاکستان کے سوا رب پتی تاجر بل گیٹس سے سبق سیکھیں اور آج سے اپنا وقت اور سرمایہ عام اور غریب لوگوں کیلئے وقف کر دیں' کاش اللہ تعالیٰ مسلمان تاجروں کو بھی بل گیٹس جیسا ظرف اور توفیق دے دے' کاش!

یہ صدر ایوب خان کے اقتدار کے آخری دن تھے‘ صدر کے سیکرٹری اطلاعات اور قریبی مشیر الطاف گوہر ملاقات کیلئے ایوان صدر گئے‘ یہ ایوان صدر اس وقت راولپنڈی میں ہوتا تھا‘ آج کل اس عمارت میں فاطمہ جناح یونیورسٹی قائم ہے۔ الطاف گوہر نے دیکھا صدر ایوب خان لان میں اکیلے بیٹھے ہیں‘ الطاف گوہر صدر کے پاس چلے گئے‘ صدر ایوب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ الطاف گوہر صدر ایوب کے سامنے بیٹھ گئے‘ دونوں کے درمیان بڑی دیر تک خاموشی کا وقفہ رہا‘ اس دوران الطاف گوہر بڑے غور سے صدر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے رہے‘ صدر کے چہرے پر ناامیدی‘ اداسی اور شکست کے آثار تھے۔ صدر ایوب نے اچانک سر اٹھایا‘ الطاف گوہر کی طرف دیکھا اور اداس لہجے میں بولے ”الطاف میرا خیال ہے مجھے اب اقتدار چھوڑ دینا چاہئے“ الطاف گوہر کیلئے یہ بات انکشاف سے کم نہیں تھی کیونکہ آمریت کی تاریخ میں کبھی کوئی آمر خود اقتدار سے جدا نہیں ہوا‘ فوجی جرنیلوں‘ آمروں اور اقتدار پر شب خون مارنے والوں کیلئے اقتدار تخت نہیں ہوتا‘ تختہ ہوتا ہے اور جو آمر ایک بار اس پر چڑھ جائے اس تختے سے اس کے بعد اس کی نعش ہی اترتی ہے۔ الطاف گوہر نے صدر سے وجہ پوچھی تو ایوب خان نے ایک عجیب وجہ بتائی‘ ان دنوں ملک بھر میں ایوب۔۔۔(میں ادب کی وجہ سے یہ جگہ خالی چھوڑ رہا ہوں) ہائے ہائے کے نعرے لگتے تھے‘ ایک سرے سے کوئی شخص ایوب۔۔۔ کا نعرہ لگاتا تھا اور دوسری طرف سے پورا مجمع ہائے ہائے کی آواز لگاتا تھا۔ ایوب خان نے بتایا‘ وہ صبح کے وقت ایوان صدر کے لان میں آئے تو ان کے پوتے‘ پوتیاں اور نواسے‘ نواسیاں باغیچے میں کھیل رہی تھیں‘ ان بچوں نے ایک سٹیج بنا رکھا تھا اور جلسہ جلسہ کھیل رہے تھے‘ ایوب خان آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب کھڑے ہو گئے‘ بچوں میں سے کسی بچے نے ایوب)۔۔ کا نعرہ لگایا اور جواب میں تمام بچوں نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر ہائے ہائے کی آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ ایوب خان یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے‘ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ وہاں سے اٹھ کر یہاں آ گئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ صدر ایوب خان کا کہنا تھا‘ عوام کی نفرت ایوان صدر کی دیواریں عبور کر کے اندر آ چکی ہے اور اب ان کے پوتے‘ پوتیاں اور نواسے‘ نواسیاں بھی ہائے ہائے کے نعرے لگا رہی ہیں چنانچہ اب ان کا اقتدار میں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ الطاف گوہر نے صدر ایوب کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ایوب خان اپنا انجام جان چکے تھے چنانچہ جب یحییٰ خان نے انہیں مستعفی ہونے کا آپشن دیا تو انہوں نے چپ چاپ کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ جنرل یحییٰ خان نے انہیں آخری سیلوٹ کیا اور امیر گلستان جنجوعہ (یہ اس وقت کرنل تھے اور بعد ازاں صدر اسحاق خان نے انہیں صوبہ سرحد کا گورنر بنا دیا تھا) انہیں چپ چاپ اسلام آباد میں ان کے ذاتی گھر چھوڑ گئے۔ ایوب خان نے باقی زندگی اس گھر میں گزار دی۔

صدر ایوب خان کا المناک انجام دنیا کا پہلا واقعہ نہیں تھا‘ دنیا کے تمام آمروں کی زندگی میں عوامی نفرت کا ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب انہیں وہ پتے بھی ہوا دینے لگتے ہیں جن پر وہ تکیہ کئے ہوتے ہیں۔ جب انہیں ان کے قریب ترین دوست‘ رشتے دار اور احباب بھی چھوڑ جاتے ہیں اور اس کے بعد احتساب کا خوفناک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بدقسمتی سے صدر پرویز مشرف بھی اس دور میں داخل ہو چکے ہیں اور وہ تیزی سے اکیلے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے گزشتہ روز صدر کے ترجمان میجر جنرل (ر) راشد قریشی پر بھی فالج کا اٹیک ہو گیا اور یوں صدر کا آخری ساتھی بھی ”گراؤنڈ“ ہو گیا۔ جنرل راشد قریشی پچھلے ایک ماہ سے دوستی کا حق ادا کر رہے تھے‘ وہ تمام محاذوں پر اکیلے لڑ رہے تھے اور بڑی حد تک دشمنوں کا بھرپور مقابلہ بھی کر رہے تھے لیکن ان کی اچانک بیماری سے صدر کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔ جنرل راشد قریشی کے بعد اب پوری دنیا میں صرف ایک شخص بچا ہے جو صدر کی ترجمانی کر سکتا ہے اور وہ شخص ڈاکٹر شیر افگن نیازی ہیں‘ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو بلا تکان بولنے کا ملکہ دے رکھا ہے‘ ڈاکٹر صاحب 24 گھنٹوں میں سے 28 گھنٹے بول سکتے ہیں اور اس دوران کسی دوسرے کی بات نہیں سنتے لہٰذا میرا صدر صاحب کو مشورہ ہے وہ فوراً ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو اپنا ترجمان مقرر کر دیں اور اس کے بعد تماشا دیکھیں‘ دنیا بھر کے چینلز ہوں گے اور ان پر ہر پانچ منٹ بعد ڈاکٹر صاحب جلوہ افروز ہوں گے اور صدر صاحب کی بلّے بلّے ہو جائے گی‘ اگر صدر صاحب فوری طور پر یہ فیصلہ نہیں کرتے تو پھر میرا مشورہ ہے وہ فوراً باعزت طور پر مستعفی ہو جائیں کیونکہ جنرل راشد قریشی کی بیماری کے بعد صدر صاحب پر ایک اور اٹیک ہونے والا ہے اور اس اٹیک کا نام گرو بجلی ہے‘ استاد عطا عرف گرو بجلی خواجہ سراؤں کا چیف ہے اور اس نے گزشتہ روز صدر پرویز مشرف کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا ہے۔ گرو بجلی نے کل ٹیکسلا میں پریس کانفرنس کی اور

اس پریس کانفرنس میں اعلان کیا "گزشتہ نو برسوں میں ملک دن بدن زوال پذیری کی طرف گامزن رہا اور صدر پرویز مشرف کی پالیسیوں اور غلط فیصلوں کی وجہ سے ملک میں بحران پیدا ہوئے اور مہنگائی نے غریبوں کا [illegible] کر دیا"۔ گرو بجلی نے اعلان کیا "لہٰذا ہم نے وکلاء تحریک اور ن لیگ کے احتجاج میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے' میں نے ملک بھر میں موجود اپنے تمام چیلوں کو ہدایت کر دی ہے وہ وکلاء تحریک اور ن لیگ کے جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں"۔ میں نے جب سے گرو بجلی کی یہ خبر پڑھی ہے مجھے اس وقت سے صدر ایوب خان یاد آ رہے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے یہ صدر پرویز مشرف پر آخری اٹیک ہے۔ خدا کی پناہ جس شخص نے ملک کی تاریخ میں اتنا قطعی اقتدار دیکھا ہو کہ اس نے صرف ٹیلی فون پر امریکہ کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہو' جس نے بلوچستان پر چڑھائی اور لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کو توپوں سے اڑا دینے کا حکم دے دیا ہو' جس نے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت کو جلاوطن کر دیا ہو اور جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر جیسے ہیرو کو اٹھا کر نظر بند کر دیا ہو اور چیف جسٹس آف پاکستان کو گھر میں محبوس کر دیا ہو' اس شخص کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آ جائے کہ خواجہ سرا بھی اس کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیں' اس سے بڑی عبرت کیا ہو گی چنانچہ صدر صاحب کو چاہئے وہ گرو بجلی کے اعلان کو قدرت کی آخری وارننگ سمجھیں اور اپنے آپ کو باعزت بری کرا لیں۔

ہم اب فرض کرتے ہیں صدر پرویز مشرف گرو بجلی کی وارننگ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو پھر کیا ہو گا؟ اس کا جواب مجھے مسلم لیگ ن کے راہنما خواجہ آصف اور پیپلز پارٹی کے سینیٹر محمد لطیف کھوسہ نے گزشتہ روز دیا تھا' میری خواجہ آصف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا 20 جون کو میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری نے صدر پرویز مشرف کے مواخذے کا فارمولہ طے کر لیا ہے' جولائی میں صدر پرویز مشرف کا مواخذہ ہو جائے گا لیکن خواجہ آصف کا کہنا تھا حکمران اتحاد صدر کے مواخذے کیلئے غیر روایتی طریقہ استعمال کرے گا۔ میں نے خواجہ صاحب سے یہ طریقہ جاننے کی کوشش کی لیکن انہوں نے بتایا "میں رازداری کا پابند ہوں' بس دو ہفتوں میں بات سامنے آ جائے گی" میری ملاقات رات کو سینیٹر لطیف کھوسہ سے ہوئی تو کھوسہ صاحب نے انکشاف کیا "ہم نا صرف صدر کے مواخذے کی تیاری کر چکے ہیں بلکہ ہم نے نئے صدر کا فیصلہ بھی کر لیا ہے اور یہ بس چند دن کی بات ہے" میں نے جب سے لطیف کھوسہ اور خواجہ آصف کے انکشافات سنے ہیں' میں اس وقت سے پریشان ہوں کیونکہ پاکستانی سیاست اس وقت تار پر چل رہی ہے' تار بہت باریک اور نازک ہے جبکہ حکمران اتحاد کی ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اگر حکمران اتحاد نے جلد سے جلد یہ بوجھ اتارنا شروع نہ کیا تو یہ تار کسی بھی وقت ٹوٹ جائے گی اور ہم دوبارہ جیسے تھے کی پوزیشن پر آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کرم کرے کیونکہ آنے والے دن بہت خوفناک اور فیصلہ کن ہیں۔

تاش کے کھیل میں ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں کھلاڑیوں نے اپنے اپنے پتے شو کرنا ہوتے ہیں' ہماری سیاست میں بھی "شو" کا وقت آ چکا ہے بس چند دن کی بات ہے' صدر مستعفی ہو جائیں گے' ان کا مواخذہ شروع ہو گا یا پھر حکمران اتحاد ٹوٹ جائے گا۔ بس چند دن باقی ہیں لیکن ایک بات طے ہے صدر پرویز مشرف صدر ایوب خان سے مختلف انسان ہیں' صدر ایوب نے ایک بار ہائے ہائے سنی تھی اور انہوں نے اقتدار چھوڑ دیا تھا لیکن صدر پرویز مشرف 16 کروڑ لوگوں کی ہائے ہائے سن کر بھی میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہمیں صدر مشرف کی اس استقامت کی انہیں ضرور داد دینی چاہئے۔

اپنے آپ کو کھانے والے سانپ

برازیل میں سانپ کی ایک انوکھی قسم پائی جاتی ہے' یہ دو فٹ لمبا اور ایک انچ موٹا ہوتا ہے' اس کا رنگ مٹیالا اور منہ گندمی ہوتا ہے اور یہ عموماً گھنے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سردیوں کے آٹھ ماہ زمین میں پوشیدہ رہتا ہے اور گرمی کا موسم شروع ہوتے ہی باہر آ جاتا ہے۔ یہ شدید زہریلا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے اگر یہ سانپ ایک بار کسی درخت کی جڑوں پر کاٹ لے تو وہ درخت سوکھ جاتا ہے۔ یہ عموماً جانوروں کے پیٹ اور انسانوں کی ٹانگوں کو نشانہ بناتا ہے اور اس کا ایک ڈنگ دس ٹن وزنی بھینسے کو ڈھیر کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ یہ بہر حال سانپوں کی عام خصوصیات میں سے چند خصوصیات ہیں اور دنیا میں بے شمار ایسے سانپ ہوں گے جنہیں قدرت نے ان ''خصوصیات'' سے نوازا ہو گا لیکن اس سانپ میں ایسی خصوصیت بھی موجود ہے جو دنیا کے کسی دوسرے جاندار میں نہیں۔ یہ سانپ دوسرے سانپوں کی طرح سردی کے موسم میں لمبی نیند لیتا ہے' یہ کسی بل میں گھستا ہے اور 8 ماہ کیلئے سو جاتا ہے' اس دوران عموماً دوسرے سانپ مٹی کھاتے ہیں اور مٹی میں موجود کیمیائی مادوں' دھاتوں اور نامیاتی مواد کے ذریعے اپنی زندگی برقرار رکھتے ہیں لیکن یہ سانپ ان آٹھ مہینوں کے دوران بڑی دلچسپ حرکت کرتا ہے' یہ اپنی دم منہ میں لیتا ہے اور اسے کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کر دیتا ہے اور یہ آٹھ ماہ تک خود کو کھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی نیند کھلتی ہے تو یہ بعض اوقات تین' چار انچ باقی بچ جاتا ہے۔ موسم تبدیل ہونے پر یہ اپنے بل سے باہر نکلتا ہے' کیڑے مکوڑوں اور چھوٹے جانوروں کو نشانہ بناتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا جسم دوبارہ بڑا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ یہ ایک بار پھر دو فٹ تک لمبا ہو جاتا ہے' اپنے آپ کو کھانے کی یہ عادت صرف اس سانپ میں موجود ہے۔

میں نے اس سانپ کے بارے میں برسوں پہلے نیشنل جیوگرافک کے کسی شمارے میں پڑھا تھا' میگزین میں اس سانپ کی تصویریں چھپی تھیں' یہ تصویریں میگزین کے کسی فوٹوگرافر نے سانپ کے بل میں منی کیمرہ لگا کر لی تھیں اور ان تصویروں میں سانپ کو باقاعدہ اپنے آپ کو کھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ میں وہ میگزین اور اس کی تاریخ اشاعت بھول چکا ہوں لیکن سانپ اور اس کی تصویریں آج تک میرے ذہن میں موجود ہیں اور میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' یہ بھوک ہے یا خونخواری کی جبلت جس سے مغلوب ہو کر یہ سانپ اپنے آپ کو کھانے لگتا ہے۔ مجھے کبھی اس سوال کا حتمی جواب نہیں ملا لیکن کل میں نے ایک سابق جج کے بارے میں ایک خبر پڑھی اور مجھے برسوں سے ڈستے ہوئے اس سوال کا جواب مل گیا۔ آپ جواب سے قبل یہ خبر ملاحظہ کیجئے' ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل پاکستان کے ایک سابق سفیر اخوند محمد اسمٰعیل کے صاحبزادے ہیں' یہ ایک نہایت پڑھے لکھے اور دانشور شخص ہیں اور ان کی دانشوری اور ذہانت دیکھ کر مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے انہیں اپنا داماد بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب جنرل ضیاءالحق کے دور میں پاکستان آئے' جنرل ضیاءالحق ان کی ذہانت اور مطالعے سے متاثر ہوئے اور انہوں نے انہیں لاہور ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کو اس پوزیشن پر ابھی چند ماہ ہوئے تھے کہ ان کی عدالت میں منشیات کی سمگلنگ کا ایک کیس پیش ہوا' لوئر کورٹ نے دو ملزمان ہی شاہ اور حامد بٹ کو منشیات کی سمگلنگ میں پندرہ' پندرہ سال قید کی سزا سنائی تھی اور ملزمان نے ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی تھی' یہ ملزمان جب ڈاکٹر مصطفیٰ کی عدالت میں پیش ہوئے تو انہوں نے عدالت میں حلفیہ بیان جمع کرا دیا کہ انہوں نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاءالحق کی اہلیہ بیگم شفیقہ ضیاء کے حکم پر یہ منشیات سمگل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کیونکہ تازہ تازہ پاکستان آئے تھے اور اس ملک کی روایات سے واقف نہیں تھے چنانچہ انہوں نے خاتون اول بیگم شفیقہ ضیاء کو عدالت میں پیش ہونے کا سمن جاری کر دیا' یہ سمن پاکستان کے قانون اور آئین کی توہین تھی اور اس توہین کے جرم میں بعدازاں ہائی کورٹ کے اس جج کے خلاف فراڈ' دھوکہ دہی اور جعلی پاسپورٹ کے 33 مقدمات قائم کر دیئے گئے' انہیں 25 جون 1986ء کو گرفتار کیا گیا اور اٹھا کر جیل میں پھینک دیا گیا' وہ دن تھا اور کل کا دن تھا ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل جیل میں سڑتے رہے۔ اس دوران حکومتیں آئیں' رخصت ہوئیں' عدالتوں کے چیف بدلتے اور آتے رہے لیکن ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کی آہیں اور سسکیاں عدالت اور حکومت تک نہ پہنچ سکیں۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر مصطفیٰ کی کہانی ایک اخبار نویس تک پہنچی' اخبار نویسوں نے یہ کہانی اخبار میں شائع کر دی اور یوں 22 برس بعد ڈاکٹر مصطفیٰ کی آہوں کی حکومتی ایوانوں تک رسائی ہوئی' وزیراعظم کے مشیر رحمان ملک نے نوٹس لیا' 24 جون کو ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کی ضمانت ہو گئی اور یوں ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کو آزاد فضائیں دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کی

کہانی کسی صحافی تک نہ پہنچتی' یہ داستان اخبار میں شائع نہ ہوتی اور اس خبر پر حکومت نوٹس نہ لیتی تو ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کا کیا بنتا؟ میرا خیال ہے ڈاکٹر مصطفیٰ زندگی کی آخری سانس تک جیل میں پڑے رہتے اور موت کے بعد انہیں جیل کے کسی خاموش قبرستان میں دفن کر دیا جاتا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل اس ملک کے نظام عدل کے اپنے بیٹے' اپنے ساتھی یا اپنے بھائی تھے' یہ خود ہائی کورٹ کے جج تھے اور ان کی کہانی یہ ثابت کرتی ہے جب ملک میں ناانصافی 'ظلم اور زیادتی بڑھ جاتی ہے تو ایک ایسا وقت آجاتا جب خود عدالتیں اور جج اس زیادتی 'ظلم اور ناانصافی کا شکار بننے لگتے ہیں' ناانصافی آگ کی طرح ہوتی ہے جو پھیلتی ہے تو اس شخص کی ٹانگوں تک بھی پہنچ جاتی ہے جس نے یہ آگ دھکائی تھی یا جس نے بھوسے کے ڈھیر پر چنگاری پھینکی تھی۔ ہمارے ملک میں ناانصافی اور ظلم موجود ہے اور ظلم اور ناانصافی کے اس پھیلاؤ میں جج اور عدالتیں بھی اتنی ہی ذمہ دار ہیں جتنا یہ معاشرہ' سیاستدان اور فوجی حکمران تھے چنانچہ آج یہ آگ ججوں تک بھی پہنچ رہی ہے۔ یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے حکمران ملک غلام محمد ہو' سکندر مرزا' ایوب خان' یحیٰی خان' ذوالفقار علی بھٹو' بے نظیر بھٹو' میاں نواز شریف یا صدر پرویز مشرف' پاکستان کے تمام حکمرانوں نے عدلیہ کو اپنے مقصد کیلئے استعمال کیا اور بعد ازاں ان میں سے کسی حکمران کو عدالتوں سے انصاف نہیں ملا' یہ لوگ اپنی زندگی میں عدالتی انتقام کا نشانہ بنے' ہم نے اس ملک کے نظام عدل کو برازیل کا سانپ بنا دیا تھا اور زیادتی 'ظلم اور ناانصافی کے یہ سانپ اب اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب انہوں نے اپنی ہی دم کھانا شروع کر دی ہے۔ یہ اب خود اپنے آپ کو ہڑپ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل کی کہانی میرا خیال ہے اس ملک کے ہر جج کی میز پر ہونی چاہئے اور آج سے جناب آصف علی زرداری سے لے کر فاروق ایچ نائیک تک وہ تمام لوگ جو معطل ججز کی بحالی کے راستے میں رکاوٹ ہیں انہیں یہ جان لینا چاہئے کہ اس ملک میں ناانصافی اب ان حدود کو چھو رہی ہے جہاں پہنچ کر آگ جلانے اور آگ میں پھنسے لوگوں میں کوئی فرق نہیں رہتا' جس سطح پر پہنچ کر جج بھی انصاف کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں' اگر آج اس ملک میں انصاف ہوتا تو اعلیٰ عدلیہ کے 60 جج ایمانداری اور ضمیر کی سزا نہ بھگت رہے ہوتے اور ڈاکٹر مصطفیٰ اسمٰعیل جیسے جج بے گناہی کے باوجود 22 برس تک جیلوں میں نہ پڑے ہوتے۔

میرا خیال ہے ہماری عدلیہ تاریخ کے اس سبق سے سبق نہیں سیکھ رہی' شائد یہی وجہ ہے میاں نواز شریف کی نااہلی کا فیصلہ آیا اور اس فیصلے نے پورے ملک میں آگ لگا دی' مجھے خطرہ ہے آگ کے یہ سانپ بہت جلد عدالتوں تک پہنچ جائیں گے۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں جب جج عدالتوں کے اندر محصور ہوں گے اور عوام سڑکوں اور چوراہوں پر عوامی عدالتیں سجا کر بیٹھیں ہوں گے۔ ذرا تصور کیجئے اس وقت ہماری کیا حالت ہو گی' خدا ہمیں اس وقت سے بچائے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں کیونکہ ہمارا عدالتی نظام ایک ایسا سانپ بن چکا ہے جس نے اپنی ہی دم چبانا شروع کر دی ہے۔

خاموشی

چارلس ڈیگال سیاست میں استاد کی حیثیت رکھتا تھااور دنیا کے بے شمار حکمرانوں' سیاستدانوں اور سیاست کے طالب علموں نے ڈیگال کے خیالات سے استفادہ کیا تھا' وہ استفادہ کر رہے ہیں اور استفادہ کرتے رہیں گے' گزشتہ برس فرانس نے سو سال کی دس بہترین شخصیات کی فہرست بنائی تھی' یہ فہرست مرتب کرنے کیلئے عوامی رائے جمع کی گئی تھی اور عوام کی رائے سے جو فہرست مرتب ہوئی تھی چارلس ڈیگال کا نام اس لسٹ میں دوسرے نمبر پر تھا' پہلے نمبر پر فرانس کے بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنف وکٹر ہیوگو کا نام تھا' چارلس ڈیگال فوجی تھا' اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانسیسی فوج کی قیادت کی تھی' جنگ لڑی تھی اور فرانس کو اس جنگ میں فتح یاب کرایا تھا' وہ اس کے بعد سیاست میں آیا تھااور اس نے فرانس کو دنیا کی چوتھی بڑی طاقت بنادیا تھا' امریکی صدر رچرڈ نکسن چارلس ڈیگال سے بہت متاثر تھا' نکسن نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''لیڈرز'' میں چارلس ڈیگال کا بڑی محبت سے ذکر کیا' رچرڈ نکسن جب صدارتی الیکشن لڑ رہا تھاتو اس نے اس وقت چارلس ڈیگال سے رابطہ کیااور اس سے عرض کیا ''کیا آپ مجھے سیاست میں کامیابی کا کوئی ایک فارمولہ بتاسکتے ہیں'' چارلس ڈیگال مسکرایااور نرم آواز میں بولا ''سیاست میں کامیابی کے دس فارمولے ہیں'' رچرڈ نکسن نے فوراً عرض کیا ''نہیں جناب مجھے صرف ایک نسخہ درکار ہے'' چارلس ڈیگال نے چند لمحے سوچا اور پھر زور دے کر بولا ''خاموشی'' رچرڈ نکسن نے عرض کیا ''جناب مجھے سمجھ نہیں آیا'' ڈیگال بولا ''خاموشی سیاستدانوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے'' وہ رکا اور دوبارہ بولا ''دنیا میں ہر بات' ہر چیز کے دو ردعمل ہوتے ہیں' ہاں یا ناں' آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں یا مسترد کرتے ہیں لیکن ایک تیسرا ردعمل بھی ہوتا ہے اور وہ ردعمل خاموشی ہے' آپ بات سنیں اور اس بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں'' چارلس ڈیگال نے کہا ''اور ایک کامیاب' سمجھ دار اور بڑے سیاستدان کو خاموشی کے آرٹ میں تاک ہونا چاہیے' اسے چاہیے وہ اپنے چہرے کو پتھر بنالے اور آندھی آئے یا طوفان وہ اپنا منہ نہ کھولے'' چارلس ڈیگال کا کہنا تھا ''الفاظ سیاستدانوں کی موت ہوتے ہیں اور جو لوگ سیاست میں آکر زیادہ بولتے ہیں وہ زبان سے اپنی سیاسی قبر کھودتے ہیں''۔

مجھے نہیں معلوم رچرڈ نکسن نے چارلس ڈیگال کی اس نصیحت پر کس حد تک عمل کیا لیکن مجھے پاکستانی سیاست میں خاموشی کا فقدان نظر آرہا ہے' ہمارے سیاستدان گفتگو' تقریر' خطاب' پریس کانفرنس اور جلسے جلوسوں کو سیاست سمجھتے ہیں اور یہ کیمروں کے سامنے پہنچنے اور طویل اور لایعنی گفتگو کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے' ان کی کوشش ہوتی ہے یہ جہاں بھی جائیں ان کے پہنچنے سے پہلے وہاں کیمرے پہنچ جائیں' راسٹرم اور ڈائس لگ جائیں اور صحافی کاپیاں پکڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہوں اور اس کے بعد ان سے دس پندرہ برس پرانے سوال پوچھے جائیں اور وہ ان کے پرانے جواب دینا شروع کردیں' بسیار گوئی کے اس مقابلے کے دوران اکثر اوقات سیاستدانوں کے منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جو بعد ازاں سیاسی قبروں کے کتبے بنتے ہیں' یہ الفاظ نہ صرف ان لوگوں کی سیاست کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ان سے سیاسی بدنامی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو ان کے مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے' آپ بھٹو صاحب کے چند فقرے ملاحظہ کیجئے ''ہاں میں شراب پیتا ہوں' عوام کا لہو نہیں پیتا'' ''میرے مرنے پر ہمالیہ بھی روئے گا'' اور ''یہ کرسی بہت مضبوط ہے'' یہ وہ فقرے تھے جنہوں نے بھٹو کی شہادت کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا' اسی طرح جنرل ضیاء الحق نے سیاستدانوں کے بارے میں کہا تھا ''یہ دم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے آئیں گے'' اور ''آئین کیا ہے کاغذ کا ایک چیتھڑا'' بھٹو صاحب اور جنرل صاحب کے یہ فقرے ہماری تاریخ کا حصہ بن گئے اور آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں اور اسی طرح 12 مئی 2007ء کو صدر پرویز مشرف نے اسلام آباد میں ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کراچی میں ہونے والی قتل وغارت گری کو ''عوامی طاقت کا مظاہرہ'' قرار دیا تھا' مجھے یقین ہے صدر پرویز مشرف کا یہ فقرہ بھی صدر کے جانے کے بعد ان کی جان نہیں چھوڑے گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری بھی ایسے تاریخی فقروں کی ٹھیک ٹھاک لیبارٹری ہیں' ان کے بعض فقروں میں اتنی جان ہوتی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے محاورے یا ضرب المثل کا مقام پاسکتے ہیں مثلاً انہوں نے ایک بار اعلان مری کو ''سیاسی بیان'' قرار دے دیا تھا' ان کے اس اعلان سے پاکستانی سیاست اور ادب میں ''سیاسی بیان'' کے نام سے ایک نئی اصطلاح نے جنم لیا اور اب جب بھی کوئی شخص اپنے معاہدے' وعدے اور سمجھوتے سے منحرف ہوتا ہے تو وہ اپنے ''یوٹرن'' کو سیاسی بیان قرار دے دیتا ہے اور لوگ اس کی ساری

"مجبوریاں" سمجھ جاتے ہیں' اسی طرح لوگ اب معاہدوں سے پیچھے ہٹنے والوں کو "سیاستدان" اور سیاستدانوں کے اعلانوں کو "سیاسی بیان" کہتے ہیں' آصف علی زرداری نے پچھلے دنوں بھی دو بڑے شاندار بیان دیئے اور مجھے یقین ہے یہ بیانات بھی آگے چل کر محاورے کا مقام پا جائیں گے' پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین نے فرمایا "محترمہ بے نظیر بھٹو افتخار محمد چودھری کو چیف جسٹس بنانے کیلئے شہید نہیں ہوئی تھیں" گزشتہ روز آصف علی زرداری نے اس بیان کو ذرا مختلف انداز میں دوسری بار دہرایا' انہوں نے فرمایا "عوام کے پیٹ سے افتخار چودھری کو بحال کروکی نہیں بلکہ ہم بھوکے ہیں کی آوازیں آ رہی ہیں" مجھے خطرہ ہے یہ دونوں بیان آگے چل کر آصف علی زرداری کیلئے ٹھیک ٹھاک مسائل پیدا کر دیں گے اور ہو سکتا ہے کسی لیول پر پاکستان پیپلز پارٹی کو ان کی تردید یا معذرت بھی کرنا پڑ جائے کیونکہ عوامی جذبات پارٹیوں کیلئے خون کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں ماننا پڑے گا افتخار محمد چودھری اور وکلاء تحریک کے ساتھ لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں' مجھے یقین ہے آج اگر افتخار محمد چودھری گھر سے باہر آئیں اور عوام کو کال دیں تو لاکھوں لوگ ان کے ساتھ گھروں سے نکل آئیں گے لیکن اس کے باوجود ہم ایک لمحے کیلئے مان لیتے ہیں' محترمہ بے نظیر بھٹو نے افتخار محمد چودھری کو چیف جسٹس بنانے کیلئے جان نہیں دی تھی اور لوگ بھی افتخار محمد چودھری کی بجائے اپنے بھوکے پیٹوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے' محترمہ نے کس کیلئے جان دی تھی؟ یقیناً پاکستان پیپلز پارٹی (جدید) کا جواب ہو گا "جمہوریت کیلئے" یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے' کیا آزاد عدلیہ کے بغیر کسی ملک میں جمہوریت ممکن ہے؟ یقیناً نہیں کیونکہ عدلیہ اور جمہوریت خون کے سرخ اور سفید جرثوموں کی طرح ہوتی ہیں اور جب تک جمہوریت کو عدلیہ کی سپورٹ اور عدلیہ کو جمہوریت پسند سیاستدانوں کی معاونت حاصل نہیں ہوتی' اس وقت تک ملک آگے نہیں بڑھا کرتے اور اگر محترمہ نے جمہوریت کیلئے جان دی تھی تو اس وقت تک محترمہ کی روح کو سکون نہیں ملے گا جب تک اس ملک میں عدلیہ آزاد نہیں ہوتی اور یہ بھی حقیقت ہے فی الوقت معطل ججوں کی بحالی آزاد عدلیہ کی طرف پہلا قدم ہو گا اور ہم نے اگر یہ پہلا قدم نہ اٹھایا تو ہم جمہوری اور عادل معاشرے کی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے' باقی رہ گئے بھوکے پیٹ تو یہ بھی حقیقت ہے انسان بھوکا رہ سکتا ہے' وہ پیاسا رہ سکتا ہے اور وہ کپڑوں اور چھت کے بغیر بھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن وہ انصاف کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' دنیا میں لوگ بھوک' پیاس اور کپڑوں کیلئے خودکشی نہیں کرتے لیکن اگر انہیں انصاف نہ ملے تو وہ پنکھوں کے ساتھ لٹک جاتے ہیں' اگر عدل معاشروں کیلئے زندگی نہ ہوتا تو اسلام کبھی عدل پر اتنا زور نہ دیتا' اسلامی معاشرہ عدل کی ناقابل تردید مثال تھا' جب نبی رسالت ﷺ نے مدینہ میں انصاف قائم کیا تھا تو اس وقت بھی لوگوں کے پاس روٹی' کپڑے اور مکان نہیں تھے لیکن جب عدل قائم ہوا تو اس معاشرے کی یہ تمام ضروریات پوری ہو گئیں اور مدینہ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب غلام ابن غلام ہزاروں اشرفیاں لے کر بازاروں میں نکلتے تھے لیکن انہیں کوئی ضرورت مند نہیں ملتا تھا' ہمیں ماننا پڑے گا انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ کا یہ اعلان ہے معاشروں کی بھوک انصاف کے بغیر نہیں مٹائی جا سکتی اور جب تک ملک کو ایک آزاد عدلیہ نہیں ملتی اس وقت تک معاشروں میں خوشحالی نہیں آتی لیکن ہم ایسے بد قسمت لوگ ہیں جو بانس سے گنے کا کام لینا چاہتے ہیں اور گنے سے بانس کا چنانچہ ہم ادھر کے رہتے ہیں اور نہ ہی ادھر کے' کاش ہمارے لیڈر ایسے بیانات دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر لیں تو کم از کم لوگوں کے دل تو نہ ٹوٹیں' لوگوں کو تکلیف تو نہ پہنچے' کم از کم ہمارے سیاستدانوں کا بھرم تو رہ جائے۔

کھڑکی سے گیٹ نظر آرہا تھا' وہ اپنے شاندار دفتر کی آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا' میرے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا اور وقفے وقفے سے فیکٹری میں داخل اور باہر نکلنے والوں پر نظر ڈال رہا تھا۔ ہم تازہ ترین سیاسی صورتحال پر گفتگو کر رہے تھے' اچانک میرے دوست نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور افراتفری میں باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت اس کے پاؤں میں صرف ایک جوتا تھا' میں اس کی افراتفری سے گھبرا گیا' اس نے دروازہ کھولا' اپنے سٹاف کے کمرے سے باہر نکلا اور تیر کی طرح گیٹ پر پہنچ گیا' گیٹ میں ایک گاڑی داخل ہو رہی تھی' میرے دوست کو دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روک دی' میرا دوست آگے لپکا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت گاڑی کا اگلا اور پچھلا دروازہ کھول دیا' گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ایک ساٹھ' پینسٹھ سال کے بزرگ اترے اور میرے دوست کو گلے سے لگا لیا۔ اس دوران اگلی سیٹ سے بھی اتنی ہی عمر کے ایک دوسرے بزرگ باہر نکلے اور میرے دوست سے لپٹ گئے۔ میرے دوست نے دونوں بزرگوں کا ہاتھ پکڑا اور انہیں دفتر لے آیا۔ میں کھڑا ہو کر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اندر آئے' وہ بزرگ جو پچھلی سیٹ سے اترے تھے وہ صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ میرا دوست اور اگلی سیٹ سے اترنے والے باباجی ان کے سامنے ادب سے کھڑے ہو گئے' میں ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا' مجھے محسوس ہوا شائد صوفے پر بیٹھے بزرگ کوئی پیر صاحب ہیں اور میرا دوست ان کا مرید وغیرہ ہے' صوفے پر بیٹھے بزرگ نے مختلف موضوعات پر گفتگو شروع کر دی اور میرا دوست جی شیخ صاحب کہہ کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ یہ سلسلہ گھنٹہ بھر چلتا رہا' اسکے بعد شیخ صاحب صوفے سے اٹھے' میرے دوست کے قریب کھڑے باباجی نے لپک کر شیخ صاحب کو ان کی چھڑی پکڑائی' دونوں بزرگوں نے میرے دوست کا ماتھا چوما' میرا دوست ان کے آگے آگے دروازے کھولتا رہا اور میرے دوست نے باہر آکر دونوں ہاتھوں سے گاڑی کا اگلا اور پچھلا دروازہ کھولا' پہلے شیخ صاحب بیٹھے اور اس کے بعد دوسرے بزرگ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے' میرے دوست نے گاڑی کے دونوں دروازے بند کئے' ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی' میرا دوست واپس آ گیا۔ میرے دوست کے پاؤں میں اس وقت تک ایک ہی جوتا تھا' اس کا دوسرا جوتا شائد اس کی میز کے نیچے رہ گیا تھا۔

میں عقیدت کے اس سارے کھیل پر حیران بلکہ پریشان تھا' میرا دوست جب دوبارہ اپنی جگہ پر "سیٹل" ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا "کیا شیخ صاحب تمہارے پیر ہیں" میرے دوست کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی' اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا اور مسکرا کر بولا "میں شیخ صاحب سے پہلے تمہیں اس دوسرے بزرگ کے بارے میں بتاتا ہوں' میں نے جس بزرگ کو گاڑی کی اگلی سیٹ سے اتارا تھا اور جو اس دفتر میں میرے ساتھ کھڑا رہا تھا اس بزرگ کا نام رانا عبدالمجید تھا اور یہ میرے والد صاحب ہیں" مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور میں نے پوچھا "اور وہ شیخ صاحب" وہ فوراً بولا "میرے والد شیخ صاحب کے ملازم بلکہ خادم ہیں" میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ میں جانتا ہوں میرا دوست کروڑ پتی ہے' اس کی فیکٹری میں دو سو لوگ کام کرتے ہیں اور اسکے گھر میں ملازموں کی باقاعدہ فوج ہے لہٰذا پھر اس کے والد کو کسی دوسرے کی ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی' میرا دوست میری آنکھوں کے یہ سارے سوال پڑھ گیا۔ ہماری آنکھیں بھی بہت دلچسپ کمپیوٹر ہیں' ہمارے سارے خیال' ہمارے سارے سوال' سارے خدشے اور سارے جذبات زبان پر آنے سے پہلے ہماری آنکھوں میں آتے ہیں اور ہماری آنکھوں کی اپنی ایک زبان اور اپنی ایک گرائمر ہے اور جو شخص دوسروں کی آنکھیں پڑھنے کا ماہر ہو اسے دنیا کی کوئی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اپنے دوست کی طرف متوجہ ہوا' وہ بولا "میری اس تمام تر دولت اور خوشحالی کے باوجود میرے والد شیخ صاحب کے ساتھ رہتے ہیں' یہ سردیوں میں ان کے غسل کیلئے پانی گرم کرتے ہیں' لوڈشیڈنگ کے دوران شیخ صاحب کو پنکھا جھلتے ہیں' انکے کپڑے استری کرتے ہیں اور ان کے برتن دھوتے ہیں۔ شیخ صاحب ایک آباد گھر میں رہتے ہیں' ان کے بچے اور بہوئیں ہیں' ان کے گھر میں نوکر چاکر بھی ہیں لیکن شیخ صاحب کے تمام کام میرے والد کرتے ہیں اور وہ یہ خدمت پچھلے 38 برسوں سے کر رہے ہیں" وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور پوچھا "لیکن کیوں؟" میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور نرم آواز میں بولا "صرف ایک فٹ بال کی وجہ سے" یہ جواب سن کر میری حیرت آسمان کو چھونے لگی اور میں نے پوچھا "کیا مطلب" میرے دوست نے ایک لمبا سانس بھرا اور آہستہ آہستہ بولا "میرے والد ایک غریب خاندان کے ساتھ تعلق رکھتے تھے' انہوں نے 14 سال کی عمر میں مزدوری اور ملازمتیں کرنا شروع کیں' میرے دادا جی نے

برس کی عمر میں ان کی شادی کر دی اور ایک برس بعد میں پیدا ہو گیا' میرے والد ان دنوں معاشی مشکلات کا شکار تھے چنانچہ وہ مختلف جگہوں پر کام کرتے تھے لیکن ہمارا گزارا نہیں ہوتا تھا' میں اس وقت چار برس کا تھا جب والد کو سپورٹس کی ایک دکان پر نوکری مل گئی' میرے والد فجر کے بعد گھر سے نکلتے تھے اور رات عشاء کے بعد واپس آتے تھے۔ ان کی نوکری کو ابھی دوسرا مہینہ تھا کہ ایک دن میں ضد کر کے ان کے ساتھ دکان پر چلا گیا' دکان کا مالک بڑا شفیق انسان تھا' اس نے مجھے اپنے ساتھ کاؤنٹر پر بیٹھا لیا' میرے والد گاہکوں کے ساتھ مصروف ہو گئے جبکہ میں للچائی نظروں کے ساتھ کھیلوں کا سامان دیکھنے لگا' دکان میں ایک بہت خوبصورت فٹ بال پڑا تھا' میں آدھا دن اس فٹ بال کو دیکھتا رہا' جب دکان کا مالک اور میرے والد گاہکوں میں مصروف ہو گئے تو میں چپکے سے اپنی سیٹ سے اٹھا' فٹ بال کے قریب پہنچا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا' اس دوران میرے والد کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تیر کی طرح میری طرف لپکے' انہوں نے مجھے ایک تھپڑ رسید کیا اور مجھ سے فٹ بال چھین لیا' میں نے رونا شروع کر دیا' دکاندار میری طرف متوجہ ہوا' اس نے مجھے اٹھایا اور مجھے پیار کر کے چپ کرانے لگا' میرے والد اس دوران غصے سے میری طرف دیکھتے رہے' دکاندار نے آہستہ سے میرے کان میں سرگوشی کی "کیا تمہیں یہ فٹ بال پسند ہے" میں نے روتے روتے ہاں میں سر ہلا دیا' اس نے دوبارہ پوچھا "کیا تم یہ فٹ بال لینا چاہتے ہو" میں نے دوبارہ سر ہلا دیا' اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا "تم شام کو گھر جاتے ہوئے یہ فٹ بال لے جانا" میں یک دم خوش ہو گیا' میں نے ہاتھ کی مٹھیوں سے آنکھیں صاف کیں اور خوشی سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

میرا دوست خاموش ہوا' اس نے لمبی سانس بھری اور کہانی آگے بڑھائی "شام کو میں والد کے ساتھ گھر جانے لگا تو دکاندار نے سٹینڈ سے فٹ بال اٹھایا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا' میرے والد پریشان ہو گئے اور انہوں نے دکاندار سے کہا "شیخ صاحب یہ بہت مہنگا فٹ بال ہے' یہ بچہ ہے آپ اس کے رونے پر نہ جائیں" دکاندار نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور شفقت سے بولا "لیکن یہ فٹ بال اس بچے کی خوشی سے مہنگا نہیں' یہ بال یہی لے کر جائے گا' میں سفیر سے معذرت کر لوں گا" میرے والد نے بہت سمجھایا لیکن دکاندار نے وہ فٹ بال مجھے دے دیا۔ میرے والد نے مجھے راستے میں بتایا یہ فٹ بال تین ہزار روپے میں بنا تھا اور یہ برطانیہ کے سفیر نے خصوصی طور پر بنوایا تھا' وہ اسے لندن بھجوانا چاہتا تھا لیکن دکاندار نے اپنے ایک معمولی ملازم کے بچے کا دل رکھنے کیلئے وہ فٹ بال مجھے دے دیا۔ یہ وہ واقعہ تھا جس نے میرے والد اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس شخص کا خادم بنا دیا۔ والد نے اس کے بعد نوکری نہیں بدلی' وہ آج تک صرف اس فٹ بال کی وجہ سے اس دکاندار کی خدمت کر رہے ہیں' میں پڑھ لکھ گیا' میں نے انجینئرنگ کی اور نوکری کے بجائے اپنا کام شروع کر دیا' یہ کام اللہ کے کرم سے فیکٹری میں تبدیل ہو گیا لیکن میرے والد آج تک اس شخص کی خدمت کر رہے ہیں' میرے والد اور مجھے اس فٹ بال کا احسان نہیں بھولتا" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ رکا اور دوبارہ بولا "بات صرف یہاں تک محدود نہیں بلکہ یہ تجربہ مجھے مینجمنٹ کا سب سے بڑا اصول سکھا گیا' مجھے معلوم ہوا اگر آپ ملازمین کو اپنا وفادار بنانا چاہتے ہیں تو آپ اس دکاندار کی طرح ملازمین کے بچوں سے محبت کریں' آپ ملازمین کے بچوں کو اپنے بچے سمجھیں' لوگ اپنی پوری زندگی آپ کی خدمت میں گزار دیں گے چنانچہ میں اپنی فیکٹری کے تمام ملازمین کے بچوں کے اخراجات اٹھاتا ہوں' میں ان کا کتابوں سے لے کر کپڑوں' جوتوں اور فٹ بالوں تک کا خرچ برداشت کرتا ہوں اور میری اس حکمت عملی کا نتیجہ ہے میں نے جب سے یہ کام شروع کیا ہے میرا کوئی ملازم مجھے چھوڑ کر نہیں گیا اور میرے رزق اور آمدنی میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا" اس نے اتنا کہا اور جوتا تلاش کرنے کیلئے میز کے نیچے گھس گیا۔

میں گیٹ کے اندر داخل ہو گیا' سامنے فوج کے کمانڈوز کھڑے تھے' بیرک میں سے سیکورٹی کا کتالایا گیا' جرمن کتے نے گاڑی سونگھی اور مایوسی میں سر ہلا دیا' سیکورٹی آفیسر نے وائرلیس پر کوڈ ورڈز میں کوئی پیغام دیا' دوسری طرف سے فوراً جواب آ گیا' سیکورٹی آفیسر نے ہوا میں ہاتھ ہلایا اور بیریئرز اوپر اٹھنے لگے' میں صدارتی کیمپ آفس میں داخل ہو گیا۔

میں اس عمارت میں چوتھی بار داخل ہو رہا تھا۔ میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ آرمی ہاؤس تھا اور اس وقت صدر پرویز مشرف محض جنرل پرویز مشرف تھے اور انہوں نے چند دن پہلے آرمی چیف کا عہدہ سنبھالا تھا۔ میں دوسری بار آیا تو جنرل پرویز مشرف' صدر جنرل پرویز مشرف ہو چکے تھے اور اس عمارت پر صدارتی کیمپ آفس کی تختی لگ چکی تھی۔ تیسری مرتبہ 9 مارچ کا تازہ تازہ واقعہ ہوا تھا اور صدر پرویز مشرف نے واقعے کا پس منظر بتانے کیلئے چھ صحافیوں کو کیمپ آفس بلایا تھا اور آج میں چوتھی مرتبہ اس عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ عمارت کی آن بان اور شان وہی تھی' کیمپ آفس کے ڈرائیووے کے سامنے سنگی چہرے والے کمانڈوز بھی اسی طرح کھڑے تھے' صدر کے دفتر کے سامنے بھی فوج کے خوبصورت جوان کھڑے تھے' عمارت کے اندر باوردی بیرے بھی اسی طرح احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے اور صدر کے اے ڈی سی' ملٹری سیکرٹری اور عملے کے دوسرے ارکان بھی سینہ تان کر کھڑے تھے لیکن اس کے باوجود اس عمارت' اس ماحول میں کسی چیز کی کمی تھی' وہاں کوئی چیز تھی جو پہلے نہیں ہوا کرتی تھی یا پھر اس بار وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی' وہ چیز کیا تھی؟ میں نے اس مسنگ ایلیمنٹ کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھا' شائد وہاں اعتماد کی کمی تھی' شائد بے یقینی کے سائے تھے یا پھر شائد وہاں طوفان سے پہلے کی خاموشی یا بدلتے ہوئے مقدر کی چاپ تھی۔ وہاں کچھ تھا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم کے اسی صوفے پر بیٹھا دیا گیا جس پر 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری بیٹھے تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سامنے صوفے کی طرف دیکھا اور مجھے وہ تاریخی تصویر یاد آ گئی جس میں ٹھیک میری جگہ افتخار محمد چودھری بیٹھے تھے اور دائیں بازو کے سنگل صوفے پر صدر جنرل پرویز مشرف اور پھر اس تصویر نے ایک ایسے بحران کو جنم دیا تھا جس کی لہریں ابھی تک اس ایوان کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا رہی ہیں۔ میں نے افسوس سے گردن ہلائی اور سوچا بعض لمحے' بعض تصویریں اور بعض فیصلے کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ اگر 9 مارچ 2007ء کو یہ "سٹینگ اریجنمنٹ" نہ ہوتا اگر اس صوفے پر افتخار محمد چودھری کو نہ بٹھایا جاتا اور صدر اس صوفے پر بیٹھ کر چیف جسٹس کو بدلنے کا فیصلہ نہ کرتے تو آج حالات کیا ہوتے؟ میں ابھی اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا کہ میرے سامنے دونوں دروازے کھلے اور میجر جنرل ریٹائرڈ راشد قریشی اندر آ گئے' ان کے ہاتھ' چہرے اور آواز کی گرم جوشی تاحال قائم تھی۔ میں نے ان سے عرض کیا "جناب میں آپ اور طارق عزیز کا دل سے احترام کرتا ہوں" انہوں نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا "اس کی وجہ آپ لوگوں کی وفاداری ہے' اس وقت جب انسان کا سایہ بھی پرایا ہو جاتا ہے آپ دونوں اس وقت بھی صدر پرویز مشرف کے ساتھ کھڑے ہیں' وفاداری اور کردار دنیا میں سب سے اہم ہوتے ہیں' انسان اور بٹیر میں فرق ہونا چاہئے" جنرل نے قہقہہ لگایا اور کہا "ہم آخری سانس تک صدر کے ساتھ ہوں گے" دروازہ ایک بار پھر کھلا' صدر کے ایم ایس اندر داخل ہوئے اور مہذب آواز میں بتایا "صدر ملاقات کیلئے ریڈی ہیں" ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے' باوردی دربانوں نے دروازے کھولے اور میں چند لمحے بعد صدر پرویز مشرف کے سامنے کھڑا تھا۔

صدر تیزی سے میری طرف بڑھے اور ہاتھ ملا کر بولے "ہاؤ آر یو جاوید" میں نے کہا "سر مجھے چھوڑیئے آپ اپنی بتایئے' آپ کیسے ہیں" صدر نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا "آئی ایم فائن' لوگوں نے میرے بارے میں غلط خبریں پھیلا رکھی ہیں" میں صدر کے سامنے بیٹھ گیا' صدر نے چند لمحے سوچا اور اس کے بعد بولے "میں تمہارے پروگرام دیکھتا ہوں' کالمز پڑھتا ہوں' مجھے محسوس ہوتا ہے تم منفی دماغ (نیگیٹو مائنڈڈ) شخص ہو' تمہارے پاس معلومات کی کمی ہے جس کی وجہ سے تم ادھوری تصویر پینٹ کرتے ہو' میں نے سوچا میں تمہیں بلاؤں اور تمہیں اصل حقائق بتاؤں" میں نے عرض کیا "صدر صاحب آپ نے درست فرمایا' میں واقعی ایک منفی ذہن کا شخص ہوں' صرف آپ نہیں بلکہ پاکستان پیپلز پارٹی' مسلم لیگ ن اور مسلم لیگ ق کی قیادت بھی مجھے منفی سمجھتی ہے" صدر نے حیرت اور دلچسپی سے میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا "پاکستان میں دو قسم کے صحافی

ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں ساری رولنگ کلاس مثبت سمجھتی ہے لیکن عوام انہیں منفی خیال کرتے ہیں اور دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جنہیں رولنگ ایلیٹ منفی خیال کرتی ہے مگر عوام مثبت سمجھتے ہیں‘ میں شمار کیونکہ دوسری قسم میں ہوتا ہے لہٰذا حکمران کلاس مجھے پسند نہیں کرتی“ صدر مسکرائے اور انہوں نے بات بدل دی‘ انہوں نے فوراً ریٹائرڈ فوجی افسروں کا ذکر شروع کر دیا‘ مجھے محسوس ہوا وہ اپنے سابق فوجی دوستوں کے رویے سے بہت دل گرفتہ ہیں اور میں جتنی دیر ان کے پاس بیٹھا رہا وہ زیادہ تر وقت ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے“ صدر کا کہنا تھا ”وہ جب ایسے ایسے لوگوں کو اپنے خلاف بات کرتے دیکھتے ہیں جو ان کے بہت قریب رہے تھے اور جنہوں نے ان سے بے شمار مفادات حاصل کئے تھے تو انہیں بہت افسوس ہوتا ہے اور اس وقت انہیں حضرت علیؓ کا وہ قول یاد آ جاتا ہے کہ تم جس شخص پر احسان کرو‘ اس کے شر سے بچو“ صدر کا کہنا تھا ”ایکس سروس مین میں ایک میجر بھی شامل ہے‘ یہ میرا بیچ میٹ تھا اور سپاہی سے ترقی کر کے پی ایم اے میں پہنچا تھا‘ اکیڈمی میں تمام لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور میں اسے سپورٹ کرتا تھا‘ اسے انگریزی نہیں آتی تھی اور میں اسے کہتا تھا تم انہیں پنجابی میں گالیاں دیا کرو‘ تم ان کے برابر ہو‘ وہ میجر کے رینک سے ریٹائر ہوا تو میں اس وقت بریگیڈیئر تھا‘ میں اس کی نوکری کی درخواست لے کر جرنیل کے پاس گیا تھا‘ وہ اس نوکری سے نکالا گیا تو میں نے دوسری جگہ اس کی نوکری کا بندوبست کیا لیکن وہ بھی اب میرے خلاف نعرے لگا رہا ہے“۔ صدر نے ایک ایسے سابق جرنیل کا ذکر کیا جس کے ساتھ ان کے گھریلو تعلقات تھے‘ صدر کا کہنا تھا ”وہ آخر میں سینیٹر بننا چاہتے تھے‘ میں نے معذرت کر لی تو وہ میرے خلاف ہو گئے“ میں نے عرض کیا ”لیکن وہ تو دعویٰ کر رہے ہیں آپ انہیں سینیٹر بنانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے معذرت کی تھی“ صدر نے فوراً جواب دیا ”جھوٹ‘ وہ بننا چاہتے تھے‘ میں نے معذرت کی تھی“ صدر نے ایک سابق جنرل کا ذکر کیا‘ ان کا کہنا تھا ”جب جنرل آصف نواز نے انہیں نوکری سے نکالا تھا تو وہ اس وقت بھی سٹاف کار اور یونیفارم میں ان سے ملنے جاتے تھے‘ 12 اکتوبر 1999ء کے بعد بھی وہ ان کے گھر جاتے رہے‘ وہ دو سال تک ان کے گھر ”وزٹ“ کرتے رہے لیکن جنرل کی خواہشات بڑی طویل تھیں‘ وہ کہتے تھے مشرف تم اب آرام کرو‘ ہم اس ملک کو سنبھال لیں گے“۔ صدر کا کہنا تھا ”وہ جنرل وزیراعظم بننا چاہتے تھے‘ ان کی خواہش پوری نہ ہوئی چنانچہ وہ بھی ان سے ناراض ہو گئے“۔ صدر نے ایک اور سابق جنرل کا ذکر کیا‘ ان کا کہنا تھا ”میں نے انہیں سعودی عرب میں سفیر بنایا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو بہت بڑا فلاسفر سمجھتے ہیں‘ وہ شاہی خاندان سے ملتے تھے اور نہ ہی فارن آفس کو رپورٹ کرتے تھے‘ وہ وہاں بری طرح فیل ہو گئے‘ ہم نے انہیں واپس بلایا تو وہ بھی ناراض ہو گئے“۔ صدر نے ایک اور جرنیل کا نام لیا اور کہا ”میں نے اسے بلوچستان کا گورنر بنایا‘ وہ بگٹی کے معاملے میں کچھ نہ کر سکے‘ وہ بگٹی سے ڈرتے تھے‘ وہ اس سے میٹنگ تک نہیں کرتے تھے اور آخر میں انہوں نے اس جرنیل کا ذکر بھی کیا جو آج کل صدر کے حوالے سے خبروں میں بہت ”ان“ ہیں۔ صدر کا کہنا تھا وہ جب تک یونیفارم میں رہے انہوں نے فوج کی کسی میٹنگ میں منہ نہیں کھولا تھا‘ وہ ”گ گو“ بن کر میرے سامنے بیٹھے رہتے تھے‘ میں نے انہیں فیڈرل سروسز کمیشن کا چیئرمین لگایا بعدازاں ہم نے چیئرمین کی مدت ملازمت میں کمی کی تو وہ بھی ناراض ہو گئے“۔ صدر کا کہنا تھا ”یہ سب لوگ اپنے اپنے وقت پر مجھ سے مفاد لیتے رہے تھے لیکن اب یہی لوگ ایماندار بھی بن گئے ہیں‘ جرات مند بھی اور انقلابی بھی اور میں ان کے بیان پڑھ پڑھ کر حیران ہوتا رہتا ہوں“

صدر نے اس کے بعد شوکت عزیز سے لے کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بے شمار باتیں کیں لیکن یہ تمام باتیں میں اپنے کسی آئندہ کالم پر اٹھا رکھتا ہوں۔ سردست میں اتنا بتاتا چلوں میں جب صدارتی کیمپ آفس سے باہر نکلا تو گیٹ تک اداسی اور خاموشی کے ڈھیر لگے تھے اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا درخت سوکھ رہا ہے اور پرندے اڑ چکے ہیں۔

ہم گیارہ بج کر 41 منٹ پر ڈی جی خان کے ائیرپورٹ پر اترے' وزیراعلیٰ کے 8 سیٹر طیارے کا اندرونی درجہ حرارت معتدل تھا جبکہ باہر گرم ہوا کے بگولے اٹھ رہے تھے' ائیرپورٹ پر پولیس کے چاق و چوبند دستے وزیراعلیٰ کو گارڈ آف آنر پیش کرنے کیلئے کھڑے تھے' میاں شہباز شریف کی نظر جوں ہی ان دستوں پر پڑی ان کی پیشانی پر غصے کی لکیریں ابھر آئیں' انہوں نے اپنے پی ایس عظمت کو گھور کر دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا ''میں نے منع کیا تھا میں پروٹوکول اور گارڈ آف آنر نہیں لوں گا پھر یہ لوگ کیوں کھڑے ہیں'' اس کے ساتھ ہی میاں شہباز شریف کی نظر سرخ قالین پر پڑ گئی' انہوں نے دوبارہ عظمت کو گھورا' عظمت نے فوراً جواب دیا ''سر میں نے ڈی آئی جی اور ڈی سی او کو واضح طور پر آپ کی ہدایات ''کنوے'' کر دی تھیں'' میاں شہباز شریف نے واسکٹ پہنتے ہوئے اسے ہدایت کی ''تم فوراً نیچے اترو' پولیس کے ان دستوں کو واپس بھجواؤ' یہ کارپٹ اٹھاؤ اور جس نے یہ حرکت کی ہے اسے اسی وقت معطل کر دو'' عظمت نے سیٹ بیلٹ کھولی' میاں شہباز شریف نے مزید کہا ''اور جب تک پولیس کا بینڈ اور یہ دستے واپس نہیں جائیں گے' میں اس وقت تک جہاز سے نیچے نہیں اتروں گا'' عظمت نے فائل اٹھائی اور جہاز کے دروازے کے قریب پہنچ گیا' جہاز ٹیکسی کرتا ہوں لاؤنج کے قریب جاکر رک گیا اور ذوالفقار علی کھوسہ اور دوست محمد کھوسہ چیف منسٹر کے استقبال کیلئے جہاز کی طرف چل پڑے' میں میاں شہباز شریف کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور فقرہ پاس کیا'' پنجاب کی بیوروکریسی کو ابھی تک یقین نہیں آیا میاں شہباز شریف واپس آ چکا ہے'' میاں شہباز شریف نے واسکٹ کی سلوٹیں سیدھی کیں اور سنجیدگی سے جواب دیا'' آج آ جائے گا''۔

یہ بارہ جون کی گرم صبح تھی' میاں شہباز شریف چیف منسٹر کا حلف اٹھانے کے بعد پہلے دورے پر ڈی جی خان جا رہے تھے' انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہاں سے میری زندگی کے مشکل ترین دن کا آغاز ہوا' میں ساڑھے نو بجے ڈیفنس میں میاں شہباز شریف کی رہائش گاہ پہنچ گیا اور میاں صاحب کے ساتھ گپ شپ شروع ہو گئی' ہم نے دس بجے ڈی جی خان جانا تھا لیکن معلوم ہوا وزیراعلیٰ کا جہاز گورنر سلیمان تاثیر فیصل آباد لے گئے ہیں' گورنر صاحب اپنے کسی دوست سے ملاقات کیلئے فیصل آباد گئے تھے' جنرل خالد مقبول اور چودھری پرویزالٰہی کے دور میں وزیراعلیٰ اور گورنر کے مشترکہ استعمال کیلئے جیٹ طیارہ خریدا گیا تھا' گورنر ہاؤس اس طیارے کا ''انچارج'' تھا' اپریل میں حکومت بدل گئی لیکن طیارہ بدستور گورنر ہاؤس کے پاس رہا اور وزیراعلیٰ یہ طیارہ گورنر کی اجازت سے استعمال کرتے ہیں' بارہ جون کو گورنر صاحب جہاز فیصل آباد لے گئے تھے اور وزیراعلیٰ طیارے کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے' میاں شہباز شریف کیلئے بلاوجہ انتظار بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے پرنسپل سیکرٹری توقیر شاہ کو بلوایا اور ان سے پوچھا'' وزیراعلیٰ کا پرانا جہاز کہاں ہے'' توقیر شاہ نے بتایا ''سر وہ بہت پرانا جہاز ہے اور پچھلی حکومت نے اسے ناکارہ قرار دے کر پارک کر دیا تھا'' میاں شہباز شریف نے حکم دیا'' نیا جہاز گورنر صاحب کو ہینڈاوور کر دو اور پرانا جہاز ٹھیک کروا دو' میں آئندہ وہ جہاز استعمال کروں گا'' توقیر شاہ نے جھجکتے ہوئے عرض کیا'' سر وہ ذرا رسکی ہے'' میاں شہباز شریف مسکرائے اور کہا'' کیا نئے جہاز میں کوئی رسک نہیں' انسان کی حفاظت اللہ تعالیٰ کی ذات کرتی ہے' تم وہ جہاز ٹھیک کراؤ' باقی اللہ مالک ہے'' اسی دوران جہاز فیصل آباد سے لاہور پہنچ گیا اور ہم چیف منسٹر کے ذاتی گھر سے نکل کھڑے ہوئے' چیف منسٹر کی بلیک مرسڈیز جوں ہی گھر سے باہر نکلی اور سیکورٹی کی گاڑیوں نے ان کی گاڑی کو نرغے میں لے لیا تو میاں شہباز شریف نے اوپر کی طرف دیکھا' کانوں کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ اور شکر کرنے لگے' میں نے مسکرا کر کہا'' میاں صاحب آپ اس بار درویش وزیراعلیٰ کی لک دے رہے ہیں'' میاں شہباز شریف نے دوبارہ کانوں کو ہاتھ لگایا اور گلوگیر آواز میں بولے '' یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے اس نے مجھے جلاوطنی سے واپس بلا کر دوبارہ تخت پر بٹھا دیا' میں جب بھی اس گاڑی میں بیٹھتا ہوں تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں' اپنے گناہوں کی توبہ کرتا ہوں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں وہ مجھے تکبر' غصے اور ظلم سے بچائے' وہ مجھے لوگوں کی خدمت کرنے کی توفیق دے'' اس دن وکلاء کا لانگ مارچ لاہور پہنچا تھا اور میاں نواز شریف نے اس مارچ سے خطاب کرنا تھا' میاں شہباز شریف نے ڈی آئی جی لاہور کو فون کیا' ان سے لانگ مارچ کے انتظامات کے بارے میں پوچھا اور اس کے بعد ان سے پوچھا'' کیا جلسہ گاہ میں میاں صاحب کیلئے بلٹ پروف راسٹرم رکھوا دیا گیا ہے اور کیا میاں صاحب کی سیکورٹی کا پورا پورا بندوبست ہے'' ڈی آئی جی کی بات سن کر میاں شہباز شریف نے کہا'' جب میاں صاحب وہاں پہنچیں تو

جلسہ گاہ کے دائیں بائیں تمام مکانات کی چھتوں پر پولیس کمانڈوز کھڑے کر دیں لیکن اس کیلئے مہذب جوانوں کا انتخاب کیا جائے اور چھتوں پر چڑھنے سے پہلے مالکان سے باقاعدہ اجازت لی جائے' آبادی کے کسی شخص کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے'' میں نے اس ساری گفتگو سے اندازہ لگایا میاں شہباز شریف میاں نواز شریف کی سیکورٹی کے بارے میں بہت پریشان ہیں' وہ باقی دن بھی لاہور فون کر کے لانگ مارچ اور میاں صاحب کی سیکورٹی کے بارے میں پوچھتے رہے' میں نے دوران سفر میاں شہباز شریف سے اس دور دراز علاقے کے دورے کے بارے میں پوچھا' میاں شہباز شریف کا کہنا تھا'' میرے پچھلے دور میں مجھ پر الزام لگایا جاتا تھا کہ میں صرف لاہور کو پنجاب سمجھتا ہوں اور حکومت کی ساری توانائیاں صرف لاہور' راولپنڈی اور فیصل آباد پر صرف ہو رہی ہیں گو میں اس تاثر کو غلط سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں اس بار پنجاب کے دور دراز اور چھوٹے علاقوں پر زیادہ توجہ دوں گا' یہی وجہ ہے میں وزیر اعلیٰ بننے کے تیسرے دن ڈی جی خان جا رہا ہوں' میں اس کے بعد دوسرے دور دراز اور محروم علاقوں کا انتخاب کروں گا''۔

ڈی جی خان پہنچنے کے بعد میاں شہباز شریف نے ڈی سی او اور ڈی آئی جی کی ''کھچائی'' کے ساتھ ساتھ شہر میں میڈیکل کالج اور واٹر سپلائی کی سکیم کا افتتاح کیا' انہوں نے ذمہ داروں کو ہدایت کی اگلے 48 گھنٹوں کے اندر واٹر سپلائی کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہئے' اس کے بعد انہوں نے جلسے سے خطاب کیا' اس دن ڈی جی خان میں 48 درجے سینٹی گریڈ گرمی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا میرا سر آہستہ آہستہ پگھل رہا ہے' میں میاں شہباز شریف سے آنکھ بچا کر جلسہ گاہ سے نکلا اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا' ساڑھے تین بجے ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور میاں شہباز شریف نے یہ ہیلی کاپٹر تونسہ شریف میں اتروا دیا' چیف منسٹر نے تونسہ شریف کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹ قیصرانی کے بنیادی مرکز صحت کا اچانک دورہ کیا' بی ایچ یو کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی' واش روم سے بو آ رہی تھی' کمروں میں مٹی کے ڈھیر لگے تھے اور 8 افراد کے عملے میں سے صرف دو ملازم وہاں موجود تھے' ڈاکٹر صاحب فورٹ منرو کے دورے پر تھے' بی ایچ یو کے ملازمین نے ''افراتفری'' میں سنٹر کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن وہاں پہنچ کر صاف معلوم ہو رہا تھا سینٹر میں تازہ تازہ جھاڑو پھیری گئی ہے' گاؤں میں واٹر سپلائی کی سکیم موجود تھی لیکن وہ برسوں سے بند پڑی تھی چنانچہ لوگ 8 روپے فی مٹکا کے حساب سے پانی خریدتے تھے' میاں شہباز شریف یہ حالت دیکھ کر دکھی ہو گئے اور انہوں نے وہاں سیکرٹریوں کو مخاطب کر کے کہا'' کیا ہم نے اللہ کو منہ نہیں دکھانا' یہ حالت دیکھ کر پتہ نہیں ہمیں نیند کیسے آئے گی'' میاں صاحب راستے میں بھی بار بار کف افسوس ملتے تھے اور ٹھنڈی آہ بھر کر باہر دیکھتے تھے' انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا'' یہ ہے اصل پاکستان' یہ ہیں اصلی پاکستانی اور جب تک ہم یہاں کھڑے ہو کر ملک کو نہیں دیکھیں گے' ہمیں ملک کے اصل مسائل کا اندازہ نہیں ہو گا''۔

ہم آٹھ بجے رات واپس لاہور پہنچے' چیف منسٹر کے مشیر پرویز رشید سے ٹیلی فون پر میری بات ہوئی تو انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا'' دن کیسا گزرا'' میں نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا'' مجھے محسوس ہوتا ہے آپ کے لیڈر نے اپنے جسم میں ایئر کنڈیشنر لگا رکھا ہے'' وہ بولے ''کیوں؟'' میں نے عرض کیا'' جو شخص 48 سینٹی گریڈ کی گرمی میں بھی نہیں تھکتا اس کے بارے میں اور کیا کہا جا سکتا ہے'' پرویز رشید نے سنجیدگی سے جواب دیا'' یار اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو بڑی توانائی سے نواز رکھا ہے'' میں نے ہاں میں سر ہلایا اور کہا'' اللہ تعالیٰ انہیں یہ توانائی لوگوں کی فلاح و بہبود کیلئے استعمال کرنے کی توفیق بھی دے''

میں اگر پاکستان کے دس بڑے سیاستدانوں کی فہرست بناؤں تو اعتزاز احسن کا نام کس جگہ آئے گا؟ میرے ذہن میں جب بھی یہ سوال آیا میں نے ہمیشہ اعتزاز احسن کو پہلے پانچ نمبروں میں رکھا' یہ حقیقت ہے اللہ تعالیٰ نے اعتزاز احسن کو بے تحاشا خوبیوں سے نواز رکھا ہے' یہ ذہین ہیں' ان کے اندر توانائی ہے' یہ ان تھک ہیں' یہ وژنری ہیں' ان کے اندر بیک وقت ایک فلاسفر' شاعر اور انقلابی سیاستدان بیٹھا ہے' یہ بلا کے مقرر ہیں اور یہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ان چند لیڈروں میں شامل ہیں جن کا اپنا ایک وژن اور ایک موقف ہے اور جو اس موقف کے اظہار سے گھبراتے نہیں ہیں۔ چودھری اعتزاز احسن کے خلوص اور نیک نیتی پر بھی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی چنانچہ میں ہمیشہ چودھری اعتزاز احسن کا فین رہا اور فین ہوں' 9 مارچ 2007ء کے بعد قدرت نے چودھری اعتزاز احسن کو قومی سطح کا لیڈر بننے کا موقع دیا اور چودھری صاحب نے یہ موقع ضائع نہیں کیا' یہ آگے بڑھے' انہوں نے افتخار محمد چودھری کا پرچم اٹھایا اور 16 ماہ تک بڑی استقامت سے جنگ لڑتے رہے' اس دوران انہیں ڈرایا بھی گیا' انہیں وزیراعظم' گورنر اور سفیر بنانے کی پیش کش بھی کی گئی' انہیں قید میں بھی رکھا گیا اور شاہراہ دستور پر انہیں سنگسار بھی کیا گیا لیکن یہ ڈٹے رہے' چودھری اعتزاز احسن کی اس استقامت کے باعث نہ صرف حقہ اسٹیبلشمنٹ' صدر اور مسلم لیگ ق کی حکومت ان کے ساتھ ناراض ہو گئی بلکہ ان کی اپنی پارٹی نے بھی ان کا پانی بند کر دیا' مجھے اچھی طرح یاد ہے جولائی 2007ء میں لندن میں اے پی سی ہوئی تھی' میاں نواز شریف اس اے پی سی کے میزبان تھے' مسلم لیگ ن چودھری اعتزاز احسن کو اے پی سی میں بلانا چاہتی تھی لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو نے یہ دعوت نامہ منسوخ کرا دیا' محترمہ شہید جب پاکستان آئیں تو اس وقت بھی چودھری اعتزاز احسن اور ان کے درمیان سرد مہری رہی' محترمہ کی شہادت کے بعد آصف علی زرداری اور چودھری اعتزاز احسن کے درمیان کھچاؤ شروع ہوا اور یہ کھچاؤ ایک وقت میں باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کر گیا لیکن چودھری اعتزاز احسن کے استقلال میں لرزش نہ آئی' چودھری اعتزاز احسن کی اس استقامت نے میرے جیسے بے شمار جذباتی صحافیوں کے دل میں ان کے احترام میں اضافہ کر دیا لیکن پھر 13 جون 2008ء کی رات آئی اور صبح کے سورج کے ساتھ بے شمار خدشات بھی طلوع ہو گئے' اس رات چودھری اعتزاز احسن پورے ملک سے دو اڑھائی لاکھ لوگوں کو اسلام آباد لائے تھے لیکن پھر چودھری اعتزاز احسن نے اچانک عوامی توقعات اور خواہشات کے خلاف اس لانگ مارچ کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا' میں اس وقت جلسے میں موجود تھا' میں نے اپنی آنکھوں سے نوجوان وکلاء کو چودھری اعتزاز احسن کے اس فیصلے پر دھاڑیں مار کر روتے دیکھا' نوجوان وکلاء نے کھڑے ہو کر چودھری اعتزاز احسن کے خلاف نعرے بھی لگائے تھے اور چند جذباتی نوجوان ڈنڈے لے کر بھی اعتزاز احسن کی طرف دوڑ پڑے تھے اور پھر یہاں سے چودھری اعتزاز احسن کے خلاف عوامی جذبات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے لانگ مارچ کا کیا بنا؟ کیا یہ ناکام ہو گیا اور اگر یہ ناکام رہا تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ وکلاء کے چند گروپ اس کا ذمہ دار چودھری اعتزاز احسن کو ٹھہرا رہے ہیں جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بعض لیڈروں سمیت بے شمار سیاستدان اس واقعے کو اعتزاز اور زرداری کا گٹھ جوڑ قرار دے رہے ہیں لیکن میں اس تھیوری سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا ذاتی خیال ہے اس لانگ مارچ کے دوران وکلاء کی قیادت سے کچھ غلطیاں ضرور ہوئی تھیں لیکن اس میں ان لوگوں کی بدنیتی ہرگز شامل نہیں تھی مثلاً چودھری اعتزاز احسن کی پہلی غلطی پاکستان پیپلز پارٹی تھی' پارٹی کی قیادت نے انہیں جون 2007ء ہی میں دھتکار دیا تھا لیکن وہ پارٹی کے ساتھ چپٹے رہے' وہ آخری وقت تک پارٹی کی قیادت سے رابطے میں بھی رہے' اگر اعتزاز احسن پارٹی کو چھوڑ کر مکمل طور پر وکلاء تحریک کا حصہ بن جاتے تو شاید آج ان کی طرف انگلیاں نہ اٹھتیں لیکن وہ یہ غلطی مسلسل دہراتے رہے' وہ ایک طرف لانگ مارچ کا اعلان بھی کرتے تھے اور دوسری طرف پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی میٹنگ میں بھی شریک ہوتے تھے' وہ ایک طرف وکلاء کی ''کلوز میٹنگز'' کی صدارت بھی کرتے تھے اور دوسری طرف آصف علی زرداری سے ون ٹو ون ملاقاتیں بھی کرتے تھے اور وہ ایک طرف ججز کی بحالی کیلئے پیپلز پارٹی کی حکومت سے ٹکرانے کا اعلان بھی کرتے تھے اور دوسری طرف پارٹی ٹکٹ کیلئے درخواست بھی دیتے تھے چنانچہ ان کو اس غلط پالیسی کا نقصان ہوا اور وکلاء بالخصوص نوجوان وکلاء ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے۔

چودھری اعتزاز احسن کی دوسری بڑی غلطی لانگ مارچ سے وابستہ عوامی توقعات تھیں' چودھری صاحب اور ان کے ساتھی جب تقریریں کرتے تھے تو وہ یہ کہتے تھے ہم پیٹ پر پتھر باندھ لیں گے لیکن پیچھے نہیں ہٹیں گے' یہ

جنگ ہے اور ہمارا ہاتھ ہوگا اور صدر پرویز مشرف کا گریبان اور ہم معطل ججز کو بحال اور صدر کو ایوان صدر سے باہر نکالے بغیر واپس نہیں آئیں گے چنانچہ ان لوگوں کی ان جذباتی تقریروں سے عوام اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ وکیل اسلام آباد پہنچ کر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا دیں گے اور جب تک ججز بحال نہیں ہوں گے یہ لوگ وہاں سے نہیں ہلیں گے' یہ تاثر لانگ مارچ کے ساتھ ساتھ جڑ پکڑ تا چلا گیا لیکن وکلاء کی قیادت نے کسی بھی جگہ اس تاثر کی تصحیح کرنے کی کوشش نہیں کی' چودھری اعتزاز احسن کو چاہئے تھا وہ لانگ مارچ شروع ہونے سے پہلے یہ اعلان کر دیتے ہم لانگ مارچ کر رہے ہیں اور 13 جون کو اسلام آباد پہنچ کر یہ لانگ مارچ ختم ہو جائے گا لیکن اس کے بجائے یہ لوگ سارا راستہ یہ کہتے رہے کہ ہم اگلے لائحہ عمل کا فیصلہ اسلام آباد پہنچ کر کریں گے چنانچہ جب ان لوگوں نے لانگ مارچ کے خاتمے کا اعلان کیا تو یہ عوام کیلئے غیر متوقع تھا اور یہاں سے پاکستانی تاریخ کا یہ شاندار واقعہ وکلاء کی بدنامی کا باعث بن گیا' چودھری اعتزاز احسن اور ان کے ساتھیوں کی تیسری بڑی غلطی ان کی نفسیاتی کمزوری تھی' یہ لوگ ٹرینڈ سیاستدان نہیں ہیں اور چودھری اعتزاز احسن بھی اپنی مقبولیت یا پوٹینشل کا صحیح اندازا نہیں لگا سکے تھے' انہیں ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ دو اڑھائی لاکھ لوگ ان کے پیچھے مارچ کرتے ہوئے اسلام آباد پہنچ جائیں گے چنانچہ یہ مارچ دیکھ کر چودھری اعتزاز احسن اور ان کے ساتھیوں کے اعصاب جواب دے گئے' دوسرا لانگ مارچ کے دنوں میں رحمان ملک اور ان کے ہرکارے بھی پوری طرح فعال تھے' ان لوگوں نے بھی افواہیں پھیلا پھیلا کر وکلاء کے اعصاب کمزور کر دیئے تھے' لانگ مارچ میں کبھی خودکش حملہ آوروں کی خبر آجاتی تھی' کبھی جلسہ گاہ میں بموں کی اطلاع آجاتی تھی اور کبھی حکومت نے جلسے میں ڈنڈا بردار نوجوان چھوڑ دیئے ہیں قسم کی خبریں آجاتی تھیں چنانچہ ان لوگوں کے اعصاب ان خبروں کا مقابلہ نہیں کر سکے اور یہ لوگ خوف کا شکار ہو گئے' ان لوگوں کی چوتھی غلطی بلکہ غلط فہمی سیاسی جماعتیں تھیں' ان لوگوں نے جب دو' اڑھائی لاکھ لوگ دیکھے تو ان کے دل میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ کہیں قاضی حسین احمد' عمران خان اور میاں نواز شریف وکلاء کی تحریک کو "ہائی جیک" نہ کر لیں' وکلاء کی اس غلط فہمی کو سیاستدان بھانپ گئے چنانچہ انہوں نے سٹیج چھوڑنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں کے ورکرز جلسے سے اٹھنے لگے اور اس دوران ایک ایسا وقت آگیا جب وکلاء کی قیادت کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی اور ان کے پاس لانگ مارچ کے خاتمے کے اعلان کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا لیکن چودھری اعتزاز احسن اور ان کے ساتھیوں کی ان تمام غلطیوں کے باوجود ہمیں یہ ماننا پڑے گا یہ پاکستان کی تاریخ کا شاندار ترین واقعہ تھا اور اس لانگ مارچ نے ثابت کر دیا عوام معطل ججز کی بحالی بھی چاہتے ہیں اور صدر کا مواخذہ بھی۔

ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا یہ لانگ مارچ ناکام نہیں تھا کیونکہ اس لانگ مارچ کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اور ججز کی بحالی اب چند دنوں کی بات ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے لانگ مارچ کے اچانک خاتمے سے ججز عوامی توقعات کے مطابق بحال نہیں ہوں گے۔ اب معطل ججز کو موجودہ ججز کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا اور ہماری اگلی سپریم کورٹ 29 ججز پر مشتمل ہو گی' حکومت کے اس فارمولے کو کراچی اور وفاق کے جج تسلیم کر چکے ہیں' بس لاہور ہائی کورٹ کے چند ججز اپنے موقف پر ڈٹے ہیں لیکن گورنر سلیمان تاثیر چند دنوں میں انہیں بھی قائل کر لیں گے اور جوں ہی بجٹ منظور ہو گا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا لیکن رہ گئی چودھری اعتزاز احسن کی نیک نیتی اور اخلاص تو میں سمجھتا ہوں 13 جون کی رات چودھری اعتزاز احسن نے غلطی ضرور کی تھی لیکن اس میں ان کی بدنیتی شامل نہیں تھی' انہوں نے اتنے لوگ اکٹھے تو کر لئے تھے لیکن وہ انہیں سنبھال نہیں سکے تھے' وہ ان سے کام نہیں لے سکے تھے اور یہ 16 ماہ میں اعتزاز کی پہلی کوتاہی تھی اور ظاہر ہے پہلی کوتاہی ہمیشہ قابل معافی ہوتی ہے چنانچہ ہمیں اعتزاز کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے ان کے اگلے ایکشن کا انتظار کرنا چاہیے اور یہ انتظار آج سے شروع ہوتا ہے۔

"تیرے استاد کی وہ" ڈرائیور نے کھڑکی سے باہر تھوکا اور شیشہ چڑھا دیا' میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے میرے غصے اور نفرت کو "اگنور" کر دیا اور مسلسل گالیاں بکتا چلا گیا۔

ہم معاشرے کے تمام طبقات پر تحقیق کرتے ہیں' طوائفوں کی نفسیات کیا ہوتی ہے؟ خواجہ سرا سوسائٹی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں' معیشت دان ملک کو کس نظر سے دیکھتے ہیں' غیر ملکی سفیروں کا نکتہ نظر کیا ہوتا ہے' مولوی ملک کو کس طرح بنانا چاہتے ہیں اور معاشرہ گھریلو ملازموں سے کیا سلوک کرتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ آپ کو پاکستان کے تمام طبقات کے بارے میں تحقیقی اور معلوماتی مواد مل جاتا ہے لیکن پاکستان کے کسی ادارے نے آج تک ڈرائیوروں کی نفسیات پر تحقیق نہیں کی۔ ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے کیا سوچتے ہیں' سڑک' ٹریفک پولیس' روڈ پر لگے سائن بورڈز اور گاڑیوں کی رفتار کے بارے میں ان کا نکتہ نظر کیا ہے اور ڈرائیور دوسرے ڈرائیوروں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں' اس کے بارے میں آج تک کبھی کوئی جامع سٹڈی نہیں ہوئی جبکہ ڈرائیور پورے ملک کے بھیدی ہوتے ہیں' یہ پورے ملک کی "آئی ایس آئی" ہوتے ہیں اور ان کا پورے ملک میں ایک شاندار نیٹ ورک ہے' صدر کس طرح سوچ رہے ہیں؟ وزیراعظم کیسے انسان ہیں؟ چیف منسٹرز کے مسائل کیا ہیں اور آرمی چیف ملک میں مارشل لاء تو نہیں لگا دے گا' اس کے بارے میں حتمی معلومات صرف اور صرف ڈرائیوروں کے پاس ہوتی ہیں کیونکہ دنیا کا بڑے سے بڑا صاحب اپنے ڈرائیور کے سامنے ننگا ہوتا ہے' آپ جتنے بھی بڑے فنکار ہوں لیکن آپ جوں ہی گاڑی میں بیٹھتے ہیں آپ کا سارا ملمع اتر جاتا ہے' آپ کی اداکاری ختم ہو جاتی ہے اور آپ فوراً اپنی اصلی حالت میں آ جاتے ہیں' اس وقت آپ کا ڈرائیور آپ کو "بیک مرر" سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور آپ صدر پرویز مشرف ہیں یا آصف علی زرداری آپ اس لمحے ڈرائیور کے سامنے اصل حلیے میں موجود ہوتے ہیں' ڈرائیور دنیا کے سب سے بڑے جاسوس ہوتے ہیں' آپ اپنے دوست یا کسی ملاقاتی کی اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے ڈرائیور سے پوچھئے' وہ آپ کو ایسی بات بتائے گا جو دنیا میں کسی شخص کو معلوم نہیں ہو گی۔ آپ یقیناً اس وقت حیران ہوں گے کہ آپ کے ملاقاتی یا دوست کی حقیقت آپ کا ڈرائیور کیسے بتا سکتا ہے؟ اس کی وجہ بہت دلچسپ ہے' ڈرائیوروں کی عادت ہوتی ہے صاحب جونہی گاڑی سے اتر کر اندر جاتا ہے تو وہ دوسرے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور جب تک صاحب اندر رہتا ہے وہ دونوں اپنے اپنے صاحبوں کی غیبت کرتے ہیں اور غیبت کے دوران دونوں صاحب ننگے ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا' میں ایک شام اچانک اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا' اس کے پاس اس وقت دو صاحب بیٹھے تھے' میرے دوست نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا "یہ دونوں حضرات یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں" میں نے ان کے ساتھ گپ شپ کی اور اٹھ کر آ گیا' راستے میں میرے ڈرائیور نے مجھے بتایا آپ کے دوست کے پاس جو لوگ بیٹھے تھے' وہ آئی ایس آئی میں ہیں اور ان میں سے ایک بریگیڈئر ہے اور دوسرا کرنل۔ میں اس کی معلومات پر حیران رہ گیا لیکن میرے لئے حیرت کا اصل لمحہ اس وقت آیا جب میرے ڈرائیور نے وہ کام بھی بتا دیا جس کیلئے وہ دونوں حضرات میرے دوست کے پاس آئے تھے اور ظاہر ہے یہ ساری معلومات اس نے ان کے ڈرائیور سے لی تھی۔

میں اصل موضوع کی طرف واپس آتا ہوں' میرے ڈرائیور نے کھڑکی کھول کر دوسرے ڈرائیور کے استاد کو گالی دی' میں نے ڈرائیور کو ڈانٹ دیا' ڈرائیور کا کہنا تھا "سر اس نے غلط کراس کیا تھا" میں نے فوراً کہا "غلطی اس کی تھی لیکن تم نے اس کے استاد کو کیوں گالی دی" ڈرائیور مسکرایا اور انکساری سے بولا "سر ہم ڈرائیوروں کا اصول ہے' ہم میں سے جب بھی کوئی غلطی کرتا ہے تو ہم اس کی بجائے اس کے استاد کو گالی دیتے ہیں" میں اس عجیب و غریب اصول پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا' ڈرائیور نے بتایا "ہمارے استاد جب ہمیں ڈرائیونگ سکھاتے ہیں تو وہ ہمیں بار بار کہتے ہیں دیکھو ٹھیک طریقے سے سیکھو' مجھے گالیاں نہ دلاتے رہنا" میرا ڈرائیور جب یہ بات بتا رہا تھا تو مجھے اپنا پنجابی کلچر یاد آ گیا' پنجابی میں ایک گالی ہے "برے دا" اس گالی کا مطلب ہوتا ہے یہ برے شخص کی اولاد ہے اور جب کوئی شخص کوئی غلط حرکت کرتا ہے یا کسی کے ساتھ زیادتی' ظلم یا بے ایمانی کرتا ہے تو لوگ اسے فوراً "برے دا" کہنا شروع کر دیتے ہیں' ہمارے پنجاب میں اولاد کی بے وقوفیوں' زیادتیوں اور غلطیوں کا ذمہ دار ہمیشہ خاندان اور والدین کو سمجھا جاتا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے پنجابی کی 99 فیصد گالیوں کا "مرکز" "خاندان" بہن بھائی' بچے' ماں اور والد ہیں۔ ہمارے پنجاب میں کہا جاتا ہے اگر اولاد بری یا خراب نکل آئے تو اس کے مرنے تک

لوگ اس کے والد کو گالی دیتے رہتے ہیں اور اگر اولاد اچھی' نیک' صالح' فرمانبردار اور اطاعت گزار ہو تو لوگ اس کے والد کی تعریف کرتے رہتے ہیں' لوگ اس کا کریڈٹ اس کے والد کو دیتے ہیں' ہمارے پنجاب میں [illegible] ہے جب بیٹا ذرا سا بڑا ہوتا ہے تو والد اسے ساتھ لے کر باہر نکلتا ہے' وہ اسے چوپال' پنچائیت اور دوستیوں' دشمنیوں کی ٹریننگ دیتا ہے اور لوگ اس بچے کی اٹھان سے اس خاندان کے مستقبل کے بارے میں اندازا لگاتے ہیں' میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ''فلاں چودھری کا بیٹا بڑا جی دار یا سمجھدار ہے' وہ جلد والد کا بوجھ اٹھا لے گا اور اگر لوگوں کو بیٹے میں بہادری' اصول اور جی داری کے جراثیم نظر نہ آئیں تو لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں ''بس جی یہ ڈیرہ صرف چودھری صاحب تک رہے گا'' میں کل تک اس روایت یا اصول کو صرف پنجاب تک محدود سمجھتا تھا لیکن 13 جون کو وکلاء کا لانگ مارچ اسلام آباد میں داخل ہوا اور میں نے اڑھائی لاکھ لوگوں کو ''گو مشرف گو'' کے نعرے لگاتے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا یہ پورے ملک کا اصول ہے' ہم اگر دنیا میں اچھا کام کرتے ہیں تو لوگ ہمارے والد کے نام سے زندہ باد' مبارک باد اور شاباش کے نعرے لگاتے ہیں اور اگر ہم ظلم اور زیادتی کرتے ہیں تو لوگ ہمارے والد کو برا بھلا کہتے ہیں۔ سید مشرف الدین ہمارے صدر پرویز مشرف کے والد ہیں اور وہ برسوں پہلے انتقال کر گئے تھے' ہمارے صدر کا نام پرویز ہے لیکن آج پورا ملک ''گو مشرف گو'' کے نعرے لگا رہا ہے۔ یہ میری اس لانگ مارچ کے بارے میں پہلی آبزرویشن تھی۔

میری دوسری آبزرویشن پاکستان پیپلز پارٹی اور آصف علی زرداری تھے' مجھے اچھی طرح یاد ہے مارچ 2007ء کے سانحے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی پہلی سیاسی جماعت تھی جو افتخار محمد چودھری کے لئے سڑکوں پر آئی تھی' میں نے اپنی آنکھوں سے مخدوم یوسف رضا گیلانی' پرویز اشرف' شاہ محمود قریشی' ڈاکٹر صفدر عباسی اور شیری رحمان کو شاہراہ دستور پر نعرے لگاتے دیکھا تھا۔ زمرد خان چیف جسٹس کی گاڑی چلا رہے تھے اور لوگ آگے بڑھ بڑھ کر ان کا ہاتھ چوم رہے تھے لیکن 13 جون کو وہی پیپلز پارٹی صدر پرویز مشرف کی صف میں شامل ہو گئی' وہ 9 مارچ اور 3 نومبر 2007ء کے ''ذمہ دار'' کے ساتھ مل گئی چنانچہ اس ''حکمت عملی'' پر پاکستان پیپلز پارٹی کا ورکر بہت مایوس ہے۔ لانگ مارچ کے ایک کونے میں زمرد خان شرمندہ شرمندہ کھڑے تھے' ان کے ساتھ صرف چار افراد تھے اور لوگ انہیں سلام کئے بغیر گزر رہے تھے۔ مجھے لانگ مارچ میں پیپلز پارٹی کے کئی ورکر ملے' یہ تمام ورکر اپنی قیادت کو نظر انداز کر کے جلوس میں شامل ہوئے تھے۔ 13 جون کا لانگ مارچ میاں نواز شریف' چودھری اعتزاز احسن' قاضی حسین احمد اور عمران خان کا شو تھا اور یوں لگتا تھا اس لانگ مارچ نے پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاست کو بری طرح متاثر کیا ہے جبکہ مسلم لیگ ن' میاں نواز شریف اور چودھری اعتزاز احسن کا گراف آسمان کو چھو رہا ہے۔

آج 14 جون ہے اور آج کے دن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اگر آنے والے ایک ہفتے میں حکومت نے معطل ججز بحال نہ کئے اور صدر پرویز مشرف کا مواخذہ نہ کیا تو وہ پاکستان پیپلز پارٹی اور ملک دونوں کیلئے گوربا چوف ثابت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے۔

میرے سامنے تین تصویریں پڑی ہیں' پہلی تصویر کے کونے میں 13 مارچ 2007ء لکھا ہے' دوسری تصویر کے بالکل نیچے چار نومبر 2007ء تحریر ہے جبکہ تیسری تصویر کے سرے پر 10 جون 2008ء چھپا ہے۔ میں نے تینوں تصویروں کو ایک لائین میں رکھ دیا اور یہ تصویریں سوا سال کی تاریخ بن گئیں۔ پہلی تصویر میں سینکڑوں لوگوں نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو کندھوں پر اٹھا رکھا ہے' لوگ نعرے لگا رہے ہیں' لوگوں کے پیچھے پارلیمنٹ ہاؤس' دائیں طرف سپریم کورٹ کی عمارت اور بائیں جانب ڈی چوک نظر آرہا ہے۔ یہ تصویر شاہراہ دستور سے کھینچی گئی تھی اور یہ اس دن کی تصویر تھی جب افتخار محمد چودھری معطل ہونے کے بعد پہلی بار سپریم کورٹ تشریف لائے تھے' چیف جسٹس کے سپریم کورٹ آنے سے قبل لوگوں نے شاہراہ دستور پر قبضہ کر لیا تھا' وکلاء اور سول سوسائٹی کے سینکڑوں نمائندے شاہراہ دستور پر سپریم کورٹ کے سامنے جمع تھے اور یہ صدر پرویز مشرف کے خلاف نعرے لگا رہے تھے' پولیس ہجوم سے قبل ''موقع واردات'' پر پہنچ گئی تھی لیکن اس نے ہجوم کو روکنے کی کوشش نہ کی' لوگ سپریم کورٹ کے سامنے جمع ہوئے اور نعرے لگانے لگے۔ اسی دوران چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سابق وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی کی گاڑی میں سپریم کورٹ کے سامنے پہنچ گئے' لوگوں نے انہیں دیکھا تو انہوں نے چیف جسٹس کو گاڑی سے نکالا اور کندھوں پر اٹھا لیا' یہ وہ اقدام تھا جو آگے چل کر پاکستان کی سب سے بڑی تحریک کا نقطہ آغاز بنا' یہ اس نقطہ آغاز کی تصویر تھی' دوسری تصویر 4 نومبر 2007ء کو لی گئی تھی' 3 نومبر 2007ء کی شام صدر پرویز مشرف نے ملک میں ایمرجنسی لگائی' نیا پی سی او نافذ کیا' حکومت نے افتخار محمد چودھری اور ان کے ساتھی ججوں کو گھروں میں محبوس کیا اور ان کی رہائش گاہوں کے سامنے پولیس' فوج اور رینجرز کے پہرے بٹھا دیئے' سول سوسائٹی اور وکلاء جمع ہوئے اور یہ لوگ ایک بار پھر پارلیمنٹ ہاؤس اور سپریم کورٹ کی طرف بڑھنے لگے لیکن حکومت اس وقت تک خاردار تاروں اور سیمنٹ کے بلاکس کی مدد سے شاہراہ دستور بلاک کر چکی تھی اور تاروں کے آگے اور پیچھے رینجرز مورچے بنا چکے تھے۔ یہ تصویر اس منظر کی گواہ تھی' تصویر میں خاردار تار کی ایک گول اور لمبی دیوار تھی' دیوار کے پیچھے رینجرز کے جوان مشین گنیں اٹھا کر کھڑے تھے' خاردار تار کے سامنے پولیس ہاتھوں میں ڈنڈے اور لوہے کی قد آدم پلیٹیں اٹھا کر کھڑی تھی اور ان کے سامنے وکلاء اور سول سوسائٹی کے نمائندے نعرے لگا رہے تھے' تصویر کے پس منظر میں سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس کے بعد تیسری تصویر کی طرف آگیا' تیسری تصویر دوسری دونوں تصویروں سے منفرد ہے' اس تصویر میں پارلیمنٹ کے بالکل سامنے پریڈ روڈ پر بڑے بڑے کنٹینرز پڑے ہیں' یہ کنٹینرز کی ایک پوری دیوار ہے اور پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت اس دیوار کے پیچھے چھپی ہے' کنٹینروں کی اوپری لائین سے صرف پارلیمنٹ ہاؤس کا جھنڈا نظر آرہا ہے' اس تصویر کا پس منظر کچھ یوں ہے' وکلاء نے 9 جون 2008ء کو کراچی سے لانگ مارچ شروع کیا' لانگ مارچ کے شیڈول کے مطابق وکلاء نے 11 تاریخ کو ملتان سے لاہور روانہ ہونا تھا' لاہور سے انہوں نے اسلام آباد آنا تھا اور اسلام آباد میں پہنچ کر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا دینا تھا۔ آج کے سیف الرحمان یعنی مشیر داخلہ رحمان ملک نے پارلیمنٹ ہاؤس اور سپریم کورٹ کو وکلاء اور سول سوسائٹی کی ''آلودگی'' سے بچانے کیلئے پریڈ روڈ پر بڑے بڑے کنٹینرز رکھوا دیئے' ان کنٹینرز نے دیواروں کی طرح شاہراہ دستور اور شاہراہ دستور پر موجود سپریم کورٹ' پارلیمنٹ ہاؤس' ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کو اپنے نرغے میں لے لیا۔

میں اس تصویر پر آیا تو میں بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا اور مجھے یہ تینوں تصویریں پاکستان میں جمہوریت کے سوا سال کی تاریخ محسوس ہونے لگیں اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا ہم نے اس جمہوریت کی دعائیں کی تھیں' کیا ہم سوا سال سے اس مقام پر پہنچنے کیلئے ڈنڈے اور ٹھڈے کھا رہے ہیں؟''۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب مارچ 2007ء کے مہینے میں شیری رحمان' راجہ پرویز اشرف اور مخدوم شاہ محمود قریشی شاہراہ دستور کی طرف بڑھ رہے تھے' پولیس نے ان کا راستہ روکا تھا تو ان تینوں لیڈروں نے حکومت کے اس اقدام کو بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور آمرانہ ہتھکنڈا قرار دیا تھا' ان لوگوں نے کہا تھا شاہراہ دستور پر جانا' سپریم کورٹ کے سامنے دھرنا دینا اور پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے جلسہ کرنا ان کا بنیادی حق ہے اور حکومت نے ان کے اس مطالبے کو سیکورٹی رسک قرار دے دیا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے محترمہ بینظیر بھٹو نے شہادت سے قبل معطل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے گھر جانے کی کوشش کی تھی لیکن پولیس نے انہیں منسٹر انکلیو کے شروع میں روک

دیا تھااور محترمہ نے بھی پولیس کے اس اقدام کو ریاستی دہشت گردی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا تھا' محترمہ نے اس جگہ کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا ہم افتخار محمد چودھری کو پاکستان کا چیف جسٹس سمجھتے ہیں ہم ان کے گھر کے سامنے جھنڈا لہرائیں گے۔ مجھے آج بھی یاد ہے پاکستان پیپلز پارٹی کے قائدین یوسف رضا گیلانی' مخدوم امین فہیم' رضا ربانی' ڈاکٹر صفدر عباسی' شاہ محمود قریشی' شیری رحمان' راجہ پرویز اشرف' جہانگیر بدر اور احمد مختار نے 3 نومبر کے اقدام کو مارشل لاء قرار دیا تھا اور اس دن کو جمہوریت اور انسانی حقوق کا سیاہ دن قرار دیا تھا لیکن آج وہی لیڈر ہیں اور وہی پاکستان پیپلز پارٹی ہے اور شاہراہ دستور پر کنٹینرز پڑے ہیں۔ مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوتا ہے وہ لوگ جنہوں نے نو مارچ اور تین نومبر کے دن دیکھے ہیں وہ جب یہ کنٹینرز دیکھتے ہوں گے تو انہیں اب پاکستان مسلم لیگ ق اور صدر پرویز مشرف اچھے لگتے ہوں گے' میں وہ پہلا شخص تھا جس نے 13 اکتوبر 1999ء کو اس وقت جنرل پرویز مشرف کے خلاف لکھا تھا جب میرے زیادہ تر ساتھی دائیں بائیں دیکھ رہے تھے اور ہماری سیاسی جماعتوں کے رہنما مٹھائیاں تقسیم کر رہے تھے' میں شروع دن سے مسلم لیگ ق اور صدر پرویز مشرف کا مخالف ہوں لیکن جب سے ہماری جمہوری حکومت طلوع ہوئی اور اس نے شاہراہ دستور پر کنٹینرز رکھوانے شروع کئے ہیں مجھے پہلی مرتبہ مسلم لیگ ق اور پرویز مشرف زیادہ برے محسوس نہیں ہو رہے۔ ذرا تصور کیجئے 9 مارچ کو شاہراہ دستور کھلی تھی' 13 مارچ 2007ء کو پورے ملک سے وکلاء اور سیاستدان اس شاہراہ پر آئے تھے اور انہوں نے سپریم کورٹ کے سامنے معطل چیف جسٹس کو کندھوں پر اٹھایا تھا' 20 جولائی تک یہ شاہراہ کھلی رہی تھی' اس پر جلوس بھی نکلتے رہے تھے اور جلسے بھی ہوتے رہے تھے' 3 نومبر کو اس پر خاردار تاریں لگا دی گئیں لیکن آج کے جمہوری دور میں اس سڑک پر کنٹینرز کی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے' کیا یہ تھا وہ خواب جو ہماری آنکھیں نو برسوں تک بنتی رہیں اور کیا یہ جمہوریت کی وہ فصل ہے جو ہم نے برسوں تک بوئی تھی اور جس کے بارے میں ہمارا خیال تھا جب اس کے کٹنے کا وقت آئے گا تو ہمارے سارے دکھ' ہماری ساری تکلیفیں ختم ہو جائیں گی اور ہم ایک ایسا سویرا دیکھ پائیں گے جس میں عدل ہوگا' انصاف ہوگا' میرٹ ہوگا اور بنیادی انسانی حقوق ہوں گے۔ کیا یہ ہے وہ دن جس کیلئے ہم نے قربانی دی تھی۔

میں ابھی کنٹینروں والی تصویر سے ''لطف اندوز'' ہو رہا تھا کہ ٹیلی ویژن سکرین پر یہ منظر دکھایا جانے لگا کہ آصف علی زرداری کے حکم پر کنٹینرز ہٹائے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ لانگ مارچ پر آنے والوں کے لئے ٹائلٹس بننے شروع ہو گئے ہیں۔ ایک حکم پر کنٹینرز کھڑے کئے گئے دوسرے پر ہٹا دیئے گئے۔ منظر بدل گیا لیکن منظر بدلنے سے کیا ہوتا ہے...... کاش ہمارے نئے حکمرانوں کی سوچ اور فیصلے بھی بدل جائیں۔

میں نے کل 10 مارچ سے 17 مارچ تک' 4 نومبر سے 11 نومبر تک اور 4 جون سے 10 جون 2008ء تک کے اخبارات نکلوائے اور ان تمام اخبارات کو فرش پر بچھا کر بیٹھ گیا' میں ان تین ہفتوں میں اخبارات میں چھپنے والے بیان دیکھ کر حیران رہ گیا' آپ کو بھی یہ جان کر حیرت ہو گی' مارچ اور نومبر میں جو بیانات مولانا محمد علی درانی' ڈاکٹر شیر افگن' وصی ظفر اور شیخ رشید نے دیئے تھے' وہی بیانات آج شیری رحمان' فاروق ایچ نائیک اور رحمان ملک دے رہے ہیں۔ آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے' ان بیانات کے الفاظ تک ایک ہیں' وہی سیکورٹی کے خدشات' وہی وکلاء کی تحریک کو غیر جمہوری اور غیر اخلاقی قرار دینا اور اس لانگ مارچ سے ملک کو درپیش وہی معاشی اور دفاعی مسائل' واہ کیا بات ہے!! یوں محسوس ہوتا ہے ڈائریکٹر' مکالمے' کردار اور سٹیج وہی ہیں بس ایکٹر بدل گئے ہیں اور نظام وہی ہے بس چہرے بدل گئے ہیں۔ یقین کیجئے جوں جوں وقت گزر رہا ہے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے اس ملک میں حکومت کوئی بھی ہو' اس ملک کا سربراہ کوئی بھی ہو اسٹیبلشمنٹ وہی رہتی ہے تبدیلی صرف اتنی آتی ہے کہ رحمان ملک جنرل حامد جاوید کی جگہ لے لیتا ہے' شوکت عزیز کی جگہ یوسف رضا گیلانی آ جاتے ہیں اور محمد علی درانی کی جگہ محترمہ شیری رحمان آ جاتی ہیں اور بس۔

میاں صاحب کو یاد ہو گا

میاں شہباز شریف نے 8 جون 2008ء کو وزیراعلیٰ پنجاب کا حلف اٹھایا' وہ پنجاب کے پہلے خوش نصیب وزیراعلیٰ ہیں جنہیں دوسری مرتبہ یہ منصب نصیب ہوا۔ میں میاں صاحب کو کامیابی اور خوش نصیبی کے اس عظیم لمحے میں اپنے ساتھ تین ملاقاتیں یاد کرانا چاہ رہا ہوں۔ میں میاں شہباز شریف سے دو مارچ' سات مارچ 2007ء اور 8 جولائی 2007ء کو لندن میں ملا تھا اور میاں صاحب نے میرے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا تھا۔ میں میاں صاحب کو اس وقت کے الفاظ یاد کرانا چاہتا ہوں' میاں صاحب نے کہا تھا ''ہم تین بھائی ہیں اور ہم تینوں نے خوشحالی میں آنکھ کھولی تھی' ہم پورے سکول میں واحد بچے تھے جن کے پاس ذاتی تانگہ ہوتا تھا' میں شہزادوں کی طرح زندگی گزارتا تھا' میں نے باہر سے انتہائی مہنگی اور خوبصورت گاڑی منگوائی تھی' پورے ملک میں اس جیسی دوسری گاڑی نہیں تھی' میں فیکٹری جاتا تھا اور فیکٹری میں اسی طرح کام کرتا تھا جس طرح بزنس مین اور مل اونر کیا کرتے ہیں لیکن پھر ایک واقعہ پیش آیا اور میری زندگی کا رخ بدل گیا'' میاں صاحب نے بتایا تھا ''ہم پچھلی تین نسلوں سے رمضان میں ضرورت مندوں میں آٹا' گھی اور دالیں تقسیم کرتے آ رہے ہیں' 1985ء میں ہم نے میاں نواز شریف کے حلقے کے لوگوں کو ٹارگٹ کیا اور میں اور خواجہ ریاض حق داروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے' ایک شام ہم نسبت روڈ کی ایک گلی میں داخل ہوئے اور ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے' یہ ایک کمرے کا انتہائی خستہ حال مکان تھا، اندر ایک بوڑھی مائی دال صاف کر رہی تھی، چارپائی پر ایک نوجوان لڑکی لیٹی تھی، لڑکی کو ٹی بی تھی اور فرش پر اس لڑکی کا تھوکا ہوا خون پڑا تھا' دوسری بچی اس کمرے کے ایک کونے میں اپنے ہی بول و براز میں لتھڑی پڑی تھی، کمرے کے اندر اندھیرا اور بو تھی، مجھے مائی نے بتایا وہ لوگ اس کمرے میں رہتے ہیں، کھانا بھی اسی میں پکاتے ہیں، نہاتے بھی اسی میں ہیں اور وہ اسی کمرے کے ایک کونے کو واش روم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ان لوگوں کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں باہر آیا اور مجھے اپنے کپڑوں، اپنے جوتوں اور اپنے لائف سٹائل سے نفرت ہو گئی، میں اپنے آپ کو ان لوگوں کا مجرم سمجھنے لگا، میں نے اس دن اپنی گاڑی واپس کی، اپنے سارے سوٹ، سارے جوتے لوگوں میں تقسیم کر دیئے اور اپنے آپ کو لوگوں کیلئے وقف کر دیا' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے کبھی کوئی بڑی گاڑی استعمال نہیں کی، میں نے ہمیشہ چھوٹی گاڑی میں سفر کیا اور صرف ضرورت کے دو جوڑے کپڑے بنائے، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا میں جب تک ان جیسے لوگوں کو ایک پروقار زندگی نہیں دوں گا میں چین سے نہیں بیٹھوں گا اور میں اپنے ملک کو تبدیل کئے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا' میں اللہ تعالیٰ سے روز دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہمت اور موقع دے' میں ان لوگوں کیلئے وہ سب کچھ کروں گا جس کیلئے یہ لوگ ترس رہے ہیں'' میاں شہباز شریف نے بتایا تھا'' وہ جب 1997ء میں چیف منسٹر بنے تھے تو وہ سب سے پہلے اپنے والد صاحب کے پاس گئے تھے اور ان کے والد نے فرمایا تھا ''اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تم پنجاب کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اتفاق گروپ کے ساتھ کرتے تھے'' بڑے میاں صاحب نے فرمایا تھا ''یاد کرو تم اتفاق فاؤنڈری کیلئے راتوں کو جاگتے تھے، تم نے اس کمپنی کیلئے پوری دنیا سے بہترین مشینری خریدی تھی' تم نے اس کیلئے دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کی تھی، تم نے فیکٹری کے لیے بہترین ورکرز کا بندوبست کیا تھا، تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم اور بہترین وقت فیکٹری کو دیا تھا اور تم سال کے آخر میں یہ دیکھتے تھے تم نے اس سال کیا کھویا اور کیا پایا لہٰذا آج اتفاق کا شمار پاکستان کے بڑے گروپوں میں ہوتا ہے' میری نصیحت ہے اگر تم اس محنت' لگن اور اخلاص کے ساتھ پنجاب کیلئے کام کرو گے تو تم یہاں بھی وہی نتائج حاصل کرو گے، تم پاکستان کی تاریخ کے سب سے اچھے چیف منسٹر ثابت ہو گے''۔

میاں شہباز شریف نے 7 مارچ کو مجھے ڈنر پر بلایا تھا اور اس کھانے کے دوران انہوں نے کہا تھا'' میں 1997ء میں چیف منسٹر بنا تو اخلاص' میرٹ' بھرپور مانیٹرنگ اور عام شہری کو فائدہ پہنچانا ہمارا ایجنڈا تھا' ہم نے پورے پاکستان سے چن چن کر ایماندار' ذہین اور مخلص افسروں کو اہم عہدوں پر تعینات کیا' ان افسروں کی مانیٹرنگ کیلئے ایک فول پروف سسٹم بنایا گیا اور پھر ہم نے ایسی پالیسیاں بنانا شروع کیں جن سے عام شہریوں کو فائدہ ہو سکتا تھا' میرا ایمان ہے سمجھوتے اور کرپشن کا آغاز ہمیشہ بالائی سطح سے ہوتا ہے اگر چیف منسٹر کرپٹ ہو گا تو وہ صوبے سے کبھی کرپشن ختم نہیں کر سکے گا لہٰذا میں نے سب سے پہلے خود کو مخلص' وقت کا پابند' میرٹ پر کاربند اور غیر جانبدار ثابت کیا' اس کے نتیجے میں ہمارا سارا سرکاری نظام ٹھیک ہو گیا' میرے اڑھائی برسوں میں میرے بچے چیف منسٹر ہاؤس نہیں آئے' ایک بار حمزہ کو ایمرجنسی میں وہاں آنا پڑا تھا لیکن میں نے اسے اسی وقت باہر نکال دیا تھا اس کے بعد اس نے کبھی وہاں قدم نہیں رکھا' میری گاڑی ہمیشہ سگنل پر رکتی تھی' میں نے کبھی دو سے زائد گاڑیاں استعمال نہیں کیں' میرے خاندان کے کسی فرد نے ان اڑھائی برسوں میں کوئی سرکاری گاڑی نہیں

گاڑیاں استعمال نہیں کیں' میرے خاندان نے بھی گزرے ان اڑھائی برسوں میں کوئی سرکاری گاڑی نہیں لی' ہمارے دور میں پورے پنجاب میں کوئی نئی گاڑی نہیں خریدی گئی' مانیٹرنگ کا یہ عالم تھا میرے بیٹے سلیمان نے میٹرک کا امتحان دینا تھا' امتحانی مرکز میں سلیمان کی تلاشی ہوئی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ناراض ہو گیا' ہم میرٹ میں اتنے سخت تھے کہ وزیراعظم نواز شریف کی بہو میڈیکل کالج کی سٹوڈنٹ تھی میرے اوپر اس کی مائیگریشن کیلئے دباؤ آیا لیکن میں نے انکار کر دیا' میرے پورے دور میں اس کی مائیگریشن نہیں ہوئی' ہم نے لاہور اور راولپنڈی کی پبلک ٹرانسپورٹ کیلئے ٹینڈر مانگے' دونوں شہروں کے ٹینڈر ہمارے سیاسی مخالفین نے جیتے' لاہور کا ٹھیکہ نیو خان کو ملا اور راولپنڈی کیلئے جنرل حمید گل کی بیٹی عظمیٰ گل نے کوالیفائی کیا' ہماری پارٹی نے اعتراض کیا لیکن میں نے میرٹ کے اصول کو مجروح نہ ہونے دیا' ہم نے لاہور شہر سے تجاوزات ختم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو سب سے پہلے اپنی پارٹی اور اپنے خاندان کی تجاوزات صاف کیں' جیل روڈ پر میرے ایک قریبی رشتہ دار کا پٹرول پمپ تھا' میں نے اپنی نگرانی میں یہ پمپ گرایا تھا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سفارش کے بغیر نوجوانوں کو پولیس میں نوکری ملی تھی' میں رات کو اٹھ کر کسی سائیٹ پر چلا جاتا تھا اور کام کی کوالٹی اور رفتار کا خود جائزہ لیتا تھا''۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' میاں شہباز شریف نے بتایا تھا' میں نے اڑھائی سال میں کسی ایم این اے یا ایم پی اے کا کوئی غلط کام کیا تھا اور نہ ہی ہونے دیا تھا' میں پارٹی کے کسی لیڈر کو چند منٹوں سے زیادہ اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا' ہم نے سرکاری خزانے کا غیر سرکاری استعمال بند کر دیا تھا' میں نے اڑھائی برسوں میں اپنے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کئے تھے' میں نے اڑھائی سال میں چیف منسٹر ہاؤس کا قالین تک نہیں بدلنے دیا تھا'' میں نے میاں شہباز شریف سے پوچھا تھا'' آپ پنجاب کو نئی شناخت دینا چاہتے تھے'' وہ مسکرا کر بولے تھا'' ہاں' میں پنجاب کو پسماندگی' جہالت اور بیماری سے آزاد کرنا چاہتا تھا' 12 اکتوبر 1999ء کو جب ہماری حکومت ختم ہوئی تو اس وقت کراچی پورٹ پر ہماری بسوں کی پہلی کھیپ اتری تھی' یہ بسیں ہم نے لاہور میں چلانی تھیں اور ہمارا منصوبہ تھا پہلی بس میں چیف منسٹر' کابینہ کے ارکان' آئی جی اور چیف سیکرٹری سفر کریں گے اور اس کے بعد روز کوئی نہ کوئی وزیر کسی بس کے ذریعے دفتر جائے گا اس سے لاہور کی ٹرانسپورٹ کا نقشہ بدل جاتا' ٹرانسپورٹ کا یہ سسٹم ہم نے پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں شروع کرنا تھا' میں نے ایک ایسے پنجاب کا خواب دیکھا تھا جس میں امن و امان ہوتا' انصاف ہوتا' میرٹ ہوتا' تعلیم اور صحت ہوتی اور جس میں خوشحالی ہوتی' ہم نے اڑھائی برسوں میں ان سب چیزوں کی بنیاد رکھ دی تھی' اگر مجھے مزید اڑھائی سال مل جاتے تو آج پنجاب ایسا پنجاب نہ ہوتا'' مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت میاں شہباز شریف کی آواز میں جذباتیت آ گئی تھی اور وہ روندی ہوئی آواز میں بولے تھے'' میں جب تک ایک رئیس زادہ' ایک بزنس مین اور دنیادار قسم کا صنعت کار تھا تو اس وقت تک سسٹم نے مجھے قبول کئے رکھا لیکن جس دن میں بدل گیا' جس دن میں نے اپنی ساری صلاحیتیں عام شہری کے لئے وقف کر دیں اس دن اس سسٹم نے مجھے اٹھا کر سمندر پار پھینک دیا'' وہ رک گئے تھے اور دوبارہ بولے تھے'' لیکن آپ لکھ لیں' میں واپس آؤں گا اور ملک کو ایک آئیڈیل شکل دینے کے سارے خواب پورے کروں گا' اللہ نے چاہا تو میں اپنا رول ادا کئے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا' یہ میرا فیصلہ بھی ہے اور ایمان بھی''۔

یہ ساری باتیں میاں شہباز شریف نے کی تھیں اور مجھے یقین ہے میاں صاحب کو یہ ساری باتیں یاد ہوں گی' آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میاں صاحب کی خواہش بلکہ دعا پوری ہو گئی' وہ ایک بار پھر کرسی اقتدار پر جلوہ افروز ہو گئے' میں آج کے دن انہیں ان کے وہ تمام الفاظ یاد کرانا چاہتا ہوں اور ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں'' دعاؤں اور خواہشوں میں بولے جانے والے الفاظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ معاف کر دیتا ہے لیکن اس کے دربار میں وعدہ خلاف کیلئے معافی کی گنجائش نہیں ہوتی' میاں صاحب نے اگر آج اللہ کے ساتھ کئے وہ تمام وعدے پورے نہ کئے تو شاید 12 اکتوبر 1999ء کو واپس آتے دیر نہ لگے اور اگر اس بار 12 اکتوبر آیا تو اس کے بعد 8 جون 2008ء نہیں آئے گا لہذا میاں صاحب آگے بڑھئے' اپنے وعدے پورے کیجئے اور ملک نہیں تو کم از کم پنجاب کا مقدر ضرور بدل دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان حکمرانوں پر اپنے رحم اور مہربانیوں کے سارے دروازے کھول دیتا ہے جو اس کے بندوں پر مہربانی کرتے ہیں جو اس کی مخلوق پر رحم کرتا ہے اور ان لوگوں کیلئے اقتدار کو گرم توا بنا دیتا ہے جو اس کے بندوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیتے ہیں اور مجھے یقین ہے اگر میاں صاحب نے وعدہ خلافی نہ کی' سمجھوتہ نہ کیا اور یہ پسپا نہ ہوئے تو اس ملک کا ہر شخص ان کا ساتھ دے گا اور اگر انہوں نے پسپائی اختیار کی' سمجھوتہ کر لیا اور وعدہ خلافی کی تو پھر آنے والے دن آپ کے دن نہیں ہوں گے۔ یہ بھی صدر پرویز مشرف کی طرف ماضی کا قصہ بن جائیں گے۔

ایک سوکھا سڑا' میلا کچیلا ہاتھ کھڑکی سے اندر آیااور آکر میرے سامنے پھیل گیا' میری طبیعت خراب ہوگئی' میں نے غصے سے باہر دیکھا' باہر ہاتھ سے کہیں زیادہ میلا کچیلااور سوکھا سڑا بھکاری کھڑا تھا' میں نے اسے ہاتھ سے معاف کرنے کااشارہ کیااور گاڑی ریورس گیئر میں ڈال دی' ہاتھ وہیں رہا' میں نے ہاتھ کو ہاتھ سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی مگر ہاتھ وہیں رہا' میرے غصے میں اضافہ ہوگیا' میں نے شدید وحشت میں چلاکر کہا" کما کر کھاؤ' اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہاتھ پاؤں دیئے ہیں" میلا کچیلا شخص ہنس پڑا' اس کے دانت اس کے ہاتھ سے کہیں زیادہ گندے اور بدبودار تھے' اس نے ہاتھ میرے سامنے لہرایااور بدبودار لہجے میں بولا" کیا تمہیں اتنا ہی ملتا ہے جتنا تم کام کرتے ہو' جتنا تم اپنے ہاتھ پاؤں چلاتے ہو" میرے دماغ کو آگ لگ گئی' میں نے اس کا ہاتھ نہایت بد تمیزی سے جھٹک دیا' ہاتھ واپس وہیں آگیا' میں نے گاڑی سے اترنے کیلئے ہینڈل کھینچا لیکن اس سے پہلے کہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا' میرے ساتھی نے مجھے پر سکون رہنے کااشارہ کیااور جیب سے پانچ روپے کا سکہ نکال کر بھکاری کے ہاتھ پر رکھ دیا' بھکاری نے سکہ الٹ پھیر کر دیکھااور پھر میری جھولی میں پھینک کر بولا" اس سے کیا ملتا ہے' یہ دولت تم اپنے پاس سنبھال کر رکھو" یہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا تھا' میرے ضبط کے سارے کیل قبضے نکل گئے' میرے منہ میں جھاگ آگئی اور میں اپنے جسم کی ساری نفرت سمیٹ کر اس پر چڑھ دوڑا" تمہیں تمہاری اوقات کے مطابق تو دے دیا' اب تمہیں کپڑے بھی اتار کر دے دیں" بھکاری نے قہقہہ لگایا' ہاتھ واپس کھینچااور نسبتاً اونچی آواز میں بولا" اللہ تعالیٰ نے جتنا تمہیں دیا کیا تمہاری اتنی اوقات تھی" میں نے غصے سے ایکسی لیٹر دبایا' گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور میں اس میلے کچیلے' سوکھے سڑے بھکاری اور اس کے سوکھے سڑے اور میلے کچیلے ہاتھ سے دور چلا گیا۔

یہ شاید دوسرا چوک تھا یا تیسرا' گاڑی سرخ سگنل پر رکی' میں نے رومال سے پسینہ پونچھا' جونہی گرم سلگتے قطرے سوتی رومال کے ریشوں میں جذب ہوئے میری ذات کی پہلی اینٹ نے اپنی جگہ چھوڑ دی' ایک سوال اندر سے اٹھا اور اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا' میں نے اپنے آپ سے پوچھا" اللہ نے مجھے جتنا دیا کیا واقعی میں اتنا ڈیزرو کرتا تھا" جواب آیا" نہیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری اوقات سے زیادہ دیا" میں نے سوچنا شروع کر دیا' سوچتا گیا' سوچتا گیا' گتھیاں کھلتی گئیں' کھلتی گئیں' معلوم ہوتا گیا' ہوتا گیا' میں آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دنیا میں اربوں لوگ مجھ سے زیادہ ذہین' مجھ سے زیادہ محنتی اور مجھ سے زیادہ فنکار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے زیادہ عزت' ان سے زیادہ صحت اور ان سے زیادہ رزق دیا' اس دنیا میں کروڑوں اربوں لوگ مجھ سے زیادہ کام کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے کام کو ان سے زیادہ درجہ اور ان سے زیادہ اہمیت دے دی' مجھے معلوم ہوا میرا رب مجھے میرے کام' میری محنت سے زیادہ دیتا ہے' اس سوال کے بعد ایک دوسرا سوال اٹھااور اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا' میں نے اپنے آپ سے پوچھا" کیا میں دنیا میں اپنی اوقات کے مطابق زندگی گزار رہا ہوں" جواب آیا" نہیں' اس سے لاکھ کروڑ درجے بہتر" میں نے سوچنا شروع کیا تو معلوم ہوا' میری اوقات تو بہت ہی چھوٹی ہے' میں معمولی معمولی باتیں برداشت نہیں کر سکتا' میں کمینگی' سفلے پن اور حرص کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا' میں اس قدر منتقم مزاج ہوں کہ اپنے سے کہیں زیادہ کمزور لوگوں سے بھی انتقام لیتے نہیں چوکتا' جھوٹا ہوں' غیبت باز ہوں' فحش کلام ہوں' احساس کمتری کا شکار ہوں اور خود غرض ہوں اور وہ کون سی خامی' کون سی خرابی ہے جو میرے اندر نہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کا کرم سر پر سایہ کئے ہوئے ہے' اللہ تعالیٰ نے میری ساری خامیوں' ساری خرابیوں اور سارے عیبوں پر پردے ڈال رکھے ہیں' اللہ نے مجھے عزت' شہرت اور نیک نامی سے نواز رکھا ہے' میرے پاس آزادی ہے' آسائش ہے اور فراوانی ہے"۔

میں نے آگے پیچھے مڑ کر دیکھا' میرے گرداگرد لوگ ہی لوگ تھے' سر ہی سر' کندھے ہی کندھے اور دھڑ ہی دھڑ تھے' میں نے ان تمام دھڑوں' تمام کندھوں اور تمام سروں کو غور سے دیکھا' مجھے سارے لوگ اپنے جیسے لگے' مجھے معلوم ہوا' ان سب لوگوں کو ان کی محنت' ان کے کام سے زیادہ مل رہا ہے' انہیں ان کا رب ان کی اوقات سے زیادہ دے رہا ہے' میں نے آنکھیں بند کر لیں' وہ سارے دھڑ بہت سارے دھڑ بن گئے' وہ سارے کندھے بہت سارے کندھے بن گئے' وہ سارے سر بہت سارے سر بن گئے' یہ سارے سر' کندھے اور دھڑ پندرہ سولہ کروڑ بن گئے اور وہ سڑک پھیل کر ملک بن گئی' اسلامی جمہوریہ پاکستان' پاک سرزمین شاد باد' مجھے محسوس ہوا اس پورے ملک کو اس کی اوقات سے زیادہ مل رہا ہے' قدرت ان تمام سروں' کندھوں اور دھڑوں کو ان کی محنت سے

کہیں زیادہ صلہ دے رہی ہے' یہ سب لوگ بھارت میں بھی ہو سکتے تھے' اس بھارت جس میں 19 کروڑ لوگ 6
روپے روزانہ کماتے ہیں اور 6 کروڑ دو' دو روپے' جس میں 20 کروڑ اچھوتوں کو آج کے زمانے میں [illegible]
خریدنے کی اجازت نہیں' جو اپنی پشت پر جھاڑو باندھ کر پھرتے ہیں' جو جوتے نہیں پہن سکتے اور جو بڑی ذات کے
ہندوؤں سے بات کرتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں' ہم لوگ روانڈا' برونڈی' کوسووا اور سربیا میں بھی ہو سکتے
تھے جہاں لوگ اقوام متحدہ کے کیمپوں کے سامنے ایک ایک روٹی کیلئے ہفتہ ہفتہ پڑے رہتے ہیں' یہ لوگ فلسطین
کے شہری بھی ہو سکتے تھے جہاں کوئی گھر ایسا نہیں جس کے صحن میں چار پانچ قبریں نہ ہوں' یہ لوگ عراق اور
افغانستان کے شہری بھی ہو سکتے ہیں جہاں زندگی اب خوف کا دوسرا نام ہے اور یہ لوگ ان بالٹک سٹیٹس کے شہری
بھی ہو سکتے تھے جن میں لوگ چند ڈالروں کیلئے اپنے بچے بیچنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں' مجھے معلوم ہوا' ہم سب لوگ
اپنی اوقات سے کہیں بہتر زندگی گزار رہے ہیں' ٹھیک ہے حالات اتنے اچھے نہیں جتنے ہونے چاہئیں لیکن ان
حالات کو تو ہم نے ہی بہتر بنانا ہے' اس نظام کو بدلنا' ظالم طرز حکومت کا رخ تبدیل کرنا' اپنے پاؤں کے کانٹے چننا
تو ہماری اپنی ذمہ داری ہے' یہ فرض' یہ ذمہ داری تو ہم نے ہی نبھانی ہے' قدرت نے تو کوئی کمی' کوئی کسر نہیں
چھوڑی' ہمیں آزادی دی' زمین دی' پانی دیا اور رزق دیا لیکن اب ہم چاہتے ہیں وہ اپنے فرشتے نازل فرما کر یہ نظام
بھی درست کر دے' وہ آصف علی زرداری کا دل پھیر دے' وہ صدر پرویز مشرف کو اٹھا کر ایوان صدارت سے باہر
پھینک دے اور وہ فرشتے بھجوائے اور فرشتے ججوں کو ان کی کرسیوں پر بٹھا دیں' تو یہ کیسے ممکن ہے؟ اللہ کرم کیا کرتا
ہے اور اس کرم سے فائدہ تو انسان نے خود اٹھانا ہوتا ہے۔

میں نے یوٹرن لیا اور اس میلے کچیلے' سوکھے سڑے بھکاری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا' واپس آیا' گاڑی سے اتر کر
اسے تلاش کیا' مگر وہ نہ ملا' میں دیر تک تلاش کرتا رہا لیکن جب مایوس ہو گیا تو اندر سے آواز آئی وہ بھکاری بھکاری
نہیں تھا وہ ایک پیغام تھا' وہ ایک خط تھا' ادھورے پتے والا بے رنگ خط اور بے رنگ خط میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی
چٹ تھی اور اس چٹ پر لکھا تھا "یاد رکھو جو رب نعمت دیتا ہے' وہ رب نعمت چھین بھی سکتا ہے' اگر اپنے رب سے
اپنی اوقات سے بڑھ کر پانا چاہتے ہو تو اپنی اوقات میں رہو' شکر کرو' توبہ کرو اور ہر وقت اسے یاد رکھو"

پنکھے سے لٹکی یہ نعش

میں جوں ہی چھت کے پنکھے کی آواز سنتا ہوں یا میری بھٹکتی ہوئی نظریں سیلنگ فین سے ٹکراتی ہیں تو میرے سارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' میرے سر سے پسینے کی آبشار نکلتی ہے اور میری گردن' سینے اور پیٹ سے ہوتی ہوئی تلووں تک پہنچ جاتی ہے اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں انسانی قیمے' جمے ہوئے خون اور ہڈیوں کے گودے میں لتھڑا ہوں اور میرے دائیں' بائیں اور اوپر' نیچے بدبو کا دریا بہہ رہا ہے اور میں اس دریا میں لیٹ کر ابکائیاں لے رہا ہوں۔ میری یہ نفسیاتی کیفیت سیلنگ فین سے جڑی ہے اور میں کوشش کرتا ہوں میں چھت کی طرف نہ دیکھوں اور اگر کبھی میری آوارہ نظریں اوپر چھت کی طرف اٹھ جائیں تو میں پنکھے تک پہنچنے سے پہلے انہیں واپس کھینچ لیتا ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں' میں کسی ایسے کمرے میں نہ جاؤں جس میں پنکھا چل رہا ہو یا پنکھے کی آواز آ رہی ہو اور میں رات کو منہ پر چادر تان کر سوتا ہوں لیکن اس کے باوجود میری اچانک آنکھ کھل جاتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے میرے پنکھے سے سات سال کا ایک نابینا بچہ لٹک رہا ہے' پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا ہے اور پنکھے کے ساتھ ساتھ بچہ بھی ''کلاک وائز'' گھوم رہا ہے۔ میں اس بچے کے لٹکتے ہوئے بال اور تیز ہوتی سانسوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتا ہوں' بچے کی ناک سے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں اور بالوں میں پسینے کی آبشاریں بہتی ہیں اور یہ آبشاریں اور قطرے میرے چہرے پر گرتے ہیں اور میں اپنے چہرے پر ان آبشاروں اور قطروں کی حدت محسوس کرتا ہوں' مجھے محسوس ہوتا ہے میری ناک' میری پیشانی اور میرے سر کے بالوں کے اوپر ایک معصوم بچہ دم توڑ رہا ہے اور جوں ہی احساسات کے بکھرے سلسلے اس نقطے پر جمع ہوتے ہیں تو میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور اس کے بعد عاطف' مرحوم عاطف مجھے رات بھر سونے نہیں دیتا۔ میں گزشتہ چھ دنوں سے اس کیفیت کا شکار ہوں۔

محمد عاطف کے نام سے وہاڑی میں ایک چھوٹی سی قبر بن چکی ہے اور اس قبر پر اب سارا دن چڑیاں ٹھونگیں مارتی رہتی ہیں اور مٹی کے کیڑے اس میں رزق تلاش کرتے رہتے ہیں لیکن اس قبر کے سرہانے پڑی اینٹ پورے معاشرے اور اس پورے ملک سے اس بچے کا گناہ' اس معصوم کا جرم پوچھتی رہتی ہے مگر شائد یہ 16 کروڑ لوگوں کا ایک گونگا' بہرہ اور اندھا ملک ہے اور اندھے' بہرے اور گونگے ملک کسی اینٹ' کسی قبر کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے' بے حس معاشرے اور بے ضمیر لوگ قبروں سے بدتر ہوتے ہیں اور بدتر قبریں عاطف جیسی قبروں کا کیا جواب دیں گی لیکن اس کے باوجود اس قبر کا سوال اپنی جگہ موجود ہے۔ محمد عاطف پیدائشی طور پر معذور تھا' وہ پیدا ہوا تو اس کی آنکھیں رنگوں اور روشنیوں سے محروم تھیں' وہ مرتے دم تک روشنی اور رنگ کو ترستا رہا لیکن اندھیرے کے سوا وہ کسی رنگ کا ذائقہ نہ چکھ سکا۔ محمد عاطف کے والدین نے اپنے بچے کی روح کو منور کرنے کیلئے اس کے اندر قرآن مجید کا سورج جلانے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں جس طرح دوسرے اندھوں کو حافظ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے بالکل اسی طرح عاطف کو بھی قرآن مجید حفظ کرنے کا حکم دیا گیا' محمد عاطف نے سر تسلیم خم کر دیا۔ بچے کو ایک قاری ضیاءالدین کے حوالے کر دیا گیا۔ قاری ضیاءالدین ایک وحشی اور نفسیاتی مریض تھا' وہ بچوں کو تشدد کے ذریعے قاری اور حافظ بناتا تھا' عاطف اس وحشی کا نیا شکار تھا۔ ضیاءالدین نے بچے کی ''تعلیم و تربیت'' کا سلسلہ شروع کر دیا' محمد عاطف کو شدید سردی میں سویرے باہر بٹھا دیا جاتا تھا' محمد عاطف کو رات' رات بھر جگایا جاتا تھا اور اسے گرمیوں میں دھوپ میں کھڑا کر کے سبق یاد کرایا جاتا تھا۔ محمد عاطف تین' تین گھنٹے مرغا بنتا تھا' اس اندھے بچے سے معمولی' معمولی غلطی پر ہزار ہزار ''ڈنٹ'' نکلوائے جاتے تھے جبکہ زیر اور زبر کے غلط استعمال سے اس بچے کے ٹخنوں' پاؤں کی انگلیوں' ہاتھوں اور پیٹھ پر ڈنڈے برسائے جاتے تھے۔ قاری ضیاءالدین تشدد کے معاملے میں شیطانی صفات کا مالک تھا' وہ تشدد کے نئے اور انوکھے طریقے وضع کرتا رہتا تھا' اس نے ایک انتہائی خوفناک طریقہ وضع کر رکھا تھا' وہ بچوں کو چھت کے پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا دیتا تھا اور پنکھا چلا دیتا تھا' بچہ پنکھے کے ساتھ ساتھ ''کلاک وائز'' گھومتا رہتا تھا اور اس دوران قاری ضیاءالدین بچے کو قرآنی آیات یاد کرنے کا حکم دیتا تھا۔ وہ بچہ جب تک صحیح ادائیگی سے آیات نہیں سناتا تھا' وہ اس وقت تک پنکھے سے لٹکا رہتا تھا۔ آپ ذرا تصور کیجئے بچہ پنکھے سے لٹک رہا ہے' بچے کے سر سے پسینہ نکل رہا ہے' یہ پسینہ بالوں سے بہہ کر قطرہ' قطرہ فرش پر گر رہا ہے اور بچہ انتہائی تکلیف کے عالم میں قرآنی آیات کی تلاوت کر رہا ہے' قاری ضیاءالدین ہاتھ میں ڈنڈے لے کر اس بچے کے اردگرد منڈلا رہا ہے اور جونہی بچہ غلطی کرتا ہے' قاری بچے کی پیٹھ پر پورے زور سے ڈنڈا برسا دیتا ہے' بچے کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلتی ہے اور کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک فرش پر

در جنوں بچے بیٹھے ہیں' تمام بچوں کے سامنے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے بینچ رکھے ہیں' ان بینچوں پر قرآن مجید' قرآنی قاعدے اور احادیث کی کتابیں رکھی ہیں' یہ بچے آہستہ آہستہ 'ہل' ہل کر آیات زبانی یاد کرتے ہیں' خوف کے عالم میں پنکھے سے لٹکے بچے کو دیکھتے ہیں' بچے کے گرد منڈلاتے "استاد" پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر سہم کر اللہ تعالیٰ کا وہ کلام زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے حضورﷺ عرب کے ریگستانوں میں لے کر آئے تھے اور جس کلام نے ریت کے گم نام ذروں کو سونا بنا دیا تھا' وہ کلام جسے ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کی انسانیت کے نام آخری وارننگ قرار دیتے ہیں اور جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے جس زبان نے اس پیغام کا ذائقہ نہیں چکھا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گی اور جس پیغام کے پیغمبرﷺ محسن انسانیت تھے اور اس پیغام کو وہ نبیﷺ دنیا میں لے کر آئے تھے جن کے سامنے یتیم بچہ آتا تھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور آپ اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرماتے تھے 'بیٹا تم فکر نہ کرو میں بھی تمہاری طرح یتیم ہوں اور جب ان کے سامنے سے کوئی ایسا اونٹ گزرتا تھا جس کے گلے کی رسی تنگ ہوتی تھی تو آپ تڑپ اٹھتے تھے اور جس مذہب نے اعلان کیا تھا بچے اللہ کے سفیر ہوتے ہیں اور یہ اس بات کی غماضی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا اور وہ قرآن اور وہ مذہب جو پوری نسل انسانی کے لئے رحمت' امن' محبت اور مساوات لے کر آیا اور جس کے بارے میں میرے آقاﷺ نے فرمایا تھا "آج اللہ کا دین مکمل ہو گیا" لیکن اس پیغام کو قاری ضیاء الدین بچوں کو پنکھوں سے الٹا لٹکا کر پڑھاتا تھا۔ یا اللہ ہمیں معاف کر دے۔

محمد عاطف بھی قاری ضیاء الدین کی اس تکنیک کا ملزم بنا' قاری ضیاء الدین نے محمد عاطف کو پنکھے سے لٹکا دیا لیکن محمد عاطف ان دس لاکھ بچوں میں سے ایک تھا جو اگر زندگی میں الٹے لٹک جائیں تو ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے' محمد عاطف کا دماغ آہستہ آہستہ مرنا شروع ہو گیا' وہ پنکھے سے لٹکے لٹکے تڑپتا رہا' قاری کو دہائیاں دیتا رہا' اس کی منتیں کرتا رہا' اسے واسطے دیتا رہا لیکن قاری اس کی پیٹھ پر ڈنڈے برسا برسا کر حکم دیتا رہا "دعائے قنوت سناؤ" اسی دوران بچے کی ناک سے خون ٹپکنا شروع ہو گیا' وہ بے سدھ ہو گیا لیکن قاری کی تسلی نہ ہوئی اور وہ بے سدھ بچے کے جسم پر ڈنڈے برسانے لگا' وہ بچے کو مارتا جاتا تھا اور چیخ چیخ کر کہتا جاتا تھا "اب مکر کر رہے ہو' اب مکر کر رہے ہو" یہ ڈنڈے اندھے عاطف کی زندگی کے چراغ کیلئے آخری پھونکیں ثابت ہوئے' اس نے ایک لمبی ہچکی لی اور دنیا سے رخصت ہو گیا اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں جب بھی پنکھے کی طرف دیکھتا ہوں یا میرے کان میں پنکھے کی آواز آتی ہے تو میں اپنے چہرے پر محمد عاطف کے خون اور پسینے کے قطرے گرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں' مجھے اپنے جسم پر عاطف کی آہوں اور سسکیوں کی بارش ہوتی محسوس ہوتی ہے اور مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہو جاتی ہے۔ ذرا سوچئے اگر بچے سفیر ہیں اور اگر کوئی شخص کسی بڑے اور مضبوط بادشاہ کے سفیر کو قتل کر دے تو اس پر اس بادشاہ کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟ وہ بادشاہ اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے اور ہم نے اللہ کے سفیر کو قتل کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دے دی ہے اور جب تک ہم محمد عاطف کو انصاف نہیں دیں گے' اس کی نعش اس ملک کے ہر پنکھے سے لٹکی رہے گی' یہ نعش ہمیں سونے نہیں دے گی۔

چین کا نجومی بادشاہ کے دربار میں پیش ہو گیا' بادشاہ علم نجوم کے خلاف تھا' اس کا خیال تھا ستارہ شناسی ڈھونگ اور فریب ہے اور نجومی لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں لیکن وزیر اعظم کا اصرار تھا یہ نجومی بادشاہ معظم کو حیران کر دے گا' آپ ایک بار اسے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دیں' بادشاہ نے ناچار اجازت دے دی یوں چین کا نجومی دربار میں پیش ہو گیا' بادشاہ نے اس سے پوچھا" میرا نام کیا ہے" نجومی نے ادب سے عرض کیا" حضور دنیا آپ کو اردشیر بابکان کے نام سے جانتی ہے" بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا" میں اپنا اصل نام جاننا چاہتا ہوں" نجومی نے حساب لگایا اور عرض کیا" حضور آپ وہ نام جاننا چاہتے ہیں جو آپ کی والدہ ماجدہ نے تجویز کیا تھا یا وہ جس سے آپ کے والد آپ کو پکارتے تھے یا پھر وہ جو آپ کی رضائی والدہ نے رکھا تھا" بادشاہ تھوڑا سا پریشان ہوا اور غور سے نجومی کی شکل دیکھنے لگا' نجومی نے تختی منگوائی' اس پر تینوں نام لکھے اور بادشاہ سلامت کو پیش کر دیئے' بادشاہ نام پڑھ کر پریشان ہو گیا' اس کے بعد بادشاہ نجومی سے پوچھتا رہا اور نجومی جواب دیتا رہا' نجومی کا ہر جواب درست تھا یہاں تک کہ بادشاہ نجومی کے فن کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا' سوال و جواب کا یہ سلسلہ رات تک جاری رہا' رات جب بادشاہ تھک گیا تو اس نے نجومی سے آخری سوال پوچھا' اس نے نجومی سے پوچھا" ہم آتش پرست ہیں' ہم آگ کو اپنا خدا مانتے ہیں' تم بتاؤ ہمارا مذہب کب تک زندہ رہے گا" نجومی نے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں اور ذرا سا سوچ کر بولا" بادشاہ سلامت آپ کا مذہب ڈیڑھ سو سال قائم رہے گا' آج سے ٹھیک ایک سو پچاس برس بعد ایک قوم ایران آئے گی' ایران فتح کرے گی اور آپ کا آتش کدہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بجھا دے گی" بادشاہ نے نجومی کو آرام کرنے کی اجازت دے دی' شاہی چراغ بجھایا اور بستر شاہی پر دراز ہو گیا' بادشاہ نے جوں ہی آنکھیں بند کیں' اسے اپنے مرحوم والد یاد آ گئے' بادشاہ کے والد نے اسے وصیت کی تھی "ہمارا مذہب دنیا کے آخری کونے اور آخری سانس تک پہنچنا چاہیے" بادشاہ اٹھ بیٹھا اور اس نے باقی رات ڈیڑھ سو سال کے اندیشوں میں کاٹ دی' یہ ایران کا مشہور بادشاہ اردشیر بابکان تھا' بابکان کے بارے میں کہا جاتا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے شیر کے ارادے اور ہاتھی کے فیصلے سے نواز رکھا تھا' وہ دل میں جو ٹھان لیتا تھا وہ اسے کر گزرتا تھا' اردشیر بابکان نے دوسرے دن جنتریاں بنانے والوں کو بلوایا اور دربار میں کھڑے ہو کر اعلان کر دیا" ہم حکم دیتے ہیں' ایران کے کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے کر دیا جائے" بادشاہ کا حکم تھا چنانچہ تاریخ کو تین سو سال پیچھے دھکیل دیا گیا' بادشاہ کا خیال تھا اس اقدام سے وقت کے فرشتے مغالطہ کھا جائیں گے اور یوں آتش پرستی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا' اردشیر بابکان یہ بندوبست کر کے فوت ہو گیا اور اس کی جگہ نئے بادشاہوں نے لے لی' ان بادشاہوں نے بھی بابکان کے فیصلے کا احترام کیا لیکن وقت کے فرشتوں کا حساب آگے پیچھے نہ ہو سکا' ڈیڑھ سو سال ڈیڑھ سو سال ہی رہے اور پھر وہ لوگ ایران آئے' انہوں نے ایران فتح کیا اور آتش کدہ بجھا کر چلے گئے اور یوں اردشیر بابکان کو وقت کو تین سو سال پیچھے دھکیلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

31 مئی اور یکم جون کی درمیانی رات گھڑی میرے سامنے میز پر پڑی تھی' ٹیلی ویژن پر بار بار اعلان ہو رہا تھا" عوام گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ آگے کر لیں" میں نے گھڑی اٹھائی اور بارہ بجے کو ایک بجے میں تبدیل کرنے لگا لیکن عین اس وقت اردشیر بابکان تاریخ کے صفحات سے نکلا اور اس نے آ کر میری کلائی پکڑ لی' اس کا کہنا تھا وقت کو آگے اور پیچھے کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' دس کلو لوہا اور دس کلو کپاس ایک برابر ہوتے ہیں' ہتھیلی پر رکھا بیج اور پتھروں میں بوئی گٹھلی کیلنڈر کو دو سو سال آگے کرنے سے درخت نہیں بن سکتی' جون کی تپتی دوپہریں جون کو دسمبر کہنے سے ٹھنڈی نہیں ہوتیں اور ابلتا ہوا پانی محض کیلنڈروں کو آگے پیچھے کرنے سے برف نہیں بنتا' انسان کا مقدر تاریخیں اور گھڑیاں بدلنے سے نہیں بدلا کرتا' اس کیلئے ارادے' عزم' دل اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم لوگ محنت اور ارادے کا کام بھی گھڑیوں سے لینا چاہتے ہیں' میں نے ان باطل خیالات کو دماغ سے جھٹکنے کیلئے سر کو جھٹکے دیئے اور وقت کو وقت سے ملانے کیلئے گھڑی کی ناب تلاش کرنے لگا لیکن اس دوران شاہ ایران رضا شاہ پہلوی تاریخ کے اوراق سے نکلا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا' رضا شاہ پہلوی کی رگوں میں بھی اردشیر بابکان کا خون تھا چنانچہ اس نے بھی وقت کو شکست دینے کا فیصلہ کیا تھا' 1971ء میں شاہ ایران نے ایرانی شہنشاہیت کے 2500 سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا' اس نے پوری دنیا کے سربراہان کو اس جشن میں شرکت کی دعوت دی' جب دعوت نامے جاری ہو گئے تو پتہ چلا ایرانی شہنشاہیت کو ابھی محض ایک ہزار چار سو 64 سال گزرے ہیں اور اگر اس غلطی کی بھنک مغربی میڈیا کو ہو گئی تو وہ رائی کا پہاڑ بنا دے گا اور اس سے شاہ ایران کی سبکی ہو گی' معاملہ شاہ

کے حضور پیش کیا گیا‘ بادشاہ نے چند سیکنڈ سوچا اور اس کے بعد وزیروں سے پوچھا ”اڑھائی ہزار سال ہونے میں کتنے سال باقی ہیں“ وزیروں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ”ایک ہزار 36 برس“ بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور عمائدین سلطنت کو حکم دیا ”آج سے ایران کے کیلنڈر کو ایک ہزار 36 سال آگے کر دیا جائے“ یہ بھی بادشاہ کا حکم تھا چنانچہ ایک ہفتے میں ایران کی ساری جنتریاں اور کیلنڈر جمع کیے گئے‘ انہیں سرے عام آگ لگا دی گئی اور عوام کو نئے کیلنڈر تھما دیئے گئے یوں تاریخ کا گیپ ختم ہو گیا شہنشاہیت کے اڑھائی ہزار سال پورے ہو گئے اور بادشاہ نے 12 اکتوبر 1971ء کو جشن منا لیا لیکن کیلنڈر کی یہ تبدیلی شاہ کے مسائل ختم نہ کر سکی‘ عوام کے دلوں میں سر اٹھاتی نفرت کا رخ نہ موڑ سکی‘ ایران میں انقلاب آیا اور محض آٹھ برسوں بعد کیلنڈر دوبارہ اصل پوزیشن پر بحال ہو گیا۔

شاہ ایران کو وقت کو شکست دینے کا خبط تھا‘ اس کے اس خبط سے اس کے تمام حواری سیاستدان اور تمام عمائدین واقف تھے‘ ایک دن وزیراعظم عباس ہویدا اور مجلس شوریٰ کے صدر مہندس ریاضی بادشاہ کے پاس بیٹھے تھے‘ شاہ نے گھڑی دیکھی اور وزیراعظم سے وقت پوچھا‘ وزیراعظم نے عرض کیا ”حضور شام کے چھ بجے ہیں“ شاہ نے حیران ہو کر دوبارہ اپنی گھڑی دیکھی اور مجلس شوریٰ کے صدر سے بھی وقت پوچھا‘ مہندس ریاض نے فوراً عرض کیا ”حضور چھ بجے ہیں“ شاہ نے خفگی سے اپنی گھڑی اتاری اور غصے سے بولے ”میری گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہے“ یہ سننے کی دیر تھی‘ وزیراعظم اپنی نشست سے اٹھا‘ بھاگ کر شاہ کے پاس پہنچا‘ اس کے ہاتھ سے گھڑی اچک لی اور ادب سے عرض کیا ”میں قربان جاؤں‘ آپ کے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حضور گھڑی درست کرنے کی زحمت گوارہ کریں‘ آپ اپنی گھڑی کو ایسے ہی رہنے دیں‘ ہم ساڑھے تین کروڑ لوگ اپنی گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ پیچھے کر لیتے ہیں“ شاہ نے خوشی سے وزیراعظم کو تھپکی دی‘ وزیراعظم محل سے باہر آیا اور اس نے پورے ملک کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر دیں۔

یہ عباس ہویدا وہی وزیراعظم تھا جسے انقلاب کے بعد 7 اپریل 1979ء کو لاکھوں لوگوں کے سامنے سرے عام پھانسی دے دی گئی تھی اور اس وقت ایران کی کوئی کلائی اور اس کلائی پر بندھی کوئی گھڑی اس کی پھانسی کی گھڑی کو نہ ٹال سکی اور یہ گھڑی آج تک چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے حکمران گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کر دیں‘ کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے لے جائیں یا ایک ہزار 36 سال آگے لیکن بدقسمتی کی گھڑیاں نہیں ٹلتیں‘ وقت کے داغ نہیں دھلتے اور مسائل کے انبار ختم نہیں ہوتے‘ مسئلے صرف اور صرف مسئلے حل کرنے سے ختم ہوتے ہیں‘ اس ملک میں اگر لوڈ شیڈنگ ہے تو ہم خواہ اپنی گھڑیاں دس دس گھنٹے پیچھے کر لیں لیکن ہمارے بلب روشن نہیں ہوں گے‘ ہمارے پنکھے نہیں چلیں گے چنانچہ ہمیں بجلی کیلئے بجلی کا بندوبست کرنا پڑے گا‘ ہمیں ڈیم بنانے پڑیں گے‘ ہمیں نئے بجلی گھر لگانا پڑیں گے اور جب تک ہم یہ نہیں کریں گے ہم خواہ گھڑیوں کو روزانہ آگے یا پیچھے کرتے رہیں ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا‘ انسان جلے ہوئے زخموں پر برف رکھ کر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے‘ لوگ بیمار کو ڈھول کی تھاپ سے زیادہ دیر تک نہیں بہلا سکتے اور معاشرے گھڑیوں کو آگے پیچھے کر کے زیادہ دیر تک وقت کو دھوکہ نہیں دے سکتے کہ وقت وہ خوفناک سچائی ہے جس کے سامنے فرعونوں کے سر بھی جھک گئے تھے اور جس کا رخ نمرود بھی نہیں بدل سکا تھا‘ وقت کسی کے کہنے پر رکتا ہے اور نہ ہی تھمتا ہے اور دنیا میں صرف وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو وقت کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہیں‘ جو وقت کی دوست بن جاتی ہیں یا پھر وقت کو اپنا دوست بنا لیتی ہیں اور گھڑیوں اور کیلنڈروں سے دشمنی کرنے والی قومیں وقت کی دھول میں گم ہو جاتی ہیں اور ہم اگر وقت کی دھول میں گم ہونے سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وقت کو دھوکہ دینے کا سلسلہ بند کرنا ہوگا‘ ہمیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بھاگنا ہوگا‘ ورنہ وقت کا ریلا ہمیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا اور ہم تاریخ کے جوہڑ میں کائی بن کر تیرتے رہیں گے‘ ایک ایسی کائی جو صرف مکھیاں اور مچھر پیدا کر سکتی ہے۔

شہر سے نکلتے ہی منظر بدل گیا' دور دور تک ہریالی تھی' سیدھے' نوکیلے پودے اساطیری سرداروں کی طرح سینہ تان کر کھڑے تھے' ہوا کی رومی کنیزیں ان کے در نیاز پر دستک دیتیں تو خوشی کی ایک لہر سی دور تک بہتی چلی جاتی' ان اساطیری سرداروں اور ان رومی کنیزوں سے ذرا پرے سونے کا برادہ اڑ رہا تھا' سبک سنہری ذرے اڑتے اور پورے ماحول کو اپنی آغوش میں لے لیتے تھے' چند لمحوں کیلئے اساطیری سردار سنہرے ہو جاتے' پھر رومی کنیزیں آگے بڑھتیں' سرداروں کے بدن سے ہولے ہولے آہستہ آہستہ سنہراپن اتارتیں اور یوں ہرا ایک بار پھر ہرا ہو جاتا اور وہاں ایک آب جو بھی تھی' ایک آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے بہتی آب جو' جس میں سورج کی شوخ کرنیں اور درختوں کی نرم شاخیں دونوں بیک وقت اپنا آپ تلاش کرتی تھیں' میں نے ڈرائیور کو "اے سی" تیز کرنے کی ہدایت کی' اس نے ڈیش بورڈ پر انگلی رکھی اور ٹھنڈی یخ ہوا کے جھونکوں میں اضافہ ہو گیا' باہر کا ماحول مزید خوبصورت ہو گیا' میں نے کار کے سیاہ شیشوں سے باہر جھانکتے ہوئے سوچا' میں کتنا خوش نصیب ہوں' میں ایسی جنت میں رہ رہا ہوں' جس میں حسن ہی حسن ہے' امن ہی امن اور خوشی ہی خوشی ہے' میں نے گہرے اطمینان سے جھر جھری لی اور اپنے ساتھی کو کہنی مار کر جگایا' اس نے بھی باہر جھانک کر دیکھا' جہاں زمین اور آسمان کے ہونٹ ملتے تھے وہاں لالی کی ایک طویل لکیر بچھی تھی' یوں محسوس ہوتا تھا شدت جذبات نے' وصل کی ایک شدید خواہش نے زمین اور آسمان کے درمیان آگ بھر دی ہے اور ان دونوں میں سے ابھی کوئی چند ملی میٹر آگے بڑھے گا اور ایک دھماکہ ہو گا' آگ کا ایک شعلہ مشرق سے مغرب تک دوڑے گا اور پھر گلاب بن کر پورے کرہ ارض پر ٹوٹ برسے گا' میرے ساتھی کے منہ سے بے اختیاری میں "ہاؤ" نکلا اور وہ گاڑی کے خنک شیشے پر جھک گیا' میں نے بھی آگے جھک کر اپنی ناک شیشے سے چپکا دی۔

ہم باہر کے نظاروں میں محو تھے کہ اچانک ٹھک کی آواز آئی اور گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی "کیا ہوا؟" میں اور میرا ساتھی چلایا' گاڑی نے دو تین جھٹکے کھائے' اے سی بند ہوا اور گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی "سر انجن میں کوئی گڑبڑ ہے' آپ بیٹھیں میں دیکھتا ہوں" ڈرائیور نیچے اترا' بونٹ کھولا اور اس کے پیچھے آدھے سے زیادہ گم ہو گیا' مجھے اندر سے اس کے بوٹ اور نیلی پتلون نظر آ رہی تھی' میرے ساتھی نے ٹائی اور قمیض کے بٹن کھولے اور ڈائری کو پنکھا بنا کر بولا "یار آج گرمی کچھ زیادہ نہیں" میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے مشاہدے کی داد دی' اندر صرف گرمی نہیں تھی بلکہ حبس بھی تھا' ڈرائیور اسی طرح بونٹ کے پیچھے گم تھا' میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا' ہوا کا ایک گرم سلگتا ہوا بدبودار تھپیڑا آیا' ہم دونوں کے منہ پر برسا اور گاڑی کے اندر چکرانے لگا' میں نے چیخ مار کر کھڑکی بند کر دی' اندر کے حبس میں اضافہ ہو گیا' ہم دونوں ہاتھوں سے پنکھا جھلنے لگے' میرے ہاتھوں میں اخبار تھا اور میرے ساتھی کے ہاتھوں میں ڈائری' ہم پنکھا جھلتے رہے' جھلتے رہے لیکن جوں جوں ہمارے ہاتھ چلتے گاڑی کے حبس میں اضافہ ہوتا جاتا' میں نے اپنے ساتھی سے کہا "لو حبس سے بہتر ہوتی ہے' آؤ وہاں باہر درخت کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں" میرا ساتھی بھی شاید یہی سوچ رہا تھا' اس نے فوراً دروازہ کھولا اور نیچے کود گیا' میں بھی اس کی تقلید میں باہر آ گیا' باہر شدید گرمی تھی اور چہار سو شمشان گھاٹ جیسی بدبو پھیلی تھی' ڈرائیور نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "سر گاڑی گرم ہے' ہمیں کچھ دیر رکنا پڑے گا" ہمارے پاس ڈرائیور کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' ہم نے اپنی اپنی ٹائیاں اور کوٹ گاڑی میں پھینکے اور بھاگ کر درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے' ہم نے آگے پیچھے دیکھا' ماحول بدل چکا تھا' ہم کالا شاہ کاکو کے مضافات میں تھے' کیمیکل فیکٹریوں کے بدبودار دھوئیں نے پوری فضا کو یرغمال بنا رکھا تھا' ہم چلتی گاڑی سے جنہیں اساطیری سردار سمجھ رہے تھے وہ بدبودار پانیوں کے سرکنڈے تھے' ہم جن کو رومی کنیزیں خیال کر رہے تھے' وہ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا دھواں تھا اور رہا سونے کا برادہ تو وہ گرم دھول تھی جو دور بے آب و گیا کھیتوں سے اڑتی' بگولے بنتی اور ساٹھ ستر کلومیٹر کی رفتار سے راستے میں کھڑی ہر چیز سے الجھتی اور لڑتی اور مارتی دھاڑتی دور کہیں افق میں گم ہو جاتی تھی اور ہاں وہ آب جو' میں نے جھک کر دیکھا اور گھبرا کر ناک پر رومال رکھ لیا' وہ آب گندہ نالا تھا جو دو تین شہروں کی گندگی لے کر راوی کی طرف بہہ رہا تھا' میں نے اوپر دیکھا' وہاں جہاں زمین اور آسمان ہم آغوش ہو رہے تھے' وہاں دور دور تک آگ بچھی تھی' مجھے محسوس ہوا' میں جسے جنت سمجھ رہا تھا' وہ دراصل دوزخ تھا۔

ہم ایک گھنٹے بعد روانہ ہوئے گاڑی ٹھیک ہو چکی تھی' میں نے ڈرائیور کو "اے سی" تیز کرنے کا کہا' کالر سیدھا کر

کے ٹائی لگائی‘ کوٹ میں بازو پھنسائے اور ٹھنڈی یخ ہوا کا لمبا سانس لے کر کھڑکی پر جھک گیا‘ باہر ایک بار پھر ہوا کی رومی کنیزیں اساطیری سرداروں کا سنہرا پن دھو رہی تھیں‘ سورج کی کرنیں اور درختوں کی نرم شاخیں آ
اپنا وجود تلاش کر رہی تھیں‘ جذبات کی شدت نے زمین اور آسمان کے پیوست ہونٹوں میں گلاب بھر دیئے تھے اور دور دور تک تاحد نظر ہریالی ہی ہریالی تھی‘ شیشے سے باہر ایک بار پھر جنت سج چکی تھی‘ میں نے اطمینان سے لبریز جھرجھری لی اور سوچا ”اللہ کا میرے اوپر کتنا احسان ہے میں اس جنت میں رہ رہا ہوں“ میں نے ٹائی کی ناٹ کسی اور ان تمام لوگوں پر سو سو حرف بھیجنے لگا جو دن رات حالات کا رونا روتے رہتے ہیں‘ جو گرمی‘ بدبو‘ خشک سالی‘ دھول‘ بدامنی اور سہولتوں کی کم یابی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں‘ میں نے اپنے ساتھی کو ٹہوکا دیا ”یار ان تمام لوگوں کو جمع کر کے جوتے نہیں مارنے چاہئیں جنہیں یہ ہریالی نظر نہیں آتی‘ وہ دیکھو‘ باہر حسن ہی حسن ہے‘ امن ہی امن ہے‘ مجھے تو یہاں کوئی خرابی‘ کوئی پریشانی دکھائی نہیں دیتی“ میرے ساتھی نے کسمسا کر پہلو بدلا اور آہستے بولا ”ہاں جب تک اے سی کام کر رہا ہے“ میں نے قہقہہ لگایا اور سر سیٹ کے ساتھ ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہم ملتان روڈ سے ہوتے ہوئے نہر پر اتر آئے‘ وہاں پہنچ کر میرے ساتھی نے مجھ سے کہا ”تم نے فرق دیکھا تھا“ میں نے اونگھتے اونگھتے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھ کر بولا ”کیا؟“ وہ جذباتی لہجے میں بولا ”صرف ایک شیشہ حقیقت کو کس طرح بدل دیتا ہے‘ ایک اے سی حالات کو کس طرح تبدیل کر دیتا ہے“ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا‘ وہ بولا ”گاڑی کے اندر 16 ڈگری سینٹی گریڈ ٹمپریچر ہے جبکہ باہر 42‘ اس 16 اور 42 ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان صرف تین ایم ایم کا دو فٹ شیشہ حائل ہے‘ ہم جب شیشے کی اس سائیڈ سے زندگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں 42 ڈگری کی زندگی خوبصورت بھی دکھائی دیتا ہے‘ ہری بھی اور سنہری بھی‘ ہم جب اس شیشے کے پیچھے بیٹھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں ننگے گندے اور بھوکے لوگ کتنے خوبصورت‘ مطمئن اور خوش دکھائی دیتے ہیں‘ ہمیں 16 ڈگری سینٹی گریڈ میں بیٹھ کر یہ ملک جنت کا کتنا بڑا ٹکڑا لگتا ہے لیکن اگر یہ دو فٹ کا شیشہ درمیان سے ہٹ جائے تو؟“ وہ خاموش ہو گیا‘ میں نے پوچھا ”تو؟“ وہ بولا ”تو زندگی کے اصل رنگ‘ اصل بدصورتیاں اور اصل سچائیاں دو منٹ میں اندر آ جائیں گی‘ ہمیں 42 سینٹی گریڈ کی گرم ہوا جھلسائے گی اور ہمیں معلوم ہو گا مئی کے آخری دنوں میں کوٹ پہن کر باہر نکلنا کتنا مشکل ہوتا ہے‘ ہمیں اس وقت پتہ چلے گا جب دن کے دو بجے زندگی سر سے پگھل کر ایڑیوں تک پہنچتی ہے تو انسان پر کیا گزرتی ہے“ وہ خاموش ہو گیا‘ میں نے اس سے پوچھا ”تم کہنا کیا چاہتے ہو‘ مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی“ اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا ”صدر پرویز مشرف ہوں‘ شوکت عزیز‘ یوسف رضا گیلانی یا پھر آصف علی زرداری اس ملک کے تمام حکمران عوام کو دو فٹ کے شیشے کے پیچھے سے دیکھتے ہیں‘ یہ تمام لوگ 16 ڈگری سینٹی گریڈ میں بیٹھ کر 42 ڈگری سینٹی گریڈ میں پگھلتے لوگوں کیلئے پالیسیاں بناتے ہیں چنانچہ ان لوگوں کو عوام ناشکرے‘ احسان فراموش اور بے صبرے محسوس ہوتے ہیں‘ یہ دو فٹ کا شیشہ ہے جو عوام کو کہتا ہے اگر تمہیں آٹا نہیں ملتا تو تم کیک کھا لو‘ تم پانی کی جگہ منرل واٹر کیوں نہیں پیتے اور تم گھروں میں جنریٹر کیوں نہیں لگا لیتے؟“ وہ رکا‘ اس نے سانس لیا اور روتی ہوئی آواز میں بولا ”اور جب تک حکمران 42 ڈگری سینٹی گریڈ میں بیٹھ کر پالیسیاں نہیں بنائیں گے‘ جب تک یہ لوگ دو فٹ شیشے کی یہ دیوار نہیں ہٹائیں گے اس وقت تک اس ملک کے مسئلے حل نہیں ہوں گے‘ اس وقت تک یہ ملک ترقی نہیں کرے گا“ وہ خاموش ہو گیا‘ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے پیار سے اسے مشورہ دیا ”تم ٹائی لگاؤ اور کوٹ پہن لو‘ تمہارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے“ اس نے نفرت سے میری طرف دیکھا‘ رخ پھیرا اور باہر دیکھنے لگا۔

رس فین گولڈ امریکی سینٹ کے رکن ہیں‘ وہ امریکی سینٹ کی عدلیہ‘ خارجہ تعلقات اور انٹیلی جنس کمیٹیوں میں بھی شامل ہیں‘ وہ گزشتہ چار دن سے امریکی سینیٹرز کے ساتھ پاکستان کے دورے پر ہیں‘ رس فین گولڈ اور ان کے ساتھیوں نے ان چار دنوں کے دوران صدر پرویز مشرف‘ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے ساتھ ملاقات کی‘ وہ ان کے علاوہ ہماری فوجی قیادت کے ساتھ بھی ملے اور انہوں نے سول سوسائٹی کے نمائندوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ بھی ملاقات کی‘ میں نے تین دن قبل مسلم لیگ ن کے سینئر عہدیدار چودھری نثار علی خان سے ان ملاقاتوں کے بارے میں استفسار کیا تھا‘ چودھری نثار علی خان نے بتایا تھا ”یہ سینیٹرز صدر پرویز مشرف کے بارے میں غیر جانبدار ہیں اور ان کا خیال ہے صدر پرویز مشرف کو اس صورتحال میں مستعفی ہو جانا چاہیے“ میں نے چودھری نثار صاحب سے پوچھا ”عوام میں یہ تاثر پایا جاتا ہے امریکی سینیٹرز سیاستدانوں اور صدر پرویز مشرف کے درمیان ورکنگ ریلیشن شپ پیدا کرنے کیلئے پاکستان آئے ہیں“ چودھری نثار نے اس کے جواب میں کہا ”یہ بات شاید پیپلز پارٹی کی حد تک درست ہو لیکن ہمارے اوپر اس معاملے میں امریکہ کا ہرگز کوئی دباؤ نہیں‘ امریکہ ہماری پالیسی سے پوری طرح واقف ہے“ میں نے چودھری صاحب سے پوچھا تھا ”کیا یہ سینیٹرز صدر پرویز مشرف کو استعفے پر رضامند کرنے کیلئے پاکستان آئے ہیں“ چودھری نثار نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا ”اس کا امکان بھی موجود ہے“ میں آگے بڑھنے سے قبل یہاں ایک ضمنی بات بھی آپ کو بتاتا چلوں‘ چودھری نثار علی کے ساتھ ملاقات سے ایک دن قبل میری چودھری پرویز الٰہی کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی‘ میں نے اس گفتگو میں چودھری پرویز الٰہی سے پوچھا تھا ”کیا دونوں مسلم لیگوں کے اتحاد کی گنجائش موجود ہے“ چودھری پرویز الٰہی نے فوراً جواب دیا ”فوری طور پر ممکن نہیں“ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا تھا ”میاں برادران کی ایروگینس اس اتحاد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے‘ میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف نے پچھلے 9 برسوں میں کچھ نہیں سیکھا“ میں نے پوچھا ”مسلم لیگ ن کا کوئی ایسا عہدیدار جس پر آپ کو اعتماد ہو“ چودھری پرویز الٰہی نے فوراً جواب دیا ”چودھری نثار علی ان میں معقول شخص ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ بات چیت کر کے اچھا محسوس ہوتا ہے“ میں نے چودھری نثار سے اس ریفرنس سے بات کی تو انہوں نے چودھری پرویز الٰہی کی بجائے چودھری شجاعت حسین کی بڑی تعریف کی‘ ان کا فرمانا تھا ”چودھری شجاعت حسین بہت اچھے اور شاندار انسان ہیں“ میں نے پوچھا ”کیا آپ مستقبل میں دونوں مسلم لیگوں کے اتحاد کیلئے چودھری شجاعت حسین سے ملاقات کریں گے“ چودھری صاحب نے فرمایا ”سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی‘ اگر مستقبل میں پنجاب میں ہماری حکومت کو چھیڑنے کی کوشش کی گئی تو ہمارے پاس بھی ایک کارڈ موجود ہے“ مجھے چودھری پرویز الٰہی اور چودھری نثار علی کے ساتھ ان ملاقاتوں کے دوران محسوس ہوا دونوں مسلم لیگوں کے درمیان دوریاں کم ہو رہی ہیں اور مستقبل میں اگر ان دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑ گئی تو چودھری شجاعت حسین اور چودھری نثار علی کے آپس میں رابطے شروع ہو جائیں گے اور اگر مسلم لیگ ق چودھری پرویز الٰہی کی ”قربانی“ دینے پر تیار ہو گئی تو دونوں مسلم لیگیں ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں گی۔

میں واپس سینیٹر رس فین گولڈ کی طرف آتا ہوں‘ رس فین گولڈ نے 28 مئی کو اسلام آباد میں چند صحافیوں کے ساتھ گفتگو کی تھی‘ اس گفتگو کے دوران انہوں نے اعتراف کیا تھا ”امریکہ نے فرد واحد (صدر پرویز مشرف) پر انحصار کر کے سنگین غلطی کی تھی‘ صدر مشرف کے مستقبل کا فیصلہ اب پاکستانی پارلیمنٹ کرے گی اور ہم سمجھتے ہیں پاکستان کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سمیت تمام ججوں کو فوراً بحال کر دینا چاہیے“ رس فین گولڈ کے ان خیالات سے واضح ہو گیا امریکہ صدر پرویز مشرف کے پیچھے سے ہٹ چکا ہے اور صدر اب پوری طرح حالات کے رحم و کرم پر ہیں‘ ہم اگر گزشتہ ایک ہفتے کی سیاسی صورتحال کا تجزیہ کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا صدر پرویز مشرف کے بارے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی پالیسی تبدیل ہو چکی ہے‘ آصف علی زرداری نے بانگ دہل صدر پرویز مشرف کو ماضی کا ورثہ قرار دیا تھا اور ان سے مطالبہ کیا تھا وہ مواخذے کی بجائے استعفیٰ دے دیں‘ فوج کے ریٹائر جرنیل اور سابق فوجی افسر بھی پچھلے ایک ماہ سے صدر پرویز مشرف کے کورٹ مارشل کا مطالبہ کر رہے ہیں‘ جنرل حمید گل‘ جنرل اسلم بیگ اور جنرل اسد درانی صدر پرویز مشرف سے آرمی ہاؤس خالی کرنے کی ڈیمانڈ بھی کر رہے ہیں‘ بعض ذرائع کا کہنا ہے ان سابق فوجیوں کو حاضر سروس جرنیلوں کی حمایت حاصل ہے اور جنرل کیانی

ان کے ذریعے صدر پرویز مشرف سے یہ مطالبات کر رہے ہیں' جنرل اسد درانی اور جنرل حمید گل دو مختلف اوقات میں ایکسپریس نیوز کے پروگرام ''کل تک'' میں میرے مہمان بن چکے ہیں' ان پروگراموں میں آئی ایس آئی کے ان دونوں سابق سربراہان نے بلا خوف و تردید یہ اعلان کیا تھا'' صدر پرویز مشرف کو فوج کی حمایت حاصل نہیں'' مجھے پچھلے دنوں مسلم لیگ ق کے بعض اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقات کا موقع بھی ملا' ان تمام حضرات کا بھی یہ خیال تھا کہ صدر پرویز مشرف کو ان حالات میں استعفیٰ دے دینا چاہیے' گزشتہ روز میری ملاقات صدر پرویز مشرف کے ایک انتہائی قریبی ساتھی سے ہوئی' میں نے ان سے عرض کیا'' صدر پرویز مشرف کا مستقبل دیوار پر لکھا ہے اور پوری دنیا دیوار کی یہ تحریر پڑھ رہی ہے لیکن صدر پرویز مشرف اور آپ لوگوں کو یہ نوشتہ دیوار کیوں نظر نہیں آ رہا'' صدر کے اس قریبی ساتھی نے اپنا اور میرا موبائل بند کرایا' ٹیلی ویژن کا والیم اونچا کیا' مجھے ٹیلی ویژن کے قریب لا بٹھایا اور اس کے بعد آہستہ آواز میں بولا'' ہم کو آنے والے دنوں کا اندازہ ہے' ہم بھی صدر صاحب کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ اس ملک کو سلام کریں' کسی صحت افزاء مقام پر شفٹ ہو جائیں' امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیں' کتابیں لکھیں' انٹرویو دیں اور ٹینس کھیلیں' اس بک بک سے جان چھڑا لیں لیکن صدر صاحب کی صورت حال شیر پر بیٹھے اس شخص جیسی ہے جو قہقہے لگاتا تھا اور اس کے بعد چیخ مارتا تھا' کسی نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا' میں قہقہہ اس لئے مار رہا ہوں کہ میں شیر پر سواری کر رہا ہوں اور میں چیخ اس لئے رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہے میں نے شیر سے نیچے بھی اترنا ہے'' وہ صاحب اس کے بعد بڑی دیر تک تازہ ترین حالات پر گپ شپ کرتے رہے اور اس گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا صدر صاحب مستعفی ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں لیکن انہیں خطرہ ہے استعفے کے بعد ان کے خلاف لال مسجد' 12 مئی اور 3 نومبر کے ''جرائم'' پر مقدمہ قائم کر دیا جائے گا چنانچہ وہ استعفے سے پہلے ''گارنٹی'' چاہتے ہیں' میں اس ملاقات کے بعد بڑی دیر تک سوچتا رہا صدر پرویز مشرف کو یہ گارنٹی کون دے گا؟ صدر کو اس وقت تین طاقتیں گارنٹی دے سکتی ہیں' امریکہ' آصف علی زرداری اور فوج کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی' صدر کو فہرست کے پہلے دو کھلاڑیوں پر اعتماد نہیں رہا لہٰذا پیچھے اب صرف جنرل کیانی بچتے ہیں اور میرا خیال ہے صدر اب اپنے سارے دروازے کھول کر جی ایچ کیو کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا جنرل کیانی انہیں یہ گارنٹی دے دیں گے؟ اس وقت اس سوال کی قیمت دس ملین ڈالر ہے تاہم ایک بات طے ہے صدر پرویز مشرف کے پاس اب صرف ایک گولی بچی ہے اور اب یہ ان پر ہے کہ وہ سرنڈر کرنے سے قبل یہ آخری گولی بھی چلا دیتے ہیں یا پھر وہ ایک اچھے فوجی کی طرح عوام کی رائے کا احترام کرتے ہیں بہر حال' فیصلہ جو بھی ہوتا ہے لیکن یہ طے ہے یہ صرف چند دنوں کی بات ہے' ہم ایک نئے بحران کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

جم نے انکار میں سر ہلایا اور پر یقین لہجے میں بولا ”ڈاکٹر صاحب قید ہی میں انتقال کر جائیں گے ‘تم لوگ انہیں کبھی سڑک پر چلتے پھرتے ‘لوگوں سے ملتے ‘ہاتھ ملاتے ‘ قہقہہ لگاتے اور لوگوں کو آٹوگراف دیتے نہیں دیکھو گے “وہ خاموش ہوا‘اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا‘ ٹیڑھا میڑھا سا سگریٹ نکالا‘ سگریٹ ہونٹوں کے ساتھ چپکایا‘ لائٹر جلایا‘ آگ کا شعلہ سگریٹ کے سرے کے ساتھ جوڑا‘ ایک لمبا کش لیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا‘ میں حیرت اور شرمندگی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا‘ وہ آہستہ سے بولا ”میں معافی چاہتا ہوں ‘میں نے تمہارے جذبات کی توہین کی لیکن مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر کا انجام اچھا دکھائی نہیں دے رہا“ وہ دوبارہ خاموش ہو گیا۔ میں بات کو آگے بڑھانے سے قبل جم سے آپ کا تعارف کراتا چلوں ‘جم لووِن امریکی مورخ ہے ‘اس نے اسلامی تاریخ میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور آج کل وہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر تحقیق کر رہا ہے۔ وہ سال کے تین ‘تین ماہ بھارت اور پاکستان میں گزارتا ہے اور چھ ماہ نیویارک میں ‘وہ پچھلے چھ برس سے پاکستان آ رہا ہے۔ وہ اس دوران نہ صرف پاکستان کی تاریخ ‘جغرافیے ‘رسوم و رواج اور پاکستانیوں کی نفسیات کا حافظ ہو چکا ہے بلکہ وہ اس خطے کے لوگوں کو ہم سے زیادہ جانتا ہے ‘وہ گزشتہ روز میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا ”ڈاکٹر عبدالقدیر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے “ میں نے فوراً جواب دیا ”ڈاکٹر صاحب تمام پاکستانیوں کے ہیرو ہیں ‘اس ملک کا بچہ بچہ ان سے محبت کرتا ہے “ جم نے ذرا دیر سوچا اور اس کے بعد پوچھا ”ڈاکٹر کا مستقبل کیا ہے “ میں نے بغیر سوچے ‘بغیر رکے جواب دیا ”ڈاکٹر صاحب انشاءاللہ رہا ہوں گے ‘ عوام میں پہنچیں گے اور لوگ انہیں عزت کی اس کرسی پر بٹھائیں گے جس کے وہ اہل اور حقدار ہیں “ جم نے میری بات غور سے سنی ‘ذرا دیر سوچا اور اس کے بعد نرم آواز میں بولا ”میں تم سے اتفاق نہیں کرتا ‘میرا خیال ہے ڈاکٹر عبدالقدیر کبھی رہا نہیں ہوں گے “ میں نے اس سے اس آبزرویشن کی وضاحت چاہی تو وہ بولا ”میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر صاحب قید ہی میں انتقال کر جائیں گے ‘تم لوگ انہیں کبھی سڑک پر چلتے پھرتے ‘لوگوں سے ملتے ‘ہاتھ ملاتے ‘ قہقہہ لگاتے اور لوگوں کو آٹوگراف دیتے نہیں دیکھو گے “۔

میں نے بے چینی اور اضطراب میں پہلو بدلا ‘وہ دوبارہ گویا ہوا ”تم مجھے ایک سوال کا جواب دو“ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا ‘وہ بولا ”کیا ڈاکٹر عبدالقدیر اس ملک کے ہیرو ہیں ؟“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ‘وہ فوراً بولا ” تمہاری ہاں میرے تھیسس کی بنیاد ہے ‘ مسلمان ایک ایسی بدقسمت قوم ہے جس کے ہیروز کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے ‘تم حضرت امام حسینؓ سے ٹیپو سلطان تک اپنے تمام ہیروز کی تاریخ نکال کر دیکھ لو اور بتاؤ ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ حضرت امام حسینؓ کیسے شہید ہوئے تھے ‘حضرت خالدؓ بن ولید کی زندگی کا آخری حصہ کیسے گزرا ‘موسیٰ بن نصیر کا کیا بنا ‘ طارق بن زیاد کا انجام کیا ہوا ‘محمد بن قاسم بے بسی کے کس عالم میں دنیا سے رخصت ہوا اور سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کو کس نے کفن دیا تھا؟ یہ صرف چند مثالیں ہیں تم مسلمانوں کی تاریخ غور سے پڑھو ‘میرا دعویٰ ہے تمہیں اپنے تمام ہیروز اسی انجام کا شکار ملیں گے جبکہ ان کے مقابلے میں تم بدبخت ‘ بے ایمان ‘ ظالم اور سفاک بادشاہوں کو دیکھو ‘تمہیں حجاج بن یوسف سے امیر تیمور تک اور محمود غزنوی سے اکبر اعظم تک اسلامی تاریخ کے تمام آمر آخری سانس تک تخت پر بیٹھے اور بڑے بڑے عظیم الشان مقبروں میں دفن ہوتے ملیں گے چنانچہ میری تحقیق ہے مسلمان اپنے ہرولن کو آخری سانس تک عزت دیتے ہیں جبکہ اپنے ہیروز کو قید خانوں ‘ جنگوں اور بیماریوں کے حوالے کر دیتے ہیں ‘مسلمان اپنے ہرولن کے ساتھ وفاداری نبھاتے ہیں جبکہ ہیروز کے ساتھ دغا کرتے ہیں ‘انہیں فریب دیتے ہیں اور ان کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں “ میں خاموشی سے سنتا رہا ‘وہ بولا ”یہ ایک پہلو تھا ‘تم اب دوسرا پہلو بھی دیکھو ‘ پاکستانی قوم نے پچھلے ساٹھ برسوں میں اپنے ہیروز کے ساتھ کیا سلوک کیا ‘ قائداعظم اس ملک کے بانی تھے ‘تم بانی پاکستان کے آخری لمحات دیکھو ‘ قائداعظم کو زیارت سے کراچی لایا گیا ‘کراچی ایئرپورٹ پر صرف ایک ایمبولینس کھڑی تھی ‘ یہ گاڑی راستے میں خراب ہو گئی ‘ قائداعظم کا سانس اکھڑ گیا ‘ محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کا سٹریچر فٹ پاتھ پر رکھوا دیا ‘مکھیاں بار بار ان کی ناک اور منہ پر بیٹھتی تھیں ‘ قائداعظم بے چینی سے آنکھیں کھولتے تھے اور فاطمہ جناح بے بسی کے عالم میں انہیں دیکھ کر رہ جاتی تھیں ‘ قائداعظم اس عالم میں فٹ پاتھ پر انتقال فرما گئے ۔ آپ لوگوں نے فاطمہ جناح کو مادرِ ملت کا خطاب دیا ‘ آپ نے پھر اس مادرِ ملت کا کیا انجام کیا ‘ایوب خان نے کھلے جلسوں میں مادرِ ملت پر کیچڑ اچھالا تھا ‘خان لیاقت علی خان بھی تم لوگوں کے ہیرو تھے ‘تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ‘تم آج تک ان کے قتل کی وجہ تک معلوم

نہیں کر سکے۔ حسین شہید سہروردی بھی ایک ایماندار سیاستدان تھے‘ وہ لبنان میں انتقال کر گئے‘ ان کی بیٹی کے پاس نعش لانے کیلئے رقم نہیں تھی اور حکومت اس کی بے بسی پر قہقہے لگاتی رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اس ملک کے ہیرو تھے‘ اس بھٹو کا کیا انجام ہوا‘ انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور قوم خاموش رہی اور جنرل ضیاء الحق کو تم لوگ فاتح روس کہتے تھے‘ اس فاتح روس کا کیا انجام ہوا؟۔ تم اپنی تاریخ نکال کر دیکھ لو‘ اس ملک میں ہر ایماندار‘ بااصول اور جرات مند شخص خوفناک انجام سے دوچار ہوا جبکہ ہر بے ایمان‘ بے اصول اور بزدل شخص اس ملک میں آخری وقت تک اقتدار‘ عزت اور پروٹوکول سے لطف لیتا رہا‘ تم ملک غلام محمد سے صدر پرویز مشرف تک اپنی ساری تاریخ کھنگال کر دیکھ لو‘ تمہیں ہر مجرم جیل سے باہر اور ہر بے گناہ اور معصوم شخص قید میں نظر آئے گا“ وہ سانس لینے کیلئے رکا۔

میں نے بے چینی سے ایک اور کروٹ بدلی‘ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور ایک لمبا سانس بھر کر بولا ”تم تازہ ترین صورتحال بھی دیکھ لو‘ تم لوگ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو اپنا ہیرو سمجھتے ہو‘ تمہارا وہ ہیرو اس وقت کہاں ہے؟ تمہارا ہیرو سڑکوں پر دھکے کھا رہا ہے جبکہ وہ لوگ جنہوں نے ملک‘ آئین‘ قانون اور عدلیہ کو پامال کیا وہ اقتدار‘ کرسی اور عہدے کے مزے لوٹ رہے ہیں‘ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نظر بند ہیں لیکن جن لوگوں نے اس ملک کو غیر ملکی لشکروں کی چراہ گاہ بنا دیا‘ جن کی مہربانیوں سے یہ ملک خودکش حملوں سے لرز رہا ہے اور جنہوں نے تمہاری مسجدوں اور مدرسوں کو توپوں سے اڑا دیا‘ تمہارے نمازی ایجنسیوں اور سی آئی اے کی حراست میں ہیں جبکہ تاریخ کے بعض کرپٹ ترین لوگ ”این آر او“ کی مشین سے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں‘ تم ڈاکٹر قدیر کو دیکھو اور پھر اپنے کرپٹ جرنیلوں‘ بے ایمان افسروں اور منافق سیاستدانوں کو دیکھو اور یہ فیصلہ کرو تمہارے ملک کے اصول‘ تمہارے ملک کے ضابطے اور تمہارے ملک کی روایات کیا ہیں اور اس کے بعد دل پر ہاتھ رکھو اور مجھے بتاؤ تمہارے ڈاکٹر عبدالقدیر کا کیا انجام ہوگا؟ کیا وہ نظر بندی کے عالم میں دنیا سے رخصت نہیں ہوں گے؟“ وہ خاموش ہو گیا‘ میری زبان بے بسی کے عالم میں میرے جبڑوں میں تڑپتی رہی لیکن یہ تڑپ کوئی لفظ‘ کوئی فقرہ پیدا نہ کر سکی‘ میں بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا‘ وہ مسکرایا اور اسی نرم آواز میں بولا ”آج ڈاکٹر عبدالقدیر کی نظر بندی کو ایک ہزار 5 سو 57 دن ہو چکے ہیں‘ تم مجھے اتنا بتاؤ کیا ایڈمرل منصور الحق اربوں روپے کی کرپشن کے بعد اتنے دن نظر بند رہا تھا؟ کیا جنرل یحییٰ خان ملک توڑنے کے بعد اتنے دن نظر بند رہا تھا اور اگر کبھی جنرل پرویز مشرف ملزم یا مجرم ثابت ہوئے تو کیا وہ بھی اتنے دن نظر بند رہیں گے“ میں خاموش رہا‘ اس نے قہقہہ لگایا اور میرا گھٹنا دبا کر بولا ”تمہاری یہ خاموشی میرے ہر سوال کا جواب ہے لہٰذا میرے عزیز اگر تم اور تمہاری قوم ڈاکٹر عبدالقدیر کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے تو تمہیں چاہئے تم ڈاکٹر کو ہیرو کی بجائے ولن ثابت کر دو‘ تم ان پر کرپشن اور بے ایمانی کے الزامات لگا دو‘ یقین کرو تمہارا نظام نہ صرف انہیں باعزت بری کر دے گا بلکہ انہیں اقتدار کی کرسی پر بھی بٹھا دے گا اور یاد رکھو اگر ڈاکٹر عبدالقدیر کرپٹ شخص ہوتے تو وہ کبھی 1557 دن نظر بند نہ رہتے‘ وہ آج اس ملک کے حکمران ہوتے“۔

ڈاکٹر محمد اسلم میرے چند قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں‘ وہ ایک سیلف میڈ بزنس مین ہیں‘ پولٹری کے کاروبار سے منسلک ہیں اور اپنا ایک نقطہ نظر رکھتے ہیں‘ ڈاکٹر صاحب سابق وزیراعظم شوکت عزیز کے بہت بڑے ”فین“ ہیں اور وہ ببانگ دہل شوکت عزیز کے ٹیلنٹ اور کارکردگی کی تعریف کرتے ہیں‘ میں انہیں اس ملک میں شوکت عزیز کا واحد ”فین“ سمجھتا ہوں‘ میری گزشتہ روز ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے ملتے ہی جوش سے بولے ”کیوں پھر قوم شوکت عزیز کو یاد کر رہی ہے یا نہیں“ میں نے جواب میں قہقہہ لگا دیا‘ ڈاکٹر صاحب کا فرمانا تھا ”شوکت عزیز ایک جینئس انسان ہیں‘ وہ جتنی دیر پاکستان کے وزیراعظم رہے انہوں نے ملک میں کوئی بحران پیدا نہیں ہونے دیا‘ ان کے دور میں ملک میں اربوں ڈالرز آئے‘ سینکڑوں غیر ملکی سرمایہ کار آئے‘ بیسیوں لاکھ پتی کروڑ پتی بنے اور کروڑ پتی ارب پتی اور ان کے دور میں ملک میں آٹے کا بحران آیا‘ بجلی‘ گیس‘ پٹرول اور نہ ہی آئین کا‘ وہ جیسے تیسے تمام چیزیں مینج کر لیتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی لیکن جوں ہی شوکت عزیز وزارت عظمٰی سے الگ ہوئے اور حکومت نگرانوں کے ہاتھ میں گئی تو ملک مسائلستان بن گیا‘ ملک سے آٹا غائب ہو گیا‘ بجلی‘ پانی اور گیس غائب ہو گئی‘ سرمایہ کار بھاگ گئے‘ ترقیاتی منصوبے ٹھپ ہو گئے اور مالیاتی ذخائر تیزی سے نیچے آنے لگے“ ڈاکٹر صاحب رکے اور جوش سے بولے ”میری بات پلے باندھ لو جوں جوں وقت گزرے گا لوگ شوکت عزیز کو یاد کریں گے“ انہوں نے لمبا سانس لیا اور اس کے بعد دعویٰ سے فرمایا ”آپ لوگ صدر پرویز مشرف کو بھی فارغ کرنا چاہتے ہیں لیکن میری بات لکھ لو تم چند ماہ بعد اس آمرانہ دور کی تعریف پر مجبور ہو جاؤ گے‘ تم صدر پرویز مشرف کی تعریف کرو گے“۔

میں نے قہقہہ لگایا اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا ”آپ کو معلوم ہے شوکت عزیز کی سب سے بڑی خوبی کیا تھی“ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے‘ میں نے عرض کیا ”گرین کارڈ“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے‘ میں نے عرض کیا ”شوکت عزیز پانچ سال کے کنٹریکٹ پر پاکستان آئے تھے اور وہ جانتے تھے انہوں نے حکومت کے مزے لوٹنے ہیں اور امریکہ واپس چلے جانا ہے چنانچہ وہ قرضے لیتے رہے اور عوام کو کھلاتے رہے‘ انہیں معلوم تھا یہ قرضے انہوں نے نہیں بلکہ عوام نے بھگتنے ہیں‘ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں وہ آج پاکستان کے وزیراعظم ہوتے تو ملک میں کوئی بحران نہ ہوتا‘ ملک میں گندم ختم ہو جاتی تو وہ عالمی منڈی سے دوگنی قیمت پر گندم خرید لیتے اور لوگوں کو سبسڈی پر گندم فراہم کر دیتے یوں عوام کو سستی گندم مل جاتی‘ وزیراعظم کے دوستوں کو کروڑوں روپے کا کمیشن مل جاتا اور شوکت عزیز کی بلے بلے ہو جاتی‘ وہ آج وزیراعظم ہوتے تو وہ امریکہ سے پچاس بحری جہاز منگواتے‘ یہ جہاز کراچی کے سمندر میں کھڑے ہوتے‘ جہازوں پر نصب تھرمل پاور پلانٹس چلتے‘ بجلی پیدا ہوتی‘ پورے ملک کے اے سی آن ہو جاتے اور لوگ لوڈشیڈنگ کے عذاب سے نجات پا جاتے‘ وہ وزیراعظم ہوتے تو عالمی مارکیٹ میں پٹرول خواہ دو سو ڈالر فی بیرل ہو جاتا لیکن وہ عوام کو سبسڈی 50 روپے لیٹر پٹرول دیتے رہتے‘ صدر صاحب بھی خوش رہتے اور عوام بھی اور جب ملک کے قرضے ناقابل برداشت ہو جاتے تو وہ حکومت سے استعفیٰ دیتے اور چار‘ چھ بلین ڈالر جیب میں ڈال کر امریکہ چلے جاتے اور اس کے بعد عوام جانتے اور قرضے جانتے“ ڈاکٹر صاحب نے انکار میں سر ہلا دیا۔

میں نے عرض کیا ”جناب آج سے بارہ برس قبل میں ایک اخبار کے نیوز ڈیسک پر کام کرتا تھا‘ ہمارے نیوز ایڈیٹر بلا کے نالائق اور کند ذہن تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت سازشی دماغ دے رکھا تھا‘ وہ جب چھٹی پر جاتے تھے تو جانے سے پہلے تمام ماہر اور لائق سب ایڈیٹروں کو چھٹی پر بھجوا دیتے تھے لہٰذا وہ جوں ہی اخبار کے دفتر سے باہر قدم رکھتے تو پیچھے بحران پیدا ہو جاتا تھا اور ایڈیٹر صاحب انہیں فون کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے‘ وہ واپس آتے تھے تو وہ راستے ہی سے سب ایڈیٹروں کو فون کرنا شروع کر دیتے اور منت ترلہ کر کے انہیں واپس بلا لیتے لہٰذا ان کے پہنچنے سے پہلے ایک آدھ لائق سب ایڈیٹر دفتر پہنچ چکا ہوتا اور یوں بحران حل ہو جاتا“ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا ”محترم شوکت عزیز نے بھی ہمارے ساتھ یہی تکنیک استعمال کی‘ انہوں نے جانے سے قبل سٹاک میں موجود ساری گندم بیچ دی‘ ملک میں کوئی ڈیم بننے دیا اور نہ ہی کوئی پاور پلانٹ لگایا‘ پٹرول سبسڈی پر فراہم کرتے رہے اور بیرونی اور اندرونی قرضوں سے عوام کی خدمت کرتے رہے لہٰذا وہ جوں ہی جہاز میں بیٹھے پیچھے کرائسس پیدا ہو گیا“ ڈاکٹر صاحب نے بڑی تیزی سے گردن انکار میں ہلائی‘ میں نے عرض کیا ”شوکت عزیز کی خدمات صرف یہیں تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہوں نے عدلیہ کا بحران بھی پیدا کیا‘ وہ سٹیل ملز کے ذریعے

اربوں روپے کمانا چاہتے تھے' انہوں نے سعودی عرب میں اپنے ایک پاکستانی دوست کو سٹیل مل خریدنے پر راضی کیا اور اسے 200 ارب روپے کی مل 21 ارب روپے میں بیچ دی' سپریم کورٹ اس سودے میں حائل ہوئی تو شوکت عزیز نے صدر پرویز مشرف کے کان بھر دیئے' صدر نے چیف جسٹس کو بلا کر حکومت کے حق میں فیصلہ دینے کا ''حکم'' دے دیا' چیف جسٹس نے اس حکم پر عمل نہ کیا اور یوں سپریم کورٹ اور ایوان صدر میں لڑائی شروع ہو گئی' شوکت عزیز اس لڑائی پر پٹرول چھڑکتے رہے' یہاں تک کہ ایک معمولی سا اختلاف جنگ کی شکل اختیار کر گیا' مجھے دو دن قبل چودھری پرویز الٰہی نے بتایا تھا ''مجھے اور چودھری شجاعت حسین کو چیف جسٹس کی معزولی کی اطلاع ٹیلی ویژن سے ملی تھی' صدر یا وزیراعظم نے افتخار چودھری کو معزول کرنے سے قبل مسلم لیگ ق کی قیادت کو ہرگز اعتماد میں نہیں لیا تھا لیکن جب یہ مسئلہ الجھ گیا تو شوکت عزیز نے چودھری شجاعت سے مدد کی درخواست کی' چودھری صاحب چیف جسٹس کے گھر گئے اور انہیں کوئی بیچ کا راستہ اختیار کرنے پر قائل کرنے لگے جب چیف جسٹس حکومت سے صلح کیلئے رضامند ہو گئے تو اس وقت سرکاری اہلکار چیف جسٹس کے گھر داخل ہوئے اور ان کی سرکاری گاڑیاں اٹھا کر لے گئے' چودھری شجاعت نے مجھے فون کیا' میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا گاڑیاں اٹھانے کا حکم شوکت عزیز نے دیا تھا' اس سے یوں محسوس ہوتا ہے شوکت عزیز نہیں چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ حل ہو'' چودھری پرویز الٰہی نے انکشاف کیا ''لال مسجد آپریشن کے دوران بھی ہمیں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا' چودھری شجاعت حسین درمیان میں پڑے' انہوں نے مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی کے ساتھ مذاکرات کئے اور انہیں 9 مطالبات میں سے آٹھ واپس لینے پر قائل کر لیا وہ اس کامیابی کے بعد شوکت عزیز کے پاس گئے اور انہیں کہا مسئلہ حل ہو چکا ہے' اب آپ آگے آئیں اور بات ختم کرا دیں لیکن شوکت عزیز نے اپنے ہاتھ جینز میں ڈالے اور مسکرا کر بولے' میں تو اپنی فیملی کے ساتھ قلفی کھانے جا رہا ہوں' شوکت عزیز نے اتنا کہا اور قلفی کھانے چلے گئے اور اسی دوران آپریشن شروع ہو گیا''۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا ''مجھے محسوس ہوتا ہے لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کا مسئلہ بھی شوکت عزیز کا پیدا کردہ تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے یہ مسئلہ حل ہو تا کہ ان کے جانے کے بعد یہ مسئلہ بھی عذاب کی شکل اختیار کر لے اور لوگ انہیں یاد کرتے رہیں'' میں نے ان سے عرض کیا ''چند دن پہلے راولپنڈی کے صدارتی کیمپ آفس کے اندر ہونے والی رقص و سرور کی ایک تقریب کی وڈیو جاری ہوئی ہے' یہ وڈیو اس وقت انٹرنیٹ پر موجود ہے' اس تقریب میں صدر پرویز مشرف' ان کی بیگم' شوکت عزیز اور ان کی بیگم اور حکومت کے پچاس ساٹھ اعلیٰ عہدیدار اور ان کی بیگمات موجود ہیں' سٹیج پر شبنم مجید نغمہ سرا ہیں اور سی بی آر کے چیئرمین عبداللہ یوسف شرکاء محفل کے سامنے ناچ رہے ہیں' وہ ناچتے ناچتے صدر کے پاس جاتے ہیں' ان کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور انہیں بھی ناچنے کی دعوت دیتے ہیں' صدر پرویز مشرف انکار کرتے ہیں تو شوکت عزیز فوراً صدر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور صدر اس حوصلہ افزائی پر اٹھ کر سٹیج کی طرف چل پڑتے ہیں اور اس کے بعد کیمرہ شرکاء کی طرف مڑ جاتا ہے اور محفل میں موجود لوگ تالیاں بجا کر داد دیتے ہیں'' ڈاکٹر صاحب خاموش رہے' میں نے عرض کیا ''ڈاکٹر صاحب یوں محسوس ہوتا ہے' چیف جسٹس کا ایشو ہو' مدرسہ حفصہ یا صدارتی رقص' شوکت عزیز نے ہر نازک مسئلے پر بڑا مین رول ادا کیا اور اس رول کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا کہ جب وہ گرین کارڈ جیب میں ڈال کر ملک سے فرار ہوں تو پوری قوم انہیں یاد کر کر کے روئے چنانچہ آج قوم رو رہی ہے' شوکت عزیز اپنے دور میں قلفیاں کھاتے رہے اور آج پورا ملک روٹی کو ترس رہا ہے' واہ! میرے محترم وزیراعظم تمہاری کیا بات ہے''۔

نوجوان بہت دکھی تھا‘اس کے ہاتھ میں کپ لرز رہا تھا‘ وہ بار بار کھنگار کر گلا صاف کرتا تھااور ٹشو سے آنکھیں پونچھتا تھا لیکن اس کا اضطرار کم نہیں ہو رہا تھا‘ وہ اندر ہی اندر ہلکی لیکن مسلسل آنچ پر پک رہا تھا‘اس کی توہین ہوئی تھی‘اس کی انا‘اس کی عزت نفس کچلی گئی تھی اوراسے اپنی انا کی ٹوٹی کرچیاں سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھیں‘ بات بہت معمولی تھی لیکن اس کی غربت‘اس کی بے بسی نے اس معمولی سی بات کو بڑا بنادیا تھا‘ غربت محدب عدسہ ہوتی ہے‘ یہ غم اور خوشی کا سائز ہمیشہ بڑھادیتی ہے‘ایک امیر آدمی جس خوشی کو معمولی سمجھ کر دھتکار دیتا ہے وہ خوشی جب کسی غریب شخص تک پہنچتی ہے تو اسے رات رات بھر نیند نہیں آتی‘اسی طرح جس غم‘جس دکھ کو بڑا شخص معمولی سمجھ لیتا ہے وہ دکھ غریب شخص کو اندر سے کھاجاتا ہے‘اس نوجوان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا‘وہ کسی امیر گھر میں ٹیوشن پڑھاتا تھا‘ وہ موٹر سائیکل پر وہاں جاتا تھا‘ایک شام اس گھر میں پارٹی تھی‘ پورچ اور ڈرائیو وے پر درجنوں قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں‘ان لمبی‘ بڑی اور چمکیلی گاڑیوں کے درمیان اس کی موٹر سائیکل چاند کا داغ محسوس ہو رہی تھی‘ وہ باہر نکلا تو صاحبوں اور میم صاحبوں نے اس کی موٹر سائیکل کا مذاق اڑانا شروع کر دیا‘ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن موٹر سائیکل نے عین وقت پر سٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا‘ وہ وہاں دیر تک موٹر سائیکل کو ککیں لگاتا اور میم صاحبوں اور صاحبوں کے قہقہے سنتا رہا‘ یہ قہقہے اس کے اندر اتر گئے‘ وہ میرے پاس آیا اور سامنے بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔

میں نے اس سے کہا ”میرے بھائی یہ توہین‘ یہ انا کی کچلی ہڈیاں اور عزت نفس کی یہ کرچیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں‘ یہ وہ بنیاد ہوتی ہیں جن پر دنیا کی بڑی بڑی شخصیات کی ذات تعمیر ہوتی ہے‘جس پر عظیم لوگوں کی عظمت کے مینار اور کامیاب لوگوں کی کامیابی کے گنبد بنتے ہیں‘ تم اگر اس احساس ندامت کو سنبھال سکو تو سنبھال لو‘ تم اس عظیم لمحے کو پکڑ سکو تو پکڑ لو یہ تمہیں کامیابی اور عزت سے نوازے گا‘ تم بھی چند ہی برسوں میں صاحب بن جاؤ گے“ اس نے آنکھیں پونچھیں اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا‘ میں نے کہا”میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں‘تم سنو اور پھر بتاؤ‘ تمہارا احساس توہین کتنا قیمتی ہے“ اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کئے اور خاموشی سے میری بات سننے لگا‘ میں نے عرض کیا”پولینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک غریب لڑکی رہتی تھی‘اس کا نام مانیاس کلوڈو وسکا تھا‘ وہ بھی تمہاری طرح ٹیوشن پڑھاکر گزر بسر کرتی تھی‘19 برس کی عمر میں وہ ایک امیر خاندان کی دس سال کی بچی کو پڑھاتی تھی‘ بچی کا بڑا بھائی اس میں دلچسپی لینے لگا‘ وہ بھی اس کی طرف مائل ہو گئی چنانچہ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب لڑکے کی ماں کو پتہ چلا تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا‘اس نے مانیا کو کان سے پکڑا اور پورچ میں لا کھڑا کیا‘اس نے آواز دے کر سارے نوکر جمع کئے اور چلاکر کہا‘ دیکھو یہ لڑکی جس کے پاس پہننے کیلئے صرف ایک فراک ہے‘جس کے جوتوں کے تلوؤں میں سوراخ ہیں اور جسے 24 گھنٹے میں صرف ایک بار اچھا کھانا نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی ہمارے گھر سے‘ یہ لڑکی میرے بیٹے کی بیوی بننا چاہتی ہے‘ یہ میری بہو کہلانے کی خواہش پال رہی ہے“ تمام نوکروں نے قہقہہ لگایا اور خاتون دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی‘ مانیا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے اوپر تیزاب کی بالٹی الٹ دی ہو‘ وہ توہین کے شدید احساس میں گرفتار ہو گئی اور اس نے اسی پورچ میں کھڑے کھڑے فیصلہ کیا وہ زندگی میں اتنی عزت‘ اتنی شہرت کمائے گی کہ پورا پولینڈ اس کے نام سے پہچانا جائے گا“ میں دم لینے کیلئے رکا‘ نوجوان میری بات سنتا رہا‘ میں نے عرض کیا”یہ 1891ء تھا‘ وہ پولینڈ سے پیرس آئی‘ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور فزکس پڑھنا شروع کر دی‘ وہ دن میں 20 گھنٹے پڑھتی تھی‘اس کے پاس پیسہ دھیلا تھا نہیں جو کچھ جمع پونجی تھی وہ اسی میں گزر بسر کرتی تھی‘ وہ روز صرف ایک شلنگ خرچ کرتی تھی‘اس کے کمرے میں بجلی‘ گیس اور کوئلوں کی انگیٹھی تک نہیں تھی‘ وہ برفیلے موسموں کی راتیں کپکپا کر گزارتی تھی‘ جب سردی برداشت سے باہر ہو جاتی تھی تو وہ اپنے سارے کپڑے نکالتی تھی‘ آدھے بستر پر بچھاتی تھی اور آدھے اوپر اوڑھ کر لیٹ جاتی تھی‘ پھر بھی گزارہ نہ ہوتا تو وہ اپنی ساری کتابیں حتیٰ کہ اپنی کرسی تک اپنے اوپر گرا لیتی تھی‘ پورے پانچ برس اس نے ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑوں اور مکھن کے سوا کچھ نہ کھایا‘ نقاہت کا یہ عالم ہوتا تھا وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو جاتی تھی لیکن جب ہوش آتا تھا تو وہ اپنی بے ہوشی کو نیند قرار دے کر خود کو تسلی دے لیتی تھی‘ وہ ایک روز کلاس میں بے ہوش ہو گئی‘ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا‘ آپ کو دوا کی بجائے دودھ کے ایک گلاس کی ضرورت ہے‘اس نے یونیورسٹی ہی میں پائری نام کے ایک سائنس دان سے شادی کر لی تھی‘ وہ سائنس دان بھی اسی کی طرح مفلوک الحال تھا‘ شادی کے وقت دونوں کا کل اثاثہ دو سائیکل تھے‘ وہ

غربت کے اسی عالم کے دوران پی ایچ ڈی تک پہنچ گئی' مانیا نے پی ایچ ڈی کیلئے بڑا دلچسپ موضوع چنا تھا' اس نے فیصلہ کیا وہ دنیا کو بتائے گی یورینیم سے روشنی کیوں نکلتی ہے' یہ ایک مشکل بلکہ ناممکن کام تھا لیکن وہ اس پر جُت گئی' تجربات کے دوران اس نے ایک ایسا عنصر دریافت کر لیا جو یورینیم کے مقابلے میں 20 لاکھ گنا روشنی پیدا کرتا ہے اور اس کی شعاعیں لکڑی' پتھر' تانبے اور لوہے غرض دنیا کی ہر چیز سے گزر جاتی ہیں' اس نے اس کا نام ریڈیم رکھا' یہ سائنس میں ایک بہت بڑا دھماکہ تھا' لوگوں نے ریڈیم کا ثبوت مانگا' مانیا اور پائری نے ایک خستہ حال احاطہ لیا جس کی چھت سلامت تھی اور نہ ہی فرش اور وہ چار برس تک اس احاطے میں لوہا پگھلاتے رہے' انہوں نے تن و تنہا 8 ٹن لوہا پگھلایا اور اس میں سے مٹر کے دانے کے برابر ریڈیم حاصل کی' یہ چار سال ان لوگوں نے گرمیاں ہوں یا سردیاں اپنے اپنے جسموں پر جھیلیں' بھٹی کے زہریلے دھوئیں نے مانیا کے پھیپھڑوں میں سوراخ کر دیئے لیکن وہ کام میں جتی رہی' اس نے ہار نہ مانی یہاں تک کہ پوری سائنس اس کے قدموں میں جھک گئی"۔

نوجوان بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا' میں نے کہا" یہ ریڈیم کینسر کے لاکھوں کروڑوں مریضوں کیلئے زندگی کا پیغام لے کر آئی' ہم آج جسے شعاؤں کا علاج کہتے ہیں یہ مانیا ہی کی ایجاد تھی اگر وہ لڑکی چار سال تک لوہا نہ پگھلاتی تو آج کی سنر کے تمام مریض مر جاتے' یہ لڑکی دنیا کی واحد سائنس دان تھی جسے زندگی میں دو بار نوبل پرائز ملا' جس کی زندگی پر 30 فلمیں اور سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور جس کی وجہ سے آج سائنس کے طالب علم پولینڈ کا نام آنے پر سر سے ٹوپی اتار دیتے ہیں" میں ایک لمحے کیلئے رکا اور اس نوجوان سے پوچھا "تم اس مانیا کا پورا نام جانتے ہو" نوجوان نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے قہقہہ لگایا" میرے عزیز دنیا پولینڈ کی اس مفلوک الحال' اس بے بس اور بے کس لڑکی کو مادام کیوری کے نام سے جانتی ہے" نوجوان کی آنکھوں میں روشنی اتر آئی' میں نے کہا" لیکن ابھی اس کہانی کا کلائمکس باقی ہے' جب دنیا نے مادام کیوری کو اس ایجاد کے بدلے اربوں ڈالر کی پیش کش کی تو اس نے پتہ ہے کیا کہا؟ اس نے کہا' میں یہ دریافت صرف اس کمپنی کو دوں گی جو پولینڈ کی ایک بوڑھی عورت کا مفت علاج کرے گی' جی ہاں! وہ امیر پولش عورت جس نے کبھی کیوری کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا تھا' وہ اس وقت کینسر کے مرض میں مبتلا ہو چکی تھی اور وہ اس وقت بستر مرگ پر پڑی تھی" میں رکا اور پھر نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا" میرے بھائی اس دنیا میں روزانہ کروڑوں' اربوں لوگوں کی توہین ہوتی ہے' کروڑوں' اربوں لوگ ایک دوسرے کی انا' عزت نفس اور وقار کو قدموں میں روندتے ہیں لیکن توہین کا وہ احساس جو 3 پونڈ ماہانہ کی ایک ٹیوٹر کو مادام کیوری بنا دے وہ احساس اللہ تعالیٰ کسی کسی کو نصیب کرتا ہے' یہ احساس دنیا کی قیمتی ترین چیز ہے' جاؤ شکرانے کے دو نفل پڑھو اور اللہ کے بخشے اس لمحے کو کامیابی میں ڈھال دو' اسے زندگی بنا لو' یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ کسی سے راضی ہوتا ہے تو وہ اسے دولت سے نہیں نوازتا وہ اسے ادراک دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس ادراک سے نوازہ ہے' اللہ تعالیٰ نے تمہیں مادام کیوری جیسا احساس بخشا ہے' اب یہ تم پر ہے تم اس سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہو' تم بنیاد کے اس پتھر پر اونچی عمارت بناتے ہو یا پھر اسے رونے دھونے میں ضائع کر دیتے ہو"

توبہ

چند دن پہلے ایک باریش بزرگ میرے پاس تشریف لائے اور چپ چاپ میرے سامنے بیٹھ گئے‘ ان کی آنکھوں سے پریشانی‘ اداسی اور مایوسی جھلک رہی تھی‘ میں نے ان سے پریشانی کا سبب پوچھا تو انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور رک رک کر بولے ”گزشتہ برس حکومت نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن شروع کیا تھا“ میں خاموشی سے سننے لگا‘ وہ بولے ”اس آپریشن کے دوران حکومت نے پہلے جامعہ پر فائرنگ کی‘ پھر گولے پھینکے اور اس کے بعد چند موذی کیمیکلز اور گیسیں استعمال کی تھیں جن کے باعث ہزاروں بچیاں نا صرف شہید ہو گئیں بلکہ ان کی نعشیں بھی شناخت کے قابل نہیں رہی تھیں“ وہ رکے اور دم لے کر دوبارہ بولے ”حکومت نے ان تمام نعشوں کو چپ چاپ اسلام آباد میں دفن کر دیا تھا‘ ان بچیوں میں میری بچی بھی شامل تھی‘ میں روز مانسہرہ سے اسلام آباد آتا ہوں‘ قبرستان جاتا ہوں اور ایک ایک کر کے تمام قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہوں‘ میں سوچتا ہوں شائد یہ قبر میری بیٹی کی ہو یا پھر وہ قبر ہو یا پھر آخری قبر میں میری بیٹی سو رہی ہو“ وہ رکے اور دوبارہ بولے ”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کوئی شخص مجھے میری بیٹی کی قبر کی نشاندہی کر دے لیکن افسوس اس زندہ شہر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو میری یہ خواہش پوری کر دے“ باباجی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے‘ میں نے باباجی سے عرض کیا ”میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں‘ میں آپ کے درد میں شریک ہو سکتا ہوں‘ میں آپ کو تسلی کے چند بول بھی دے سکتا ہوں لیکن آپ کی بیٹی۔۔“ میں فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا‘ باباجی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ میرے دل پر گرنے لگے‘ انہوں نے کندھے سے چادر کا پلو کھینچا‘ آنکھوں کو صاف کیا‘ ہاتھ میری طرف بڑھایا‘ ایک غمناک آہ بھری اور بوجھل قدموں سے میرے دفتر سے باہر نکل گئے۔ باباجی چلے گئے‘ پیچھے میں تھا اور باباجی کے آنسو اور آہیں تھیں‘ میں سوچنے لگا کہیں یہ آنسو اور یہ آہیں اس ملک کے تمام مسائل کی بنیاد تو نہیں‘ کہیں یہ دکھے دل اور یہ زخمی سانسیں اس ملک کے بحرانوں کا اصل سبب تو نہیں ہیں۔

میں سوچنے لگا‘ اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں رزق کیوں کم کر دیا اور اس نے بجلی‘ گیس‘ پانی اور تیل کیوں اٹھا لیا‘ میری سوچیں وسیع ہوتی چلی گئیں اور مجھے بچپن میں پڑھا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا‘ ہزاروں سال پہلے یہودیوں کی کسی بستی میں قحط پڑ گیا‘ بستی کی ساری زمینیں بنجر ہو گئیں‘ سارے جانور ایک ایک کر کے مر گئے‘ سارے درخت سوکھ گئے اور انسان انسان کو کاٹ کر کھانے لگا‘ بستی کے لوگوں نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعائیں کیں لیکن بارش نہ ہوئی‘ لوگوں نے دوسری بستیوں سے غلہ منگوایا لیکن اس غلے کو کیڑا لگ گیا‘ لوگوں نے نقل مکانی شروع کی تو انہیں کوڑھ کا مرض لاحق ہو گیا اور دوسری بستی کے لوگوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ بستی کے لوگ گلیوں اور بازاروں میں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنے لگے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے موت بھی ان لوگوں سے روٹھ گئی ہو‘ قحط کے اس دور میں کسی نے مشورہ دیا ”فلاں گاؤں میں اللہ کا ایک نبیؑ رہتا ہے چلو چل کر اس سے دعا کراتے ہیں“ بستی کے لوگ نبیؑ کے پاس حاضر ہوئے اور ان کے سامنے گڑگڑانے لگے‘ نبیؑ کو ان پر ترس آ گیا اور انہوں نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے‘ ابھی نبیؑ نے دعا شروع نہیں کی تھی کہ ان پر وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”آپ ان بدبختوں سے کہیں ان کی بستی میں میرا ایک مقرب بندہ رہتا ہے اور انہوں نے دو سال سے اس کا حقہ پانی بند کر رکھا ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا بندہ بھوکا اور پیاسا رہے اور میں ان لوگوں کے دستر خوان آباد رکھوں‘ ان سے کہہ دیجئے جب تک میرے بندے کو روٹی‘ پانی اور دوا نہیں ملے گی اس وقت تک کوئی دعا‘ کوئی عبادت اور کوئی ترکیب ان کے کام نہیں آئے گی“۔ بستی کے لوگ واپس گئے‘ انہوں نے اللہ کے مقرب بندے سے معافی مانگی اور اسی شام بارش شروع ہو گئی‘ اس بستی کا قحط ختم ہو گیا۔ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ہمارا ایمان ہے کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے سکھی‘ مطمئن‘ خوشحال اور پرسکون نہیں رہ سکتا اور ہم لوگ لمحہ موجود میں انتہائی بے سکون‘ بدحال‘ غیر مطمئن اور ٹینس ہیں؟ سوال پیدا ہوتا ہے کیوں؟ اس کیوں کی کوکھ میں باباجی جیسے سینکڑوں لوگوں کے آنسو‘ آہیں اور درد چھپا ہے اور جب سے وہ بزرگ میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں‘ مجھے محسوس ہوتا ہے ہمارے ان تمام مسائل کی وجوہات لال مسجد اور مدرسہ حفصہ میں پیوست ہیں۔

حکومت نے 3 جولائی 2007ء کو اسلام آباد کی لال مسجد اور اس سے ملحقہ دارالعلوم حفصہ کا گھیراؤ کیا تھا‘ اس مدرسے میں یتیم بچیاں دینی تعلیم حاصل کرتی تھیں‘ 3 سے 10 جولائی تک اس جگہ انتہا درجے کا ظلم ہوا جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تین سے چار سو اور غیر سرکاری اندازے کے مطابق ایک ہزار بچیاں شہید ہو گئیں‘ یہ ایک ایسا اقدام تھا جسے آج پرانی حکومت کے عہدیدار بھی ظلم قرار دے رہے ہیں‘ چودھری شجاعت حسین سے

لے کر ڈاکٹر شیر افگن تک ماضی کے تمام حکمران اس اقدام کی مذمت کر چکے ہیں لہٰذا مجھے محسوس ہوتا ہے' ہو سکتا ہے اس ظلم سے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ناراض ہو گیا ہو اور ہمارے موجودہ حالات کی خرابی کی وجہ اللہ تعالیٰ کی یہ ناراضی ہو۔ آپ خود فیصلہ کیجئے' حکومت نے لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کی بجلی کاٹ دی تھی' آج پورے ملک کی بجلی بند ہے' حکومت نے یتیم بچیوں کی خوراک کی سپلائی روک دی تھی' آج پورے ملک سے آٹا غائب ہے' حکومت نے لال مسجد کا پانی بند کیا تھا' آج ہمارے سارے ڈیم' سارے دریا اور ساری نہریں سوکھ چکی ہیں' حکومت نے مسجد کے گرد کرفیو لگایا تھا' آج پورا ملک صدر مشرف کی ایمرجنسی کے نتائج بھگت رہا ہے' عدالتوں نے مدرسے کی یتیم بچیوں کو انصاف نہیں دیا تھا' آج پاکستان کا پورا عدالتی نظام ایڑیاں رگڑ رہا ہے' حکومت نے مدرسے کا پٹرول ٹینک اڑا دیا تھا' آج پورا ملک پٹرول کے شدید بحران میں مبتلا ہے' حکومت نے شہید بچیوں کے لواحقین کو احتجاج نہیں کرنے دیا تھا' آج پورے ملک میں احتجاج ہو رہے ہیں' مدرسے کے اندر شہید بچیوں کی نعشیں جلا دی گئی تھیں' آج ملک میں لوگ لوگوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہے ہیں' حکومت نے اس ایشو سے امریکہ سے ڈالر لئے تھے' آج ہمارا روپیہ ڈی ویلیو ہوتا چلا جا رہا ہے اور حکومت نے اس ظلم کیلئے فوج اور رینجرز کو استعمال کیا تھا' آج فوج کے تمام اعلیٰ افسر اور سنٹرز خودکش حملوں کا ٹارگٹ ہیں۔ ہم تھوڑا سا مزید آگے چلتے ہیں' یہ آپریشن صدر پرویز مشرف نے کرایا تھا' آج اس ملک میں صدر پرویز مشرف کی کیا پوزیشن ہے' اس آپریشن کی تحریری اجازت شوکت عزیز نے دی تھی' آج وہ شوکت عزیز کہاں ہے؟ اس آپریشن کے دوران مسلم لیگ ق کی حکومت تھی' آج وہ مسلم لیگ ق کہاں ہے' پاکستان پیپلز پارٹی کی قائد محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس آپریشن کے حق میں بیان دیا تھا' محترمہ کتنی بڑی ٹریجڈی کا شکار ہوئیں' مولانا فضل الرحمان اور ایم ایم اے نے یہ آپریشن رکوانے کی کوشش نہیں کی' آج ایم ایم اے اور مولانا فضل الرحمان کی کیا پوزیشن ہے اور مسلم لیگ ن کے قائد میاں نواز شریف نے مدرسہ کی بچیوں کی کھل کر حمایت نہیں کی تھی' قدرت نے انہیں بھی کھل کر حکومت نہیں دی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا یہ تھیسس سو فیصد درست ہے لیکن اس کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی ناراضی کے امکان کو مسترد نہیں کر سکتے چنانچہ میرا خیال ہے ہمیں اللہ تعالیٰ سے فوراً معافی مانگنی چاہئے اور توبہ کرنی چاہئے ورنہ ہمارے مسائل میں اسی طرح اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے اس ملک کے حصے کی تمام نعمتیں مدرسہ حفصہ کی بچیوں کی قبروں میں دفن کر دی ہیں اور جب تک ہم توبہ نہیں کرتے' ہم اللہ تعالیٰ کو نہیں مناتے ہمیں یہ ساری نعمتیں واپس نہیں ملیں گی' ہم اس وقت تک اسی طرح آٹے' بجلی اور پانی کو ترستے رہیں گے۔

انصاف کا یہ طریقہ 14 مئی 2008ء کو ایجاد ہوا' یہ بدھ کا روز تھا' دن کے بارہ بجے تھے' کراچی کے ایک قدیم علاقے رنچھوڑ لائین کے ایک گھر کے دروازے پر دستک ہوئی' بچی نے کنڈی کھول دی' دروازے کے دونوں پٹ دھماکے سے کھلے اور تین نوجوان اندر داخل ہو گئے' ان کے ہاتھوں میں پستول تھے اور اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے سب کو ہاتھ اٹھانے اور خاموش رہنے کا حکم دے دیا اور خواتین کو نقدی اور زیورات نکالنے کی ہدایت کر دی' خواتین چپ چاپ زیورات اور نقدی ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ اس دوران گھر کا مالک اکبر وہاں پہنچ جاتا ہے' ایک ڈاکو اس پر گولی چلا دیتا ہے' گولی اکبر کی کمر میں پیوست ہو جاتی ہے' گھر کی خواتین جب اکبر کا خون دیکھتی ہیں تو وہ مشتعل ہو جاتی ہیں اور جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شور مچا دیتی ہیں' خواتین کی چیخ و پکار اور گولی کی آواز سن کر محلے دار جمع ہو جاتے ہیں' ڈاکو سامان اٹھاتے ہیں اور پستول لہراتے ہوئے گھر سے باہر آ جاتے ہیں۔
اس وقت تک گلی میں ہزار ڈیڑھ ہزار افراد جمع ہو چکے ہیں' لوگ آگے بڑھتے ہیں' ڈاکوؤں کو پکڑتے ہیں اور انہیں سڑک پر لٹا کر ٹھڈوں اور مکوں سے مارنا شروع کر دیتے ہیں' ڈاکو نیم جان ہو جاتے ہیں' ان کے ہاتھ' پاؤں اور پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں' اس دوران کوئی شخص پٹرول کا کین لے آتا ہے' ہجوم میں سے دو نوجوان آگے بڑھتے ہیں' وہ تینوں ڈاکوؤں پر پٹرول چھڑکتے ہیں' جیب سے ماچس نکالتے ہیں' دیا سلائی جلاتے ہیں اور جلتی ہوئی دیا سلائی ان تینوں پر پھینک دیتے ہیں' ڈاکو آگ سے بچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں' سڑک پر تڑپتے ہیں' چیختے ہیں' چلاتے ہیں' معافیاں مانگتے ہیں' منتیں کرتے ہیں لیکن ہجوم اور آگ کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی یہاں تک کہ وہ ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر ساکت ہو جاتے ہیں' یہاں کہانی کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔
کہانی کا دوسرا حصہ 17 مئی کو شروع ہوتا ہے' نارتھ ناظم آباد میں ایک بس فائیو سٹار چورنگی سے سخی حسن جان کیلئے روانہ ہوتی ہے' بس میں اچانک دو نوجوان کھڑے ہوتے ہیں' جیب سے پستول نکالتے ہیں اور تمام مسافروں کو اپنی اپنی جیبیں خالی کرنے کا حکم دیتے ہیں' لوگ اپنی جیبیں ڈاکوؤں کے سامنے الٹ دیتے ہیں' ڈاکو بس رکواتے ہیں' نیچے اترتے ہیں اور دوڑ پڑتے ہیں' بس کے مسافر ڈاکو' ڈاکو کے نعرے لگاتے ہیں' لوگ جمع ہوتے ہیں اور ڈاکوؤں کو دھر لیتے ہیں' ڈاکو جلد ہی بے حال ہو کر سڑک پر گر جاتے ہیں' ہجوم میں موجود ایک نوجوان بھاگ کر تیل کا پیپا لے آتا ہے' دونوں ڈاکوؤں پر پٹرول چھڑکا جاتا ہے' ان پر دیا سلائی گرائی جاتی ہے اور ڈاکو سرے عام تڑپنے لگتے ہیں' اس دوران پولیس کے تین اہلکار بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں' وہ ڈاکوؤں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہجوم اہلکاروں کو پکڑ کر ان پر بھی تیل چھڑک دیتا ہے' اہلکار ڈر جاتے ہیں چنانچہ وہ ہجوم سے معافی مانگ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ اسی روز سرسید ٹاؤن میں تین ڈاکو ایک فیکٹری میں گھس جاتے ہیں' لوٹ مار کرتے ہیں لیکن جب فرار کا وقت آتا ہے تو ہجوم انہیں بھی گھیر لیتا ہے' ہجوم میں سے ایک نوجوان گارڈ سے رائفل لیتا ہے اور ایک ڈاکو کو سرے عام گولی مار دیتا ہے جبکہ دوسرے دو ڈاکو سڑک پر ناک سے لکیریں نکال کر جان بچاتے ہیں' اسی دن سولجر بازار کے ایک پی سی او میں بھی ڈاکو گھس جاتے ہیں' لوگ ایک ڈاکو کو گولی مار دیتے ہیں' وہ سڑک پر ایڑیاں رگڑنے لگتا ہے' پولیس آتی ہے اور عوام یہ ڈاکو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں' ان دونوں واقعات کے دوران ہجوم پٹرول تلاش کرتا ہے لیکن بروقت پٹرول نہ ملنے کی وجہ سے ڈاکو بچ جاتے ہیں لیکن شام تک جب یہ خبریں سکھر پہنچتی ہیں تو سکھر کے لوگ بھی ایک ڈاکو تلاش کر لیتے ہیں' لوگ اس پر بھی پٹرول چھڑکتے ہیں لیکن پولیس بروقت پہنچ کر اس کو عوام کے ہاتھوں سے بچا لیتی ہے۔ 18 مئی کو کراچی گلبرگ میں بھی دو ڈاکو ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں' لوگوں کو ڈاکے کا علم ہو جاتا ہے' وہ بھی ڈاکوؤں کو پکڑ لیتے ہیں' ان پر پٹرول چھڑکتے ہیں لیکن انہیں بھی پولیس بچا لیتی ہے' اسی دن لاہور میں ایک واردات ہوتی ہے' عوام ڈاکوؤں کو پکڑتے ہیں' پٹرول لاتے ہیں لیکن پولیس ڈاکوؤں کی حفاظت کیلئے پہنچ جاتی ہے اور یہ دو ڈاکو بھی عبرت ناک انجام سے بچ جاتے ہیں' یہ کہانی کا دوسرا حصہ تھا۔

آپ اگر کہانیاں پڑھتے ہیں تو آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں دنیا کی کوئی کہانی محض دو حصوں تک محدود نہیں ہوتی' کہانیوں کا تیسرا' چوتھا' پانچواں' دسواں اور آخری حصہ بھی ضرور ہوتا ہے اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا یہ کہانی ابھی صرف دو حصوں تک پہنچی ہے اور اس کا آخری باب اور اس آخری باب سے قبل تیسرا چوتھا اور دسواں باب ابھی تحریر نہیں ہوا' یہ باب ابھی لکھے جانے باقی ہیں لیکن ہم بڑی آسانی سے ان بابوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں' اس کہانی کا تیسرا باب عوامی عدالتیں اور عوامی انصاف ہے اور یہ انصاف یہ عدالتیں اس ملک کے تمام شہروں اور قصبوں میں

شروع ہو جائیں گی' لوگ اپنا مجرم پکڑیں گے' اسے سڑک پر کھڑا کریں گے' اس کی فرد جرم پڑھیں گے' وہاں موجود لوگوں سے ریفرنڈم کرائیں گے اور ملزم کو فوری انصاف کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا دیں گے' کہانی کے [illegible] باب میں سابق حکومتوں کے ان عہدیداروں' مشیروں' وزراء اور پارٹی عہدیداروں کی باری آ جائے گی جنہوں نے ملک کے اربوں روپے لوٹے' ان کے خلاف مقدمے بنے' ان کے خلاف تفتیش ہوئی' انہیں نیب نے گرفتار کیا لیکن پھر یہ لوگ پلی بارگین کے ذریعے باہر آ گئے' یہ لوگ حکمران پارٹی میں شامل ہوئے' حکومت نے انہیں وفاداری بدلنے کی قیمت دی اور یہ لوگ یونیفارم کی حفاظت کا اعلان کرنے لگے اور یہ لوگ سٹیل مل سے لے کر چیف جسٹس کی معطلی تک حکومت کے ہر فیصلے کی ڈھال بن گئے اور انہوں نے ملک کو نقصان پہنچانے کے ہر منصوبے کی حمایت کی' کہانی کے پانچویں باب میں وہ لوگ ٹارگٹ ہوں گے جو اس وقت کے حکمران ہیں' وہ تمام لوگ جنہوں نے ڈیل کے ذریعے مقدمے ختم کرائے' جو آٹے' چاول' چینی' گھی اور دالوں میں اربوں روپے کما رہے ہیں۔ کہانی کے چھٹے باب میں اس ملک کے وہ تمام سیاستدان نشان عبرت بنیں گے جو جھوٹے وعدے کر کے اسمبلیوں میں پہنچتے رہے اور وہاں پہنچ کر عوام کو لوٹنے اور کھسوٹنے میں مصروف ہو گئے' جنہوں نے عوام کی ہڈیوں سے کروڑوں اور اربوں کشید کیے' جو ترقیاتی فنڈز کھا گئے' جو زکوۃ فنڈز ڈکار گئے اور جنہوں نے کمیشن کے نام پر مزار قائد تک کو نہ بخشا' کہانی کے ساتویں باب میں وہ تمام مذہبی رہنما عوام کے قابو آ جائیں گے جنہوں نے جان بوجھ کر قوم کو تقسیم رکھا' جو مسجدوں' امام بارگاہوں اور جنازہ گاہوں کو منافرت پھیلانے کیلئے استعمال کرتے رہے اور جو پیٹ اور جیب کا دوزخ بھرنے کیلئے قرآن اور احادیث کو متنازعہ بناتے رہے' کہانی کے آٹھویں باب میں ملک کی اسٹیبلشمنٹ عوام کا نشانہ بنے گی' ملک میں خفیہ والے گالی بن جائیں گے اور لوگ انہیں بلوں تک سے ڈھونڈ نکالیں گے' نویں باب میں سیکورٹی کے سارے ادارے ڈاکوؤں جیسے انجام کا شکار ہو جائیں گے اور دسویں باب میں' جی ہاں! کہانی کے دسویں باب میں اس ملک کے تمام خوشحال لوگوں کو بدحال' غریب' مسکین اور محروم لوگ سڑکوں پر لٹکا کر آگ لگا دیں گے اور اس ملک کے ہر دوسرے گھر' ہر پہلی گلی' سڑک اور محلے سے آگ اٹھ رہی ہو گی اور یہ اس کہانی کا آخری باب ہو گا۔

دنیا کی ہر کہانی پہلے باب سے آخری باب کی طرف بڑھتی ہے اور انارکی' خانہ بربادی اور انقلاب کی ساری کہانیاں رنچھوڑ لائین کے ایسے واقعات ہی سے سٹارٹ ہوتی ہیں اور روانڈا اور برونڈی پر جا کر ختم ہوتی ہیں اور قانون اور انصاف وہ "ایلفی" ہوتا ہے جو قوموں' ملکوں اور معاشروں کو جوڑے رکھتا ہے اور جب معاشروں سے انصاف اور قانون اٹھ جاتا ہے تو قوموں اور ملکوں کے تمام جوڑ کھل جاتے ہیں اور اس کے بعد شہروں کی سڑکیں اور محلوں کے چوک عدالتیں بن جاتی ہیں اور پٹرول کے ڈبے قانون اور جب معاشرے اس قانون اور اس عدالت کو مان لیتے ہیں تو پھر ملکوں کو بچانا ممکن نہیں رہتا' دنیا کے ہر سفر کا ایک آغاز اور ایک انجام ہوتا ہے اور اس ملک میں 14 مئی کو رنچھوڑ لائین سے جس سفر کا آغاز ہوا ہے اس کے آخر میں تاریخ کا ایک بہت بڑا قبرستان ہے اور اس قبرستان میں وہ تمام قومیں دفن ہیں جنہوں نے قانون کو تھانوں سے نکال کر ہجوموں کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور انصاف کو عدالتوں سے نکال کر جوڈیشل کالونی میں نظر بند کر دیا تھا اور اس قبرستان میں وہ قومیں دفن ہیں جنہیں قبر کا کتبہ تک نصیب نہیں ہوا تھا' بدقسمتی یہ نہیں کہ عوام نے اپنا انصاف خود شروع کر دیا ہے بلکہ بدقسمتی یہ ہے کہ ڈاکوؤں کی نعشوں سے اٹھنے والا دھواں تاریخ کے اس قبرستان تک پہنچ رہا ہے۔

پنجاب کے سابق آئی جی (مرحوم) سردار محمد چودھری ایک چپڑاسی کے بیٹے تھے' لاہور کے ایک تاجر شیخ محمد یوسف نے ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کئے' سردار محمد چودھری نے تمام کلاسوں میں وظیفے لئے' یونیورسٹی تک تعلیم پائی' سی ایس ایس کیا' پولیس سروس میں آئے اور پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے آئی جی بنے' چودھری صاحب کی اس مثال کو دیکھتے ہوئے شیخ محمد یوسف کے صاحبزادے شیخ طاہر یوسف نے اپنے دوساتھیوں کے ساتھ مل کر لاہور میں ٹرسٹ سکول کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی' شیخ طاہر یوسف اور ان کے رفقاء کا خیال تھا وہ اس تعلیمی ادارے میں ان بچوں کو تعلیم دیں گے جن کے والدین اچھی' معیاری اور اعلیٰ تعلیم ''افورڈ'' نہیں کر سکتے' ٹرسٹ سکول کے قیام کے بعد ان لوگوں نے لاہور کے مخیّر حضرات سے رابطہ کیا' مخیّر حضرات آگے بڑھے اور انہوں نے ایک ایک' دو' دو بچوں کے تعلیمی اخراجات اپنے ذمے لے لئے یوں اس سکول میں ان طالب علموں کو مفت مگر معیاری تعلیم ملنے لگی جن کے والدین اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتے تھے' ٹرسٹ سکول کے بچے سردار محمد چودھری جیسے باصلاحیت نکلے اور وہ تعلیمی بورڈ میں اعلیٰ پوزیشنیں حاصل کرنے لگے' یہ بچے کس قدر باصلاحیت اور ذہین تھے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا ئیے کہ Lums پاکستان کا سب سے مہنگا اور معیاری تعلیمی ادارہ ہے' اس ادارے میں ٹرسٹ سکول کے 11 طالب علم سکالر شپ پر داخل ہوئے' یہ 11 طالب علم اتنے ذہین تھے کہ ان کے سو فیصد اخراجات لمز برداشت کر رہا ہے' ان طالب علموں میں سے 3 تعلیم مکمل کر چکے ہیں اور ان تین میں سے دو طالب علموں کو کویت میں شاندار نوکریاں مل چکی ہیں' ان میں سے ایک پونے دو لاکھ روپے جبکہ دوسرا نوجوان اڑھائی لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ لے رہا ہے اور ان دونوں نوجوانوں کی نوکری کا یہ پہلا سال ہے اور یہ دونوں انتہائی غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں' ٹرسٹ سکول اب تک لاہور میں پانچ برانچیں کھول چکا ہے اور ان پانچ سکولوں میں 1200 طالب علم زیر تعلیم ہیں' ٹرسٹ سکول کی انتظامیہ کی خواہش ہے وہ لاہور اور اس کے مضافات میں ایسے ساٹھ سکول کھولے جن میں بارہ ہزار غریب طالب علموں کو معیاری تعلیم دی جائے۔

ٹرسٹ سکول کا یہ تجربہ ثابت کرتا ہے دنیا کا ہر بچہ باصلاحیت اور ذہین پیدا ہوتا ہے اور اگر اس بچے کو تعلیم کا معیاری ادارہ مل جائے تو وہ نہ صرف لمز تک پہنچ جاتا ہے بلکہ وہ ملازمت کے ابتدائی مہینوں میں لاکھوں روپے تنخواہ بھی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس بچے کو تعلیم نہ ملے تو وہ گلیوں میں خوار ہو جاتا ہے' وہ منشیات کا عادی ہو جاتا ہے یا پھر وہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں چوری چکاری' ڈاکہ زنی' لوٹ مار اور چھینا جھپٹی کو اپنا پروفیشن بنالیتا ہے' حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا دنیا کا ہر بچہ آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن معاشرہ اسے غلام بنا دیتا ہے' ہم اگر حضرت عمرؓ کے اس قول میں ذرا سے اضافے کی جسارت کریں تو کہہ سکتے ہیں دنیا کا ہر بچہ آزادی کے ساتھ ساتھ صلاحیت اور ذہانت بھی لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن تعلیم اور مواقع کی کمی اس کی ذہانت اور صلاحیت کو نگل جاتی ہے اور وہ حالات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے چنانچہ ہم اگر اس معاشرے کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس ملک کے بچوں کیلئے جنگی بنیادوں پر تعلیم کا بندوبست کرنا ہوگا اور یہ وہ نقطہ ہے جس سے پاکستان کا کوئی طبقہ' گروہ' جماعت یا مکتبہ فکر اختلاف نہیں کرتا' پاکستان کی دوسری بڑی حقیقت فوج ہے' پاک فوج ملک کا منظم' مضبوط اور شاندار ادارہ ہے لیکن بدقسمتی سے یہ ادارہ سیاست کی دلدل میں دھنس چکا ہے اور یہ حقیقت ہے جب معاشرے کا کوئی مضبوط یا طاقتور طبقہ اقتدار میں حصہ دار بن جاتا ہے تو وہ اس وقت تک اقتدار سے الگ نہیں ہوتا جب تک اس کی طاقت ختم نہیں ہوتی لہٰذا ہمیں ماننا پڑے گا جب تک خدانخواستہ ہماری فوج کمزور نہیں ہوتی یا پھر ہمارا سیاسی نظام بہت طاقتور اور مضبوط نہیں ہوتا اس وقت تک فوج اقتدار پر اثرانداز ہوتی رہے گی اور ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا اگر خدانخواستہ فوج بھی غیر منظم ہوگئی تو ملک کو بے تحاشا نقصان ہوگا' میں اب تعلیم اور فوج کی سچائیوں کو اکٹھا کرتا ہوں' ہمیں چاہیے ہم فوج کو ملکی سرحدوں کے ساتھ ساتھ نظریاتی اور ذہنی سرحدوں کا محافظ بھی بنادیں' ہم تعلیم کا شعبہ فوج کے حوالے کر دیں' فوج پچھلے ساٹھ برسوں سے چھاؤنیوں میں بڑے شاندار سکول' کالج اور یونیورسٹیاں چلا رہی ہے' ان کے پاس ایجوکیشن کور بھی ہے جس میں باصلاحیت اساتذہ اور ماہرین تعلیم ہیں' ہم اگر پاکستان کے تمام سکول' کالج اور یونیورسٹیاں فوج کے حوالے کر دیں' اپنا سارا تعلیمی بجٹ فوج کے حوالے کر دیں اور اس کے بعد ملک کے ساڑھے پانچ کروڑ بچے ان کے حوالے کر دیں تو مجھے یقین ہے فوج تعلیم کے شعبے میں پانچ برسوں میں انقلاب لا سکتی ہے' مجھے معلوم ہے یہاں پر ہمارے ماہرین تعلیم یہ اعتراض کریں گے کہ ہمارا تعلیم کا بجٹ انتہائی کم ہے اور

اس بجٹ میں ملک بھر کے بچوں کو معیاری تعلیم نہیں دی جاسکتی لیکن اس مسئلے کا بھی ایک حل موجود ہے' حکومت نے جی ایچ کیو راولپنڈی سے اسلام آباد شفٹ کرنے کیلئے فوج کو ای سیکٹر میں بڑے پیانے پر زمین الاٹ کی تھی' یہ فیصلہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1972ء میں کیا تھا اور سی ڈی اے نے اس فیصلے کی روشنی میں پچھلے دور حکومت میں ای 10 اور ڈی 11 سیکٹر فوج کے حوالے کر دیا تھا اور ان سیکٹروں میں فوج کے پاس 27 ہزار کنال زمین ہے' اسلام آباد کے ای سیکٹر ملک کے مہنگے ترین سیکٹر سمجھے جاتے ہیں' ای 10 سے دو کلو میٹر پیچھے ای سیون سیکٹر ہے اور اس سیکٹر میں اس وقت ایک کنال کے پلاٹ کی قیمت 5 کروڑ روپے ہے' ای 10 کے بعد ای الیون آتا ہے' اس سیکٹر میں پرائیویٹ ہاؤسنگ سکیمیں ہیں اور وہاں بھی دو کروڑ روپے میں پلاٹ ملتا ہے' فوج کے پاس ای ٹین اور ڈی الیون میں 27 ہزار کنال اراضی ہے' ہم اگر اس سیکٹر میں فی کنال زمین کی قیمت ایک کروڑ روپے لگا لیں تو یہ رقم 270 ارب روپے بن جائے گی چنانچہ اگر فوجی قیادت مان جائے اور فوج یہ 27000 کنال زمین نیلام کرے' اس سے 270 ارب روپے حاصل کرے' اس سے تعلیمی فنڈ قائم کرے' حکومت سے تعلیم کا سالانہ بجٹ لے' تمام سکول' کالجز اور یونیورسٹیوں کا بندوبست سنبھالے اور تعلیم کے شعبے میں جنگی بنیادوں پر کام شروع کر دے تو میرا خیال ہے ملک میں حقیقی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا فوج اور عام معاشرہ الگ الگ نہیں ہیں اور ملک میں سویلین اور ملٹری کی تقسیم غیر اخلاقی اور متعصبانہ ہے' پاکستان کے فوجی کسی دوسرے ملک کے شہری نہیں ہیں یہ ہمارے ہی بھائی' بھتیجے اور بیٹے ہیں اور اسی طرح سویلین بھی کسی غیر ملک سے تعلق نہیں رکھتے' یہ بھی کسی فوجی کے والد' بھائی' بھانجے اور بھتیجے ہیں اور جب ملک ختم ہوتے ہیں تو سویلین بچتے ہیں اور نہ ہی فوجی' میں نے اپنی آنکھوں سے پشاور شہر میں افغانستان کے جرنیلوں اور وزیروں کو چائے بیچتے اور ریستورانوں پر کام کرتے دیکھا ہے' قومیں جب ختم ہوتی ہیں تو ان کا ہر شہری ''افغانی'' بن جاتا ہے اور دنیا سب کے ساتھ ایک جیسی نفرت اور حقارت کا سلوک کرتی ہے چنانچہ اگر ہم سول سوسائٹی کو فوج کے دائرے میں داخل نہیں کر سکتے تو ہمیں فوج کو سول سوسائٹی کے دائرے میں ضرور لے آنا چاہیے اور یہ کام ہم جتنی جلدی کر لیں گے ہمارے لئے اتنا ہی اچھا ہوگا' ملک اتنا ہی ترقی کرے گا' اس کے استحکام میں اتنا ہی اضافہ ہوگا' قوموں کو بنانے اور سنوارنے کیلئے ملک کے تمام طبقوں کو قربانی دینا پڑتی ہے لہٰذا میری سیاستدانوں سے درخواست ہے یہ لوگ بھی اپنے اقتدار کی تھوڑی سی قربانی دیں اور فوج بھی چند پلاٹوں کی قربانی دے کر آگے بڑھے' تعلیم کا شعبہ اپنے ہاتھ میں لے اور ملک کی نظریاتی اور ذہنی سرحدوں کو اتنا ٹھوس اور ناقابل شکست بنا دے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس میں دراڑ نہ ڈال سکے' میری چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی سے درخواست ہے وہ اس تجویز پر ضرور غور کریں کیونکہ ان کا تعلق پاکستان کی لوئر مڈل کلاس سے تھا اور وہ جانتے ہیں اگر انہیں بچپن میں ملٹری سکول میں داخلہ نہ ملتا تو آج یہ اس عہدے تک نہ پہنچتے' یہ جانتے ہیں اس ملک میں ان جیسے کروڑوں باصلاحیت اور ذہین بچے موجود ہیں اور اگر ان بچوں کو بھی موقع مل جائے تو یہ سب بھی جنرل اشفاق پرویز کیانی بن سکتے ہیں' دنیا میں موقع ہر بچے کا پیدائشی حق ہوتا ہے اور جو لوگ اور جو معاشرے اپنے بچوں کو یہ حق نہیں دیتے وہ اللہ کی نظر میں بے انصاف سمجھے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کبھی بے انصاف معاشروں کو خوشحالی اور ترقی سے نہیں نوازتا چنانچہ چیف آف آرمی سٹاف آگے بڑھیں اور وہ کردار ادا کریں جو اس ملک میں فوج کے امیج میں اضافہ کر دے' جو فوج کو حقیقی معنوں میں عوام کا محسن بنا دے۔

یہ تین چار برس پرانی بات ہے' میری گلی میں ایک بڑی سی گاڑی آئی اور آکر میرے گیٹ کے سامنے رک گئی' پہلے باوردی شوفر اترا' وہ بھاگ کر پچھلے دروازے کی طرف بڑھا اور سرعت سے ہینڈل کھینچ دیا' اندر سے سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک خوبصورت جوان اترا' اس کے ہاتھوں میں گلدستہ تھا' اس نے عینک کے گہرے سیاہ شیشوں کے پیچھے سے ماحول کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر میری دہلیز پر قدم رکھ دیا' اگلے دو منٹ میں وہ میرے سامنے بیٹھا تھا' وہ ایک خوش حال' وجیہہ اور مہذب انسان دکھائی دیتا تھا لیکن میں اس سے مل کر کوئی خاص مسرت محسوس نہیں کر رہا تھا' میں دراصل پچھلے چند دنوں سے شدید ڈپریشن کا شکار تھا اور ڈپریشن کی وجہ سے چڑچڑا سنگی اور بے زار ہو چکا تھا اور میں سارا سارا دن بغیر منہ دھوئے رات کے کپڑوں میں گزار دیتا تھا' مجھے میل ملاقات سے چڑ سی ہو گئی تھی' میں نے سوچا ''یہ کتنے غلط وقت پر میرے پاس آ گیا''۔

اس نے دھوپ کا چشمہ اتارا اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ میری طرف پھینک کر بولا ''آپ نے مجھے پہچانا'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا' چہرہ تو شناسا سا تھا لیکن وقت کی دھند میں ملفوف تھا' اس نے میری کشمکش بھانپ لی ''آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں' دس سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے'' میں خاموشی سے دیکھتا رہا'' آپ میرے محسن ہیں' میری خواہش تھی' میں جب کامیاب بزنس مین بن جاؤں' میرے پاس کروڑوں روپے ہوں اور لوگ میرے اوپر رشک کریں تو میں ایک بار آپ کے قدموں میں ضرور حاضری دوں'' میری حیرت وحشت میں تبدیل ہو گئی اور میں سکتے کے عالم میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا' وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گیا ''سر میں ایک ناکام شخص تھا' غریب تھا اور جذباتی تھا' میں نے سوچا اس زندگی سے تو موت اچھی ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں مر جاتا مجھے ایک دوست آپ کے پاس چھوڑ گیا' آپ نے بڑے غور سے میری بات سنی اور اس کے بعد مجھے خودکشی کا ایک انوکھا طریقہ بتایا' آپ نے کہا تھا اس معاشرے میں زندہ رہنے سے بڑی کوئی خودکشی نہیں' تم اگر اپنے آپ سے انتقام لینا چاہتے ہو تو اپنے اردگرد موجود لوگوں جیسے ہو جاؤ' آپ نے کہا تھا کامیابی اور ناکامی' اچھائی اور برائی فقط سٹیٹ آف مائینڈ ہوتی ہے' جیب تراشی ایک شخص کی ناکامی اور دوسرے کیلئے کامیابی ثابت ہوتی ہے' اسے ایک شخص برائی کہتا ہے اور دوسرے کے نزدیک وہ حصول رزق کا ذریعہ ہوتی ہے'' وہ سانس لینے کیلئے رکا' وہ مجھے اب ہلکا ہلکا یاد آنے لگا تھا' دس سال پہلے وہ ایک کمزور سا زرد لڑکا تھا لیکن اب وہ سڈول جسم کا خوبصورت جوان بن چکا تھا' وہ گویا ہوا'' آپ نے کہا تھا' اصل قصوروار ضمیر ہوتا ہے' یہ سارا فساد ضمیر نے پھیلا رکھا ہے' اگر تم جیسے لوگ خود کو مارنے کی بجائے اپنے ضمیر کو قتل کر دیں تو ایک ہی رات میں خوش حال ہو جائیں' تم وہ کرو جو رومن روم میں کرتے ہیں' جیسا دیس ویسا بھیس' اس ملک میں ضمیر کی ضرورت ہی نہیں' اس سوسائٹی میں ضمیر اپنڈیکس کی طرح ہے' اگر ہے تو کوئی فائدہ نہیں' موجود نہیں تو کوئی نقصان نہیں' آپ نے کہا تھا' اپنے اردگرد دیکھو' کتنے سیاستدان ہیں' کتنے مذہبی رہنما' بزنس مین' دانشور' ادیب اور صحافی ہیں' یہ سب پارلیمنٹ اور ٹیلی ویژن پر کتنا جھوٹ بولتے ہیں' یہ لوگ جب بولتے ہیں تو یہ جانتے ہیں یہ غلط کہہ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود تم ان کا اعتماد دیکھو' تم ان کے لہجے کی کھنک' ان کی آنکھوں کی چمک اور ان کے چہرے کی دمک ملاحظہ کرو' تمہیں ان کے چہرے پر کسی جگہ کشمکش' پریشانی اور شرمندگی دکھائی نہیں دے گی' کیوں! کیونکہ ان لوگوں کے اندر ضمیر ہی نہیں' آپ نے کہا تھا یہ ضمیر ہوتا ہے جو انسان کو شرمندگی' پریشانی اور کشمکش سے دوچار کرتا ہے' جو آپ کے اعتماد میں دراڑ ڈالتا ہے اور اگر ضمیر نہیں تو سکھ ہی سکھ' سکون ہی سکون اور اطمینان ہی اطمینان ہے چنانچہ تم اپنا ضمیر نکال کر کہیں دور پھینک دو' تم چند دنوں میں اس ملک کے کامیاب لوگوں میں شمار ہونے لگو گے''۔

وہ رکا' اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور لمبا سانس لے کر بولا ''سر میں نے آپ کی بات مان لی تھی' میں نے پہلے اپنے ضمیر کا گلا دبایا اور پھر میں نے اسے مٹی میں دفن کر دیا' یقین کیجئے آپ کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی' میں واقعی کامیاب ہو گیا' مجھے لگا' میں آپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے قطب شمالی پر برف کی دکان کھول کر بیٹھا تھا یا چولستان کے باسیوں کو ریت بیچ رہا تھا لیکن میں نے جب آپ کے مشورے سے صحیح بازار میں درست سودا بیچنا شروع کیا تو میں نے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی' میں آپ کا مشکور ہوں سر'' میں نے اس سے پوچھا ''تم نے کیا کیا تھا'' وہ مسکرایا اور اعتماد سے بولا ''سر میں نے اپنے تمام اصول دفن کر دیئے اور جھوٹ' فریب' دغا اور فراڈ کو زندگی کا سب سے بڑا اصول بنا لیا' میں وعدے صرف توڑنے کیلئے کرتا ہوں' میری نظر میں تمام معاہدے' تمام حلف اور تمام سمجھوتے صرف کاغذ کا ایک حقیر ٹکڑا ہیں' میں نے تمام اچھی باتوں کو صرف حلق تک محدود کر لیا

ہے اور میں کبھی ان اچھی باتوں کو اپنے دل تک نہیں جانے دیتا' میں صرف منافع دیکھتا ہوں' طاقت اور اقتدار دیکھتا ہوں اور اس کیلئے مجھے کسی کی کھوپڑی پر بھی کھڑا ہونا پڑے تو میں دریغ نہیں کرتا" وہ خاموش ہو گیا' میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا' وہاں واقعی کوئی ملال' کوئی شرمندگی اور کوئی کشمکش نہیں تھی' اس نے آگے پیچھے دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولا "سر آپ مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہیں" "اینی پرابلم سر" میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور تھکی مرجھائی آواز میں کہا "ہاں یار میں پریشان ہوں' میں بھی اپنے ضمیر کے ہاتھوں تنگ آچکا ہوں" اس نے قہقہہ لگایا اور چمک کر بولا "آپ بھی میری طرح کریں اور مطمئن ہو جائیں" میں نے بھی قہقہہ لگایا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا "بڑی کوشش کرتا ہوں لیکن اللہ نے میرے اندر عجیب نسل کا ضمیر لگا دیا ہے' میں اسے جہاں چھوڑ کر آتا ہوں' یہ پالتو بلی کی طرح میرے پہنچنے سے پہلے دہلیز پر کھڑا ہوتا ہے" وہ مسکرایا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا" سر پھر آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے مقدر میں ناکامی لکھوا کر آئے ہیں' جو کبھی کامیاب نہیں کہلوا سکتے"۔

وہ اٹھا' اس نے مجھے سلام کیا او چپ چاپ باہر نکل گیا لیکن مجھے سوچ کے نہ ختم ہونے والے سمندر میں دھکیل گیا' مجھے محسوس ہوا واقعی اب اس معاشرے میں ضمیر کامیابی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ہمیں اس ملک میں ہر وہ شخص کامیاب نظر آئے گا جو ضمیر جیسی علت سے پاک ہے اور ہر زندہ ضمیر شخص' ہر سچا اور کھرا شخص زندگی کی بھیک مانگتا ملے گا' آپ ڈاکٹر عبدالقدیر کو دیکھ لیجئے' پاکستان کی 8 حکومتوں اور سولہ کروڑ عوام نے انہیں محسن پاکستان کا خطاب دیا لیکن آج وہ محسن پاکستان کہاں ہے؟' افتخار محمد چودھری اور ان کے 60 ساتھی ججوں نے اپنے ضمیر کے فیصلے پر لبیک کہا تھا لیکن وہ ساٹھ جج آج کہاں ہیں' وکلاء نے 9 مارچ 2007ء کے بعد اپنے ضمیر کو پرچم بنا لیا تھا' یہ لوگ 14 ماہ سے تحریک چلا رہے ہیں' ان کے ضمیر اور ان کی تحریک کا کیا نتیجہ نکلا؟ میاں نواز شریف اور ان کی پارٹی نے اصولی موقف اختیار کیا' ان کے اصولی موقف کا کیا رزلٹ نکلا' نواب اکبر بگٹی نے بھی ضمیر کی آواز پر لبیک کہا تھا' وہ آواز آج کہاں ہے جبکہ اس کے برعکس اس ملک میں ہر وہ شخص' ہر وہ ادارہ اور ہر وہ پارٹی جس نے ظلم' ناانصافی اور بے ضمیری کا ساتھ دیا تو اس کی کرپشن معاف ہو گئی' اس کے اقتدار کو دوام ملا' اسے عہدے اور اعزازات سے نوازا گیا اور وہ اگلی سات نسلوں تک اس ملک کی مقتدر' باعزت اور رئیس شخصیت بن گئی' تقابل کریں' صدر مشرف نے اس ملک کے ساتھ کیا کیا تھا اور افتخار محمد چودھری کا کیا مقام تھا؟ لیکن افتخار محمد چودھری اس ملک کی مقبول ترین شخصیت ہونے کے باوجود معطل ہیں اور صدر مشرف نامقبولیت کی انتہا کو چھو کر بھی اس ملک کے مضبوط ترین عہدیدار ہیں' ضمیر واقعی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں نے سوچا اگر میں نے بھی آج سے دس برس قبل ضمیر کی قربانی دے دی ہوتی تو میں بھی آج کابینہ کا حصہ ہوتا' میں مشیر بن جاتا ورنہ سفیر یا اٹارنی جنرل ضرور ہو جاتا۔ افسوس میں نے یہ موقع ضائع کر دیا چنانچہ آج میرا شمار اس ملک کے مایوس اور ناکام لوگوں میں ہو رہا ہے' کاش میں نے وقت پر اپنے ضمیر کی قربانی دے دی ہوتی' کامیابی اور ناکامی میں بس ایک ضمیر ہی کا تو فاصلہ تھا اور میں یہ فاصلہ بھی نہیں مٹا سکا' افسوس!

رمیش کا تعلق ممبئی شہر سے تھا' وہ ایک فارماسوٹیکل کمپنی میں ڈپٹی چیئرمین تھا' وہ دوپہر کو دفتر سے نکلا' وہ اپنی گاڑی خود چلا رہا تھا' وہ ذرا جلدی میں تھا چنانچہ وہ سڑک کی تیسری لین میں گاڑی چلا رہا تھا گاڑی چلاتے ہوئے اسے اچانک یاد آیا وہ پرس دفتر بھول آیا ہے اور اس کی جیب میں پیسے نہیں ہیں' اس نے گاڑی چلاتے چلاتے جیبوں کی تلاشی شروع کر دی۔ اب صورتحال کچھ یوں تھی اس کا ایک ہاتھ سٹیئرنگ پر تھا' دوسرا کوٹ کی جیب میں اور پاؤں ایک سیلیٹر پر' اس دوران پیچھے سے ایک گاڑی آئی' اس کی گاڑی کے قریب پہنچی' ڈرائیور نے راستہ لینے کی کوشش کی لیکن رمیش کی توجہ اپنی جیب پر تھی' پچھلے ڈرائیور کو بھی جلدی تھی چنانچہ اس نے رمیش کے قریب پہنچ کر زور سے ہارن بجادیا' رمیش کیلئے یہ ہارن کسی دھماکے سے کم نہیں تھا' وہ گڑبڑا گیا اور اس کا دوسرا ہاتھ بھی سٹیئرنگ سے اٹھ گیا گاڑی دائیں مڑی اور دوسری طرف سے آنے والی ٹریفک میں گھس گئی' ڈرائیوروں نے بریکس لگائیں لیکن ہنگامی بریکس عموماً کام نہیں کیا کرتیں چنانچہ دس سیکنڈ میں 22 گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں' ان گاڑیوں میں بچوں کی ایک سکول وین بھی شامل تھی' وین میں اس وقت 9 بچے سوار تھے' یہ وین سلپ ہوئی' ٹرک سے ٹکرائی اور سڑک پر الٹ گئی' اس حادثے میں پانچ بچے موقع پر ہلاک اور 4 شدید زخمی ہو گئے جبکہ باقی 21 گاڑیاں بری طرح تباہ ہو گئیں' رمیش بھی اس حادثے میں مارا گیا۔ پولیس نے سارا دن لگا کر تحقیقات کیں تو انہیں حادثے کی اصل وجہ معلوم ہوئی اور اس وقت ممبئی پولیس کو محسوس ہوا ہارن کس قدر سنگین اور خوفناک چیز ہے لہٰذا ممبئی کی حکومت نے شہر میں ہارن بجانے پر پابندی لگا دی۔

یہ پابندی شروع میں صرف ''مہم'' تک محدود تھی' حکومت نے ٹیلی ویژن چینلز' ریڈیو اور اخبارات پر ''پبلک سروس میسجز'' چلوائے اور ان پیغامات کے ذریعے ڈرائیوروں کو ہارن فری ماحول کی افادیت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ڈرائیوروں نے اس مہم کو سنجیدہ نہ لیا چنانچہ حکومت نے اپریل کے پہلے ہفتے کے آخر میں جرمانوں اور لائسنس کی ضبطی شروع کر دی۔ سات اپریل وہ دن تھا جب ممبئی کی ٹریفک پولیس نے ہارن کے خلاف عملی اقدام شروع کیا' اس دن ممبئی پولیس نے سات ہزار تین سو ڈرائیوروں کو جرمانے کئے اور بیشتر ڈرائیوروں کے لائسنس ضبط کر لئے' جرمانوں کی کم سے کم حد 5 سو اور زیادہ سے زیادہ 5 ہزار تھی۔ عوام نے پولیس کے اس اقدام کو بے تحاشہ سراہا۔ ممبئی ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کا شہر ہے اور اس شہر میں پندرہ لاکھ گاڑیاں ہیں' صبح آٹھ سے نو بجے اور شام چار سے چھ بجے کے دوران گیارہ لاکھ گاڑیاں سڑکوں پر ہوتی ہیں اور ممبئی کے ڈرائیور ایک گھنٹے میں اوسطاً 14 مرتبہ ہارن بجاتے ہیں یوں ممبئی شہر میں ایک گھنٹے میں ہارن کی ڈیڑھ کروڑ آوازیں آتی ہیں اور ان آوازوں کے نتیجے میں نہ صرف حادثے ہوتے ہیں بلکہ شہریوں کی قوت سماعت اور قوت برداشت پر بھی خوفناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نفسیاتی ماہرین کا خیال ہے سڑکوں کے کناروں پر آباد لوگ دور رہنے والے لوگوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ چڑچڑے اور غصیلے ہوتے ہیں اور جن سڑکوں پر کثرت سے ہارن بجائے جاتے ہیں ان کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کی قوت برداشت صفر ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام شہر جن میں ہارن بجائے جاتے ہیں ان شہروں میں لڑائی جھگڑے اور دنگے فساد کے زیادہ واقعات ہوتے ہیں اور ممبئی کا شمار بھی دنیا کے ان شہروں میں ہوتا ہے چنانچہ ممبئی کی حکومت نے شہر کو ''ہارن فری سٹی'' بنانے کا عزم کر رکھا ہے۔

ہم اگر ممبئی سٹی گورنمنٹ کے اس اقدام اور اس خبر کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ ایک معمولی خبر اور چھوٹا سا ایشو محسوس ہو گی لیکن اگر ہم اس خبر کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو ہمیں یہ کسی بڑے سماجی انقلاب سے کم نہیں لگے گی' ہم اگر ''فرسٹ ورلڈ'' یعنی ترقی یافتہ اقوام' ممالک یا شہروں کا جائزہ لیں تو ہمیں ان میں تین خوبیاں مشترک ملیں گی' ان کی پہلی خوبی صفائی ہوتی ہے' یہ دنیا کا دس ہزار سال کا تجربہ ہے جس جگہ گندگی ہوتی ہے وہاں ترقی اور خوشحالی نہیں آتی اور یہ خوبی صرف ملکوں اور شہروں تک محدود نہیں بلکہ یہ انفرادی اور شخصی سطح پر بھی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا میں صرف وہ لوگ ترقی اور خوشحالی تک پہنچتے ہیں جو جسم' لباس' گھر اور ماحول کو صاف ستھرا رکھتے ہیں' آپ دنیا میں گندے اور بدبودار لوگوں کو ہمیشہ غیر ترقی یافتہ اور بدحال پائیں گے' آپ کبھی کچی آبادیوں میں جا کر دیکھیں وہ لوگ جو گندے ماحول میں رہ کر بھی جسمانی صفائی کا خیال رکھتے ہیں آپ کو وہ کچی آبادی کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال ملیں گے اور اگر آج کوئی خوشحال اور ترقی یافتہ گھرانہ گندہ رہنا شروع کر دے تو آپ بہت جلد اس گھرانے کو معاشی بدحالی کا شکار دیکھیں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسلام نے

صفائی کو نصف ایمان قرار دیا تھا' آپ اسلامی تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے عرب جب تک گندے اور بدبودار رہتے رہے تھے اس وقت تک وہاں خوشحالی اور ترقی نہیں آئی تھی لیکن جب نبی اکرمؐ نے انہیں صفائی کی تربیت دی تو جہان کی دولت ان پر عاشق ہو گئی۔ ترقی کا دوسرا اصول ٹریفک ہے' آپ کو دنیا کا ہر وہ ملک' معاشرہ اور شہر ترقی یافتہ اور خوشحال ملے گا جس میں ٹریفک کے قوانین کو عبادت کی حیثیت حاصل ہے' جس میں گاڑیاں اوور سپیڈ نہیں ہوتیں' جس میں ہارن نہیں بجایا جاتا اور جس میں لائسنس کے بغیر گاڑیاں نہیں چلائی جاتیں۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو گی حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں رات کے وقت گھوڑوں' خچروں اور اونٹوں کی شہر میں آمد پر پابندی تھی' آپؓ کا خیال تھا اس سے شہریوں کی نیند میں خلل آتا ہے چنانچہ نماز فجر کے بعد شہر میں جانور داخل ہو سکتے تھے۔ قرطبہ شہر میں سواری کے جانوروں کے منہ پر جالی دار غلاف چڑھائے جاتے تھے اور سموں پر موٹے چمڑے کے ٹکڑے باندھے جاتے تھے تاکہ جانوروں کے ہنہنانے اور ٹاپوں کی آوازوں سے لوگوں کی قوت سماعت متاثر نہ ہو اور آج بھی دنیا کے جس جس شہر میں ہارن بجتے ہیں اور لوگ ٹریفک قانون کی پابندی نہیں کرتے وہ شہر معاشی بدحالی اور صحت کے شدید بحران کا شکار ہیں اور ترقی کا تیسرا اصول امن وامان ہے' دنیا کی دس ہزار سالہ تاریخ میں آج تک وہ شہر' ملک اور قوم ترقی نہیں کر سکی جس میں سیکورٹی نہیں' جس میں چوریاں' ڈکیتیاں اور فراڈ ہیں اور جس میں لوگوں کی عزت اور مال محفوظ نہیں۔ ترقی ایک ایسا پرندہ ہے جو کبھی لرزتی کانپتی اور ہلتی ہوئی شاخ پر نہیں بیٹھتا' آج بھی جب مؤرخین اسلامی ادوار کا ذکر کرتے ہیں تو وہ لاء اینڈ آرڈر کا حوالہ دیتے ہیں اور تمام تر تعصب کے باوجود یہ تسلیم کرتے ہیں حضرت عمرؓ کے دور میں ایک جوان خاتون سر سے پاؤں تک سونا پہن کر ملک کے ایک سرے سے دوسرے کونے تک چلی جاتی تھی اور کسی میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی' یہ ہے ترقی کا تیسرا اصول۔

دنیا میں ترقی کے یہ تین بنیادی اصول ہیں اور ان تینوں اصولوں پر عمل کیلئے کسی قرارداد' کسی آئینی پیکیج اور کسی آزاد اور خود مختار عدلیہ کی ضرورت نہیں' اس کیلئے حکمرانوں کے صرف دس منٹ چاہئیں' اگر حکومت اور حکمران صرف دس منٹ دے دیں تو شہر بھی صاف ہو سکتے ہیں' ٹریفک کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور شہروں کے اندر لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے لیکن افسوس اللہ تعالیٰ نے ہمارے حکمرانوں کو اقتدار تو دے دیا لیکن انہیں وژن اور اخلاص نہیں دیا چنانچہ یہ لوگ جج بھی بحال نہیں کر پا رہے اور لوگوں کو ہارن بجانے سے بھی منع نہیں کر پا رہے' کاش اس ملک کے لوگ اتنے طاقتور ہوتے کہ یہ حکمرانوں سے اتنا پوچھ سکتے جناب آپ جج بحال نہیں کر سکتے' ٹھیک! یہ ایک مشکل اور ناحل معاملہ ہے لیکن کیا آپ صفائی' ٹریفک قوانین پر پابندی اور لاء اینڈ آرڈر بھی بہتر نہیں بنا سکتے؟ اگر نہیں تو پھر ملک کو آپ کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں ایسی حکومت چاہیے جو کم از کم ہارن بجانے پر پابندی تو لگا سکے' جو گھروں کے سامنے سے کچرے کی ٹوکریاں تو اٹھوا سکے اور جو اسلام آباد جیسے شہر سے چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں تو ختم کرا سکے مگر بدقسمتی سے قوم ایسے حکمرانوں کے شکنجے میں آ پھنسی ہے جو آئینی پیکیج کے بغیر ناک سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتے۔

قدیم یونان کے لوگ رات کو اپنی پگڑیاں' دستاریں اور ٹوپیاں دروازے پر لٹکا دیتے تھے' ان کا خیال تھا عظمت کی دیوی رات کے وقت اپنے آسمانی مسکن سے نکلتی ہے' ایک ایک دستار' ایک ایک پگڑی اور ایک ایک ٹوپی کے پاس رکتی ہے اور اسے ان ٹوپیوں' ان پگڑیوں اور ان دستاروں میں سے جو پسند آجاتی ہے وہ اپنی سونے کی چھڑی اس پر رکھ دیتی ہے اور عظمت کی دیوی کی یہ چھڑی جس دستار کو چھو جاتی ہے اس دستار کا مالک زمانے میں عظیم ہو جاتا ہے' اسے عزت' شہرت اور عظمت نصیب ہو جاتی ہے' اہل یونان کا ایمان تھا یہ دیوی دنیا میں ایک بار ہر شخص کے دروازے پر جاتی ہے اور اگر اس رات اس شخص نے اپنی دستار دروازے پر لٹکا رکھی ہو تو وہ اس کی دستار کو اپنی چھڑی سے چھو دیتی ہے اور اگلی صبح جب وہ شخص اپنی دستار پہنتا ہے تو دیوی کی عظمت اس کے سر' اس کے ماتھے میں نفوذ کر جاتی ہے اور یوں وہ شخص معتبر ہو جاتا ہے' اہل یونان رات کے اس پل کو عظمت کا لمحہ کہتے تھے اور ان کا خیال تھا یہ دنیا کا قیمتی ترین لمحہ ہوتا ہے اور دنیا کے تمام خزانے مل کر بھی اس ایک لمحے کی برابری نہیں کر سکتے' اہل روم کا خیال ان سے ذرا مختلف تھا' یہ لوگ سمجھتے تھے دیوتاؤں کا دیوتا دنیا کے ہر انسان پر عظمت کا ایک لمحہ اتارتا ہے اور انسان اگر اس لمحے سے لپٹ جائے تو وہ ستارہ بن جاتا ہے' وہ انسانوں کی صف سے نکلتا ہے' آسمان پر پرواز کرتا ہے اور آسمان کے ستاروں کا حصہ بن جاتا ہے اور پھر ابد تک چمکتا رہتا ہے' اہل روم کا خیال تھا دنیا میں جو لوگ اس لمحے کو کھو دیتے ہیں وہ پتھر بن جاتے ہیں اور دنیا کے تمام پتھر وہ بد نصیب لوگ ہیں جنہوں نے عظمت کے لمحے کھو دیئے تھے اور آسمانوں کے تمام ستارے وہ خوش نصیب لوگ تھے جو عظمت کے اس لمحے سے لپٹ گئے اور ابدی ہو گئے لیکن عربوں کا خیال ان دونوں سے مختلف تھا' عرب سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ دنیا کے ہر انسان کو ایک بار خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع دیتا ہے اور انسان اس لمحے جس کا انتخاب کرتا ہے اس کا اختتام ہمیشہ اس پر ہوتا ہے' عربوں کا خیال تھا معاشرے میں جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے قدرت اسے اتنی ہی کثرت سے خیر اور اتنے ہی وسیع شر کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے اور انسان اپنی اوقات' مرتبے اور صلاحیت کے مطابق خیر اور شر کا انتخاب کرتا ہے۔

میں ایک کم عقل دنیادار شخص ہوں لہٰذا میں نہیں جانتا عربوں کا تصور درست تھا' اہل روم کا خیال صحیح تھا یا پھر اہل یونان درست سوچتے تھے لیکن مجھے اتنا معلوم ہے اللہ تعالیٰ' قدرت یا آسمانی طاقتیں اپنے بندوں پر ایسے لمحے ضرور اتارتی ہیں جب ان کا ایک فیصلہ انہیں عظیم یا بدترین بنا دیتا ہے' یہ وہ لمحہ اور یہ وہ فیصلہ ہوتا ہے جب ایک شخص حضرت امام حسینؓ بن جاتا ہے اور دوسرا یزید' جب ایک شخص ٹیپو سلطان بنتا ہے اور دوسرا میر صادق' جب ایک شخص اسامہ بن لادن بنتا ہے اور دوسرا بش' قدرت خیر اور شر کے اس انتخاب' دائیں اور بائیں کی پسند اور منفی اور مثبت کے اس چناؤ کا موقع دنیا کے ہر شخص کو دیتی ہے اور اس ایک لمحے کا فیصلہ انسان کی ذلت اور عظمت کا تعین کرتا ہے' دنیا کے تمام بڑے' عظیم اور شاندار لوگ اسی ایک لمحے سے نکلے ہیں اور دنیا کے تمام برے' بدبخت اور قابل ملامت اشخاص بھی اسی لمحے کی پیداوار ہیں' دنیا کا ہر انسان محض ایک انسان ہوتا ہے لیکن یہ اس قیمتی لمحے کا وہ فیصلہ ہوتا ہے جو ہمیں اچھا یا برا بناتا ہے' جو ہمیں پہاڑوں سے بلند' سونے سے قیمتی اور دیوتاؤں سے مضبوط بناتا ہے اور جو ہمیں طبعی زندگی کے دائرے سے نکال کر تاریخ کا حصہ بنا دیتا ہے' یہ سقراط کا وہ ''انکار'' ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی اسے پانچ ہزار سال تک زندہ رکھتا ہے اور جو اس کی زندگی کو دنیا کے آخری انسان کی آخری سانس تک پھیلا دیتا ہے' میری پچھلے دنوں معطل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے ملاقات ہوئی تھی' میں ان کے پاس اکثر حاضر ہوتا رہتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں' اس ملاقات میں انہوں نے فرمایا تھا'' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اچھے فیصلے کرنے کی ہمت دیتا ہے' وہ انہیں ڈٹ جانے کا حوصلہ دیتا ہے اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے 9 مارچ 2007ء کو ایک ایسا ہی فیصلہ کرنے کا چانس دیا' میں نے یہ چانس ضائع نہیں ہونے دیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے استقامت بخشی اور اس استقامت کے نتیجے میں آج پورے پاکستان کے عوام میرے پیچھے کھڑے ہیں'' میں نے ان سے اتفاق کیا اور اس کے بعد عرض کیا'' آپ اگر 9 مارچ کو صدر مشرف کے سامنے انکار نہ کرتے تو آپ بھی محض ایک جج ہوتے اور آج لوگ آپ کا نام تک بھول چکے ہوتے'' چودھری صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا۔

دنیا کا سب سے مشکل سوال حقیقت یا سچائی ہوتی ہے' کون سچا ہے؟ کس کا موقف درست ہے اور کون سچائی پر ہے؟ یہ سوال آج تک انسان کو گمراہ کر رہا ہے لیکن اس کا جواب آج سے چودہ سو سال پہلے حبشہ کے بادشاہ نجاشی

نے دے دیا تھااور یہ وہ شخص تھا جس کا دل اور جس کی روح مسلمان اور بدن مشرک تھا چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو نبی رسالت ؐ نے عرب کے ریگزاروں میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی تھی اور سینکڑوں صحابہ ؓ کرام نے نبی رسالت ؐ کے ساتھ مل کر اس کیلئے دعائے مغفرت کی تھی' تاریخ بتاتی ہے مسلمان نجاشی کے پاس پناہ گزین ہوئے اور کفار مکہ نے ان لوگوں کی واپسی کیلئے نجاشی کے دربار میں سفارت بھجوائی' کفار مکہ نے نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کے خلاف ایک لمبی چوڑی تقریر کی' نجاشی نے اس تقریر کے بعد حضرت جعفر طیار ؓ کو جواب دینے کا موقع دیا' حضرت جعفر طیار ؓ کے خطاب کے بعد نجاشی نے ان سے چند سوال پوچھے' ان سوالوں میں ایک سوال تھا ''تمہارے نبی ؐ کو ماننے والے اولین لوگ کون تھے'' حضرت جعفر ؓ نے فوراً فرمایا ''یہ مکہ کے عام لوگ ہیں' ان میں غلام ہیں' مسکین ہیں اور معاشرے کے محروم لوگ ہیں'' نجاشی نے فوراً کہا ''بے شک یہ نبی سچا ہے'' میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تھا تو میں نے حیرت سے سوچا تھا نبوت کی سچائی کا عام لوگوں کے ایمان کے ساتھ کیا تعلق؟ بڑے عرصے بعد معلوم ہوا سچائی اللہ کی وہ نعمت ہے جو سب سے پہلے محروم' مسکین اور عام لوگوں تک پہنچتی ہے اور غریب اور محروم شخص کا خیال' اس کی پسند اور اس کی رائے ہمیشہ سچی ہوتی ہے' قدرت ہمیشہ محروم لوگوں کی آوازوں میں بولتی ہے اور دنیا کی ہر اچھائی محروم طبقوں سے ہو کر بالائی طبقوں تک پہنچتی ہے اور برائی ہمیشہ بالائی طبقوں سے زیریں طبقوں تک آتی ہے چنانچہ دنیا کے ہر نبی کو سب سے پہلے عام شخص نے تسلیم کیا تھا اور حضرت ابراہیم ؑ ہوں یا حضرت محمد ؐ معاشرے کے بالائی طبقے سب سے آخر میں ان پر ایمان لائے تھے' معلوم ہوا عام انسان کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی اور جو حکمران عام انسان کی بات نہیں سنتا وہ کبھی عظمت کے تخت تک نہیں پہنچ پاتا۔

آپ بدقسمتی دیکھئے عظمت کی یہ دیوی آصف علی زرداری کے دروازے پر کھڑی رہی لیکن افسوس آصف علی زرداری نے یہ لمحہ کھو دیا' زرداری صاحب 28 دسمبر تک ایک عام انسان تھے لیکن پھر قدرت نے انہیں ایک بڑا انسان' ایک عہد ساز شخصیت بننے کا موقع دیا' عظمت کی دیوی ساڑھے چار ماہ تک ان کے دروازے پر کھڑی رہی لیکن افسوس زرداری صاحب نے اس کی چھڑی اپنی دستار تک نہ پہنچنے دی اور اب یہ لمحے میاں نواز شریف کے دروازے پر کھڑے ہیں اور اگر میاں نواز شریف نے بھی یہ لمحے کھو دیئے تو یہ دونوں چند مہینوں میں ماضی کا قصہ عبرت بن جائیں گے اور عظمت کے یہ لمحے ان انسانوں کے دروازوں پر جا رکیں گے جو قدرت کی چاپ سن سکتے ہیں' جو اللہ کی مہربانی کا شکر ادا کر سکتے ہیں' آپ عجیب بات دیکھئے دنیا میں حکومتیں' وزیراعظم اور وزراء ہزاروں ہوتے ہیں لیکن قدرت ان میں سے کسی کسی کو لیڈر بننے کا موقع دیتی ہے اور اللہ نے پہلے یہ موقع آصف علی زرداری کو دیا تھا اور یہ لمحہ اب میاں نواز شریف کے دروازے پر کھڑا ہے اور جس دن میاں نواز شریف تمام مجبوریوں اور سمجھوتوں سے آزاد ہو کر آگے بڑھ گئے اس دن عظمت کا تاج میاں صاحب کے سر پر ہو گا اور اگر میاں صاحب نے بھی ''اگر' مگر' چونکہ اور چنانچہ'' میں یہ موقع کھو دیا تو تاریخ میں میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری ہمسائے ہوں گے اور ان کے چہرے وقت کی گھاس اور عبرت کی ریت میں دفن ہو جائیں گے' پاکستان کا عام شہری ججوں کی بحالی چاہتا ہے اور جس جس شخص نے عام انسان کی اس سچائی کو نہ پہچانا وہ ہماری آنکھ کے سامنے وقت کے قبرستان میں دفن ہو جائے گا اور جس نے آگے بڑھ کر عام انسانوں کی خواہشوں کا ہاتھ پکڑ لیا اس پر عظمت کے لمحے قربان ہو جائیں گے۔

افتخار عارف اردو زبان کے شاندار شاعر اور دانشور ہیں' مجھے یہ واقعہ انہوں نے سنایا تھا' وہ ان دنوں پاکستان ٹیلی ویژن کراچی میں کام کرتے تھے۔ ایک دن ملک کے بڑے بیوروکریٹ عظیم ادیب اور ''آواز دوست'' جیسی کتاب کے خالق مختار مسعود کراچی کے دورے پر آئے اور افتخار عارف انہیں لنچ پر لے گئے۔ افتخار عارف ان دنوں اندیشہ روزگار کا شکار تھے' مختار مسعود صاحب بیٹھتے ہی افتخار عارف کا مسئلہ بھانپ گئے لہٰذا انہوں نے کسی تمہید کے بغیر افتخار عارف کا ہاتھ سہلایا اور فرمایا ''افتخار جو شخص پانچ وقت نماز نہیں پڑھتا' اس کے بے شمار خدا ہوتے ہیں' اگر تم غربت' موت اور ذلت کے خوف سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو دن میں چپ چاپ پانچ بار اللہ کے حضور کھڑے ہو جایا کرو' تم دنیا کے تمام فرعونوں' نمرودوں اور قارونوں کے دباؤ سے رہائی پا جاؤ گے'' افتخار عارف نے بے چینی سے پہلو بدل کر عرض کیا ''لیکن سر دنیا میں سمجھوتے کی سولی سے زیادہ اذیت ناک سزا کوئی نہیں ہوتی' مجھے سمجھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے'' مختار مسعود صاحب کے چہرے پر اوس میں بھیگے گلابوں جیسی نرمی آ گئی' انہوں نے بیرے سے بڑے سائز کا کاغذ منگوایا' جیب سے قلم نکالا اور کاغذ پر دو دائرے بنا کر بولے ''دیکھو افتخار یہ دو دائرے ہیں' ایک بڑا دائرہ' دوسرا چھوٹا دائرہ'' افتخار عارف کاغذ پر جھک گئے' مختار مسعود صاحب نے اپنی نرم اور ملائم آواز میں کہا ''افتخار یہ بڑا دائرہ زندگی کا دائرہ ہے' ہم سب اس دائرے کے قیدی ہیں' اس دائرے میں رہنے والے ہر شخص کو سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں جو نہ کرے وہ اس دائرے سے خارج ہو جاتا ہے' یہ سمجھوتے اس دائرے کے ہر شخص کا مقدر ہیں' اس سے تم بھاگ سکتے ہو اور نہ میں فرار ہو سکتا ہوں' اس میں ہماری کسی مرضی' کسی رائے اور کسی پسند ناپسند کا کوئی دخل نہیں'' مختار مسعود صاحب خاموش ہوئے' قلم اٹھایا اور چھوٹے دائرے کی گولائی پر پھیر کر بولے ''لیکن افتخار یہ چھوٹا دائرہ ہم خود تخلیق کرتے ہیں' یہ ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے اور ہم اس دائرے میں اپنی مرضی' اپنی رائے اور اپنی پسند ناپسند ڈیپازٹ کراتے ہیں اور ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں ہم نے کسی سمجھوتے' کسی مجبوری اور کسی دباؤ کو اس دائرے میں داخل نہیں ہونے دینا'' مختار مسعود صاحب نے قلم اٹھایا' اس پر کیپ چڑھائی اور اسے جیب میں اڑس کر بولے ''افتخار انسان جوں جوں دنیا کی دلدل میں دھنستا جاتا ہے اس کا چھوٹا دائرہ معدوم ہوتا چلا جاتا ہے لیکن وہ جوں جوں دنیا کی دلدل سے باہر نکلتا جاتا ہے اس کا یہ دائرہ وسیع ہو جاتا ہے''۔

افتخار عارف نے بے چین ہو کر پوچھا ''سر لیکن ہم جیسے لوگ جو دنیا کے اسیر ہیں اور نہ اس سے آزاد ہیں وہ کیا کریں'' مختار مسعود صاحب نے فوراً جواب دیا ''وہ بڑے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے چھوٹے دائرے کی حفاظت کریں' زندگی میں ہر قسم کا سمجھوتہ کریں لیکن کسی سمجھوتے کو چھوٹے دائرے تک نہ پہنچنے دیں' وہ اپنے چھوٹے دائرے کے شیل پر زد نہ پڑنے دیں' وہ اسے ٹوٹنے نہ دیں''۔ مختار مسعود نے فرمایا ''انسان کو بڑے دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ ضرور قائم رکھنا چاہیے اور وہ یہ فیصلہ کر لے خواہ کچھ ہو جائے وہ دنیاداری' مجبوری اور دباؤ کا کوئی جراثیم' کوئی وائرس اس چھوٹے دائرے میں داخل نہیں ہونے دے گا''۔

مجھے یہ واقعہ افتخار عارف نے 12 برس قبل سنایا تھا لیکن آج مجھے اچانک یہ واقعہ یاد آ گیا اور مجھے محسوس ہوا' یہ ملاقات' ملاقات میں پوچھا جانے والا سوال اور مختار مسعود کا استدلال تینوں لازوال ہیں' بس اس میں تین خرابیاں ہیں' پہلی یہ کہ یہ ملاقات 70ء کی دہائی میں ہوئی' میرا خیال ہے یہ ملاقات 11 مئی 2008ء کو ہونی چاہیے تھی' دوسری یہ کہ یہ ملاقات افتخار عارف اور مختار مسعود کی بجائے آصف علی زرداری اور مختار مسعود کے مابین ہونی چاہیے تھی اور سوم یہ کہ مختار مسعود صاحب کو دو دائرے کھینچ کر یہ فرمانا چاہیے تھا ''زرداری صاحب تمام قومیں دو دائروں میں بٹی ہیں' ایک بڑا دائرہ' دوسرا چھوٹا دائرہ' بڑا دائرہ عالمی برادری کا دائرہ ہے جس میں سمجھوتے ہی سمجھوتے ہیں' جس میں اقوام متحدہ' ورلڈ بینک' آئی ایم ایف' کنسورشیم اور جی ایٹ ہیں' جس میں تیل کے اژدہے' درآمدات کے سپولئے اور برآمدات کے مار آستین ہیں' جس میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی دلدلیں' ڈیٹ سروسنگ کے صحرا اور ڈی فیسٹ کے تاحد نظر جنگل ہیں' جس میں جارج بش ہے' جس میں امریکہ ہے اور جس میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سمجھوتہ ہے لہٰذا اس دائرے میں بسنے والی ہر قوم کو ہر قدم پر کوئی سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یا کسی پرانے سمجھوتے پر سر تسلیم خم رکھنے کی یقین دہانی کرانی پڑتی ہے لیکن دنیا کی تمام قومیں ملک کے اندر بھی ایک چھوٹا دائرہ کھینچتی ہیں اور یہ چھوٹا دائرہ قوموں کی انا' سالمیت' وقار اور عزت نفس کا بینک ہوتا ہے اور قومیں اس بینک میں اپنی دوستیاں' اپنی دشمنیاں' اپنی محبتیں اور اپنی نفرتیں ڈیپازٹ کراتی ہیں' قومیں اس دائرے میں

اپنے نظریئے‘ اپنے وجود کے دلائل اور اپنا آزاد مستقبل جمع کراتی ہیں اور زرداری صاحب زندہ قومیں بڑے دائرے میں رہتے ہوئے ہمیشہ اپنے چھوٹے دائرے کی حفاظت کرتی ہیں‘ قومیں بلاشبہ زندہ رہنے‘ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کیلئے قدم قدم پر سمجھوتہ کرتی ہیں یا کسی پرانے سمجھوتے پر سر تسلیم خم رکھنے کی یقین دہانی کراتی ہیں لیکن وہ کسی سمجھوتے کی آنچ اپنے چھوٹے دائرے تک نہیں پہنچنے دیتیں‘ وہ چھوٹے دائرے کے شیل پر زد نہیں پڑنے دیتیں‘ وہ اسے ٹوٹنے نہیں دیتیں کیونکہ وہ جانتی ہیں جو قومیں اپنی انا‘ اپنا نظریہ‘ اپنا موقف اور اپنی نفرت ہار جائیں ان کی زمینوں میں پھر ہمیشہ سمجھوتے اگتے اور مفاہمتیں کاشت ہوتی ہیں“۔

مختار مسعود کو چاہیے تھا وہ آصف علی زرداری کے سامنے بیٹھتے اور انہیں کہتے ”زرداری صاحب دنیا کا ہر سیاست دان سمجھوتہ کرتا ہے‘ سیاست نام ہی سمجھوتے اور مفاہمت کا ہے‘ سیاست کھیل ہی ”کچھ دو اور کچھ لو“ کا ہے اور دنیا کے ہر سیاست دان کو اپنے موقف سے پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے‘ دنیا کا ہر سیاستدان‘ ہر لیڈر اپنے کہے ہوئے اور اپنے فرمائے ہوئے سے چند انچ پیچھے یا دائیں بائیں ہوتا ہے کیونکہ سیاست میں بے لچک لوگ اور بے لچک موقف اپنی موت آپ مر جاتے ہیں لیکن زرداری صاحب یہ بھی حقیقت ہے سیاست کے اس بڑے دائرے کے اندر رہ کر بھی دنیا کا ہر سیاستدان ایک چھوٹا دائرہ بناتا ہے اور یہ وہ دائرہ ہوتا ہے جس میں اس سیاستدان کا ضمیر‘ وژن اور ایمان بند ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنی سیاست کے کسی سمجھوتے‘ کسی مفاہمت اور کسی مصالحت کو اس چھوٹے دائرے تک نہیں پہنچنے دیتا“ مختار مسعود کو کہنا چاہیے تھا ”آصف علی زرداری صاحب دنیا کے ہر سیاستدان کے اندر ایک چھوٹا دائرہ ہوتا ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے دنیا خواہ ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن میں اس دائرے کو مزید چھوٹا نہیں ہونے دوں گا چنانچہ وہ سیاستدان زندگی کی آخری سانس تک اس کی حفاظت کرتا ہے“ کاش مختار مسعود آج آصف علی زرداری کے سامنے بیٹھ کر دائرے بناتے اور ان سے کہتے ”زرداری صاحب دنیا کے تمام معاشروں کے اندر بھی ایک چھوٹا دائرہ ہوتا ہے اور اس دائرے میں اس معاشرے کی امنگیں‘ خواہشیں‘ تمنائیں اور امیدیں ہوتی ہیں اور معاشرے اپنے چھوٹے دائرے کی ان امیدوں‘ تمناؤں‘ خواہشوں اور امنگوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں‘ معاشروں کے دل سے ایک رگ نکلتی ہے اور یہ رگ سیدھی اس چھوٹے دائرے میں جاتی ہے اور اس دائرے میں پلنے والی امنگوں اور امیدوں کو تازہ لہو دیتی ہے اور جب تک معاشرے زندہ رہتے ہیں اس وقت تک ان امیدوں اور امنگوں کو تازہ لہو ملتا رہتا ہے چنانچہ زرداری صاحب اگر آپ اس ملک‘ اس معاشرے کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ چھوٹے دائرے کی یہ رگ نہ کاٹیں‘ آپ امیدوں‘ امنگوں اور خواہشوں تک خون کی سپلائی نہ روکیں“ کاش مختار مسعود آج آصف علی زرداری سے ملتے اور انہیں کہتے ”اس ملک کے 16 کروڑ لوگ ججوں کی بحالی چاہتے ہیں اور زرداری صاحب آپ عوام کی خواہش نہ توڑیں کیونکہ اگر یہ خواہش ٹوٹ گئی تو عوام سیاستدانوں سے مایوس ہو جائیں گے اور اس کے بعد سیاستدانوں کے ہر وعدے‘ ہر اعلان اور ان کے منشور کی ہر شق کو سیاسی بیان سمجھیں گے اور لوگوں کا سیاست اور سیاستدانوں سے یقین اٹھ جائے گا“۔ یہ میری آج کی سب سے بڑی خواہش ہے۔

یہ خواہش اپنی جگہ لیکن میری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ آصف علی زرداری ایک کامیاب سیاستدان ہیں اور کامیاب سیاستدان مختار مسعود صاحب جیسے دانشوروں سے نہیں ملا کرتے‘ وہ الطاف بھائی جیسے ہم پلہ سیاستدانوں سے ملتے ہیں‘ وہ ایم کیو ایم‘ مسلم لیگ ن‘ اے این پی اور ایم ایم اے کے بڑے بڑے دائروں سے باہر نہیں نکلا کرتے اور یہ بھی حقیقت ہے تیسری دنیا کے کامیاب سیاستدان اپنی ذات میں کوئی چھوٹا دائرہ نہیں پلنے دیتے اور ان کے اندر اور باہر صرف اور صرف بڑے دائرے ہوتے ہیں۔

چودھری نثار کر سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں

یہ جولائی کا مہینہ تھا اور 2007ء کا سن تھا' میں لندن میں پاکستان مسلم لیگ ن کے دفتر میں کھڑا تھا' ملک کے معروف دانشور' کالم نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی میرے سامنے کھڑے تھے اور وہ ایک نہایت ہی پاکیزہ لطیفہ سنا رہے تھے' لطیفے کے دوران اچانک چودھری نثار احمد وہاں آئے' عطاء الحق قاسمی کے پاس کھڑے ہوئے اور دونوں نے گفتگو شروع کر دی' ان دنوں اے پی ڈی ایم تازہ تازہ بنی تھی اور صدر پرویز مشرف کے خلاف تحریک چلانے کے ایشو پر مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان کھچاؤ پایا جاتا تھا' قاسمی صاحب نے چودھری صاحب سے پوچھا ''پیپلز پارٹی کا اگلا قدم کیا ہو گا'' چودھری نثار احمد جذباتی ہو گئے اور انہوں نے مخدوم امین فہیم' صفدر عباسی اور جہانگیر بدر کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال سنانا شروع کر دیا' اس دوران انہوں نے میری طرف دیکھا اور اچانک بات بدل دی' قاسمی صاحب نے دوبارہ پوچھا تو انہوں نے محتاط انداز میں گفتگو شروع کر دی' وہ بات کرتے' میری طرف دیکھتے اور پھر بات کرتے' میں نے محسوس کیا چودھری صاحب میری موجودگی سے ''ایزی'' نہیں ہیں چنانچہ میں چند قدم دور ہٹ گیا' میں جوں ہی ذرا فاصلے پر گیا' چودھری صاحب نے قاسمی صاحب سے میرے بارے میں پوچھا' قاسمی صاحب نے حیرت سے انہیں میرا نام بتایا اور اس کے بعد پوچھا ''کیا آپ پہلے کبھی جاوید سے نہیں ملے'' چودھری صاحب کو کرنٹ سا لگا' وہ دوڑ کر میرے پاس آئے اور گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر بولے ''میں معذرت چاہتا ہوں' میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا'' یہ چودھری نثار احمد کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی' چودھری صاحب کے ساتھ دوسری ملاقات اگلے دن ہوئی تھی' میاں شہباز شریف مجھے ڈنر کیلئے آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک ایرانی ریستوران میں لے گئے اور چودھری نثار نے ہمیں وہاں ''جوائن'' کیا تھا اور اس کے بعد میری چودھری نثار کے ساتھ کبھی کوئی ملاقات اور بات چیت نہیں ہوئی۔

چودھری صاحب اور میرے درمیان اس ''دوری'' کی وجہ میرا شرمیلا پن یا میرا بیک بینچر سٹائل ہے' میں اپنی ذات میں شدید شرمیلے پن کا شکار ہوں' میں نے ساری زندگی بیک بینچر کی حیثیت سے گزاری ہے چنانچہ اس شرمیلے پن کے باعث میں کبھی خود کسی سیاستدان اور حکمران سے ملنے نہیں گیا' میں پندرہ برسوں میں صرف تین بار پارلیمنٹ ہاؤس گیا ہوں اور میں نے کبھی کوئی پریس کانفرنس اٹینڈ نہیں کی چنانچہ آج تک میرا تعارف صرف ان سیاستدانوں کے ساتھ ہے جو ''شرمیلے'' نہیں ہیں اور جو صحافیوں کے ساتھ تعلقات میں قدم آگے بڑھانے کے قائل ہیں' چودھری نثار کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا اور یہ بھی اس معاملے میں میری طرح ٹھیک ٹھاک ''شرمیلے'' ہیں' چودھری نثار ایک دلچسپ سیاسی شخصیت ہیں' وہ جوڑ توڑ اور مذاکرات کے ماہر ہیں' یہی وجہ ہے وہ پچھلے بیس برس سے تمام اہم کمیٹیوں اور اعلیٰ سطحی مذاکرات کا حصہ رہے ہیں' میاں نواز شریف اور صدر اسحاق خان کے درمیان اختلافات ہوں' سجاد علی شاہ اور میاں برادران کا تنازعہ ہو' نواز شریف اور جنرل آصف نواز کی کشمکش ہو' جنرل پرویز مشرف اور نواز شریف کا معاملہ ہو' لندن کا میثاق جمہوریت ہو' آصف علی زرداری اور نواز شریف کے درمیان شراکت اقتدار کا فارمولہ ہو' اعلان مری ہو' دوبئی کے مذاکرات ہوں یا پھر ججز کی بحالی کیلئے فائنل بات چیت آپ کو پاکستان کی تاریخ کے ہر اہم موقع پر چودھری نثار احمد ضرور نظر آئیں گے' چودھری نثار احمد کی دوسری خوبی ''وفاداری'' ہے' وہ پچھلے بیس بائیس برس سے اپنی جماعت اور اپنی قیادت کے ساتھ وفادار چلے آ رہے ہیں اور انہوں نے کسی نازک وقت پر میاں برادران کو تنہا نہیں چھوڑا اور ان کی تیسری خوبی ''ایمانداری'' ہے' چودھری نثار احمد پر آج تک کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ چودھری نثار میں ایک حیرت انگیز عادت بھی ہے' وہ میڈیا سے ہمیشہ فاصلے پر رہتے ہیں' وہ اپنا موبائل نمبر کسی کو نہیں دیتے اور شام کے بعد انہیں میاں برادران کے سوا کوئی شخص تلاش نہیں کر سکتا' یہ ان کی وہ خوبیاں ہیں جس سے میڈیا اور سیاست کے سرکل کے زیادہ تر لوگ واقف ہیں لیکن ان کی ایک خوبی مجھے دو دن قبل معلوم ہوئی اور اس خوبی نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے انہیں چند دن قبل ایک بلٹ پروف گاڑی دی تھی لیکن چودھری نثار احمد نے یہ گاڑی شکریہ کے ساتھ وزیراعظم کو واپس لوٹا دی' چودھری نثار احمد کا کہنا تھا ''اللہ تعالیٰ حفاظت کرنے والا ہے' مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں'' چودھری صاحب نے اس سے قبل سینئر وفاقی وزیر کی حیثیت سے ملنے والا پروٹوکول' پولیس سکواڈ اور دوسری مراعات بھی واپس کر دی تھیں' میں یہ سمجھتا ہوں چودھری نثار احمد کی یہ خوبی ان کی پچھلی تمام خوبیوں پر بھاری ہے اور وہ مجھے پہلی بار بہت اچھے لگے ہیں۔

آج کے حالات میں چودھری نثار احمد کا یہ اقدام حقیقتاً قابل تقلید ہے' آپ ملک کی سیاسی قیادت کا ایک ماہ کا ٹریک

ریکارڈ نکال کر دیکھ لیجئے' میاں نواز شریف مسلم لیگ ن کے قائد اور حکومت کے سب سے بڑے اتحادی ہیں' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے 22 اپریل کو میاں نواز شریف کو ایک بلٹ پروف مرسڈیز بھجوائی تھی' یہ گاڑی وزیراعظم کے پروٹوکول فلیٹ کا حصہ تھی اور سابق دور اقتدار میں میاں صاحب کے زیر استعمال رہی تھی' میاں صاحب نے نہ صرف یہ گاڑی قبول کر لی بلکہ وہ اسے استعمال بھی کر رہے ہیں' آصف علی زرداری پیپلز پارٹی کے قائد ہیں اور کنگ میکر کی حیثیت رکھتے ہیں' حکومت نے دو دن قبل آصف علی زرداری کو وزیراعظم اور صدر کے برابر پروٹوکول دینے کا فیصلہ کیا' میاں صاحب اور زرداری صاحب فروری سے خصوصی پروٹوکول لے رہے ہیں' ان کے ساتھ پولیس کے بھاری سکواڈ اور ہوٹرز ہوتے ہیں اور ٹریفک پولیس ان کے لئے باقاعدہ ٹریفک بھی روکتی ہے لیکن شاید اس انتظام پر حکمرانوں کی تسلی نہیں ہوئی چنانچہ سرکاری خرچ سے ان کی سیکورٹی اور پروٹوکول میں اضافہ کیا جا رہا ہے' میاں صاحب اور زرداری صاحب کے بعد وزراء کی باری آتی ہے' وزیراعظم نے اقتدار سنبھالنے کے بعد وزیر دفاع چودھری احمد مختار اور وزیر خارجہ مخدوم شاہ محمود قریشی کو بلٹ پروف لیموزین گاڑیاں عنایت کی تھیں اور یہ دونوں وزراء حلف اٹھانے کیلئے انہی گاڑیوں پر ایوان صدر آئے تھے' یہ گاڑیاں تا حال ان وزراء کے استعمال میں ہیں' جنوری میں حکومت نے چاروں صوبوں کے آئی جی اور 10 سینئر پولیس افسروں کیلئے بھی بلٹ پروف گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے نہیں معلوم اس فیصلے کا کیا بنا؟ اور آئی جی صاحبان کو بلٹ پروف گاڑیاں ملیں یا یہ منصوبہ ابھی پائپ لائن میں ہے' ان کے علاوہ پاکستان کے فوجی جرنیل' چاروں وزراء اعلیٰ' چاروں صوبوں کے سینئر وزراء اور گورنر حضرات بھی اربوں روپوں کی بلٹ پروف گاڑیاں استعمال کر رہے ہیں اور شاہی پروٹوکول سے لطف اندوز ہو رہے ہیں' یہ اس ملک کے حکمرانوں کا "لیونگ سٹینڈر" ہے جس میں روزانہ درجنوں لوگ خودکشی کر رہے ہیں' جس میں لوگوں کو کھانے کیلئے آٹا' پینے کیلئے پانی اور علاج کیلئے دواء نہیں مل رہی' جس میں غربت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے اور جس میں بجلی اور پٹرول سب سے بڑی مراعات بن چکے ہیں' ایک طرف یہ انتہا ہے اور دوسری طرف ہمارے حکمران ہیں جن کی آنکھ سیر نہیں ہو رہی' جن کی ہوس کو قرار نہیں آ رہا' سوال یہ ہے اگر چودھری نثار احمد پروٹوکول اور بلٹ پروف گاڑی کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں' اگر ان کی عزت اور تکریم میں کوئی کمی نہیں آتی تو وزیراعظم' آصف علی زرداری' میاں نواز شریف' شاہ محمود قریشی' احمد مختار اور چاروں صوبوں کے وزراء اعلیٰ پروٹوکول اور بلٹ پروف گاڑیوں کے بغیر زندہ کیوں نہیں رہ سکتے؟ یہ لوگ یقیناً اس سلسلے میں سیکورٹی کو جواز بنائیں گے اور ہو سکتا ہے ان کی بات درست بھی ہو لیکن سوال یہ ہے "کیا یہ لوگ غریب ہیں؟ کیا یہ لوگ اپنی جیب سے بلٹ پروف گاڑی نہیں خرید سکتے" کیا یہ اس گاڑی میں پٹرول نہیں ڈلوا سکتے اور کیا یہ لوگ ذاتی گارڈز کا بندوبست نہیں کر سکتے؟ یقیناً یہ لوگ کر سکتے ہیں' یہ ارب پتی لوگ ہیں اور ان کے پاس دولت اور سرمائے کی کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنی ذاتی نمود و نمائش اور لش پش کا بوجھ سرکاری خزانے پر ڈالتے چلے جا رہے ہیں' یوں محسوس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیسہ خرچ کرنے کا ظرف نہیں دیا' یہ لوگ اکاؤنٹس کے ارب پتی ہیں لیکن حوصلے اور ظرف کے ککھ پتی ہیں لہٰذا ان کی کوشش ہے یہ پانی کا گھونٹ بھی سرکاری خزانے سے لیں' یہ آہ بھی کریں' یہ چھینک بھی ماریں تو اس کا بل بھی حکومت سے چارج کریں اور یوں محسوس ہوتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کی ہوس پوری دنیا کی بلٹ پروف گاڑیاں مل کر بھی پوری نہیں کر سکیں گی اور یہ لوگ اللہ کے دربار میں بھی لیموزین کار میں بیٹھ کر جائیں گے۔

محمد طاہر راؤ کی بہن بیمار تھی' وہ ہسپتال میں زیر علاج تھی' ڈاکٹروں نے شام کے وقت اس کا آپریشن کرنا تھا' دن ساڑھے بارہ بجے ڈاکٹروں نے طاہر کے والد کے ہاتھ میں دواؤں اور آپریشن کے سامان کی ایک لمبی چوڑی فہرست پکڑا دی' طاہر کے والد نے ڈرائیور کو ساتھ لیا' یہ دونوں دوائیں خریدنے کیلئے ہسپتال سے باہر نکل آئے' وہ سڑک پر آئے تو معلوم ہوا آج بارہ مئی ہے اور پورے شہر میں کرفیو کا عالم ہے' ڈرائیور نے طاہر کے والد کو واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا لیکن طاہر کے والد کے ہاتھ میں دواؤں کا نسخہ تھا اور وہ جانتے تھے جب تک وہ دواؤں کا بندوبست نہیں کریں گے ، اس وقت تک ان کی بیٹی کا آپریشن نہیں ہو سکے گا چنانچہ انہوں نے ڈرائیور کو آگے بڑھنے کی ہدایت کر دی' یہ لوگ ایک کلومیٹر آگے گئے لیکن پھر کبھی واپس نہیں آ سکے' ان دونوں کے ساتھ کیا گزری؟ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ شام کو جب طاہر اپنے والد کی تلاش میں وہاں پہنچا تھا تو اس کے والد اور ڈرائیور کی نعشیں سڑک پر پڑی تھیں جبکہ گاڑی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی' طاہر نے جب اپنے والد کی نعش اٹھائی تو اس کی مٹھی میں دواؤں کا نسخہ دبا ہوا تھا' طاہر نے والد کو کراچی کے ایک گم نام قبرستان میں دفن کر دیا لیکن یہ نسخہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے پاس رکھ لیا' وہ دو دن قبل میرے پاس آیا' اس نے جیب سے وہ نسخہ نکالا اور میرے سامنے پھیلا دیا' یہ کاغذ کا ایک مسلا اور کچلا ہوا ٹکڑا تھا جس کے کونے پر خون کا داغ لگا تھا اور یہ خون یقیناً طاہر کے والد کا تھا' طاہر نے خون کے اس دھبے پر انگلی رکھ کر پوچھا" میں اپنے والد کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی' میرے والد کے قاتل کون ہیں؟ میں ان تک کیسے پہنچ سکتا ہوں اور میں ان سے کیسے انتقام لے سکتا ہوں" طاہر نے آنکھیں پونچھیں اور دوبارہ بولا" میں ایک سال سے سویا نہیں' میں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور میں نے دکان نہیں کھولی' اس ایک برس میں میرا وزن کم ہو کر آدھا رہ گیا' میرا سارا کاروبار تباہ ہو گیا' میری والدہ فوت ہو گئی اور میرا پورا گھرانہ خوار ہو گیا' آپ بتایئے میرا مجرم کون ہے اور میں کس کا گریبان پکڑوں" میرے پاس طاہر کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

12 مئی 2007ء حقیقتاً ہماری تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا' اگر ہماری قوم کا حافظہ سلامت ہے تو قوم کو یاد ہو گا اس دن چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کراچی بار سے خطاب کیلئے قائداعظم انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر اترے تھے اور سندھ حکومت نے انہیں شہر میں داخل ہونے سے روکنے کیلئے پورا شہر جام کر دیا تھا' اس دن شہر میں غنڈوں' قاتلوں اور جرائم پیشہ لوگوں کا راج تھا اور یہ لوگ عام شہریوں پر اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے' اس دن سابق حکومت نے چیف جسٹس کو وکلاء سے دور رکھنے کیلئے 45 معصوم شہریوں کو گولی مروادی تھی' سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے تھے جبکہ اڑھائی سو گاڑیاں جلا دی گئی تھیں' اس دن کے شہداء میں طاہر راؤ کے والد بھی شامل تھے' یہ دن ہماری تاریخ کا سیاہ اور خوفناک ترین دن تھا' 13 مئی کو سابق چیف منسٹر سندھ ارباب غلام رحیم نے اس کی ذمہ داری ایم کیو ایم پر ڈال دی جبکہ ایم کیو ایم نے سندھ حکومت کو ذمہ دار ٹھہرا دیا' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے الزام اور جواب الزام کا یہ سلسلہ جاری ہے' 12 مئی کے سانحے کا اصل ذمہ دار کون تھا؟ یہ معاملہ ابھی تک تحقیق طلب ہے لیکن یہ طے شدہ حقیقت ہے اس دن کراچی کے لوگوں پر بربریت کی انتہا کر دی گئی تھی' پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما اور نجکاری کے وفاقی وزیر نوید قمر نے مجھے بتایا تھا" ہم نے چیف جسٹس کیلئے جلوس نکالا' ہماری گاڑی جلوس کی قیادت کر رہی تھی' ہم لوگوں نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فائرنگ ہوتے اور لوگوں کو گرتے اور مرتے دیکھا تھا" نوید قمر کی طرح سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے اس دن کی بربریت کھلی آنکھوں سے دیکھی تھی لیکن حکومت یا ریاست نے آج تک قومی سطح پر اس سانحے کی تحقیقات کرائیں اور نہ ہی ایسے واقعات کے تدارک کیلئے کوئی پالیسی بنائی' کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے' اسے پاکستانی معیشت کی شہ رگ بھی کہا جاتا ہے' اس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کو چھو رہی ہے اور یہ اکیلا شہر دنیا کے 92 ممالک سے بڑا ہے' کراچی کی ایک دن کی ہڑتال پاکستان کی معیشت کو 50 ارب روپے کا نقصان پہنچاتی ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان کی تمام حکومتوں نے اس شہر کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے' پاکستان کی کسی حکومت نے کراچی کے مسائل حل کرنے' اس کیلئے کوئی بڑی پالیسی بنانے اور اس میں کار فرما" مافیاز" کے خاتمے کیلئے کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی چنانچہ آج کراچی مر رہا ہے اور اگر حکومت نے کراچی کے مسائل کو سنجیدگی سے نہ لیا تو کراچی حقیقتاً فوت ہو جائے گا جس کے بعد ہمارا ملک بھی سسک سسک کر دم توڑ دے گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی ہو' مسلم لیگ ن ہو' مسلم لیگ ق ہو' جماعت اسلامی ہو' تحریک انصاف ہو' وکلاء اتحاد ہو یا پھر ایم کیو ایم' یہ حقیقت ہے 12 مئی کے سانحے سے تمام سیاسی اور معاشرتی جماعتوں کو نقصان پہنچا تھا اور پورا ملک اس دن کے واقعات پر افسردہ تھا' آج سے چند دن بعد تمام سیاسی جماعتیں 12 مئی کے شہداء کی برسی منائیں گی'

اس دن کے واقعات پر افسردہ تھا' آج سے چند دن بعد تمام سیاسی جماعتیں 12 مئی کے شہداء کی برسی منائیں گی' قاضی حسین احمد اور عمران خان اس دن ریلی نکالنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کیا 12 مئی کے شہداء کی برسی یا ریلی اس سانحے کی تلافی کیلئے کافی ہو گی؟ کیا ریلیوں اور برسیوں سے اس قسم کے واقعات کی روک تھام ممکن ہے؟ یقیناً نہیں چنانچہ میرا خیال ہے پاکستان کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں اور قوتوں کو اس دن کو اس طرح منانا چاہیے کہ شہداء کی روحوں کو قرار بھی آ جائے اور کراچی میں آئندہ اس قسم کا کوئی واقعہ بھی پیش نہ آئے' میری گزشتہ روز گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی' ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا ایم کیو ایم کو 12 مئی کے واقعات کا ذمہ دار ٹھہرانا درست نہیں' ہم یہ تاثر ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں سمجھ نہیں آ رہی ہم کیا کریں' اسی طرح مسلم لیگ ن کے رہنما اور وفاقی وزیر خواجہ سعد رفیق نے میرے پروگرام "کل تک" میں تجویز دی تھی کہ تمام سیاسی جماعتوں کو کراچی کے ایشوز کے خاتمے کیلئے "اے پی سی" بلانی چاہیے اور اس پروگرام میں ایم کیو ایم کے رہنما حیدر عباس رضوی نے سعد رفیق کی تجویز کی تائید کی تھی' میرا خیال ہے یہ ایک مثبت اور صحت مند تجویز ہے اور تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو 12 مئی 2008ء کو اسلام آباد میں "اے پی سی" بلانی چاہیے' اس میں ایم کیو ایم کو بھی دعوت دی جائے تاکہ تمام جماعتیں مل کر کراچی کے مسائل کا جائزہ لیں اور اس کے بعد ایسے ٹھوس اقدامات کریں جس سے کراچی میں امن وامان قائم ہو سکے' صنعت کاری اور سرمایہ کاری میں اضافہ ہو اور کراچی حقیقتاً پاکستان کی جنت بن جائے' میرا خیال ہے جماعت اسلامی اور عمران خان اس کام کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں اور یہ کام ہو گیا تو یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک مثبت پیش رفت ہو گی اور اگر ہم نے اس دن کو بھی ضائع کر دیا تو ہم کراچی سے مزید چند میل دور چلے جائیں گے' آپ انتہا دیکھئے 1960ء کی دہائی میں کراچی کا شمار دنیا کے پانچ جدید اور ترقی یافتہ شہروں میں ہوتا تھا اور آج یہ دنیا کے دس خطرناک ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے؟ ایسا کیوں؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ میرا خیال ہے صرف اور صرف ہمارے حکمران اور سیاستدان اس کے ذمے دار ہیں' ہمارے سیاستدانوں کے پاس پریس کانفرنسیں کرنے کیلئے تو بے شمار وقت ہے لیکن کراچی کیلئے ایک لمحہ نہیں' ان کے پاس فوٹو سیشن کیلئے تو گھنٹوں ہیں لیکن کراچی کیلئے ایک منٹ نہیں اور یہ لوگ ارکان اسمبلی کی مراعات کیلئے تو فوراً اکٹھے ہو جاتے ہیں لیکن تڑپتے اور مرتے کراچی کیلئے ان کے پاس کوئی فرصت نہیں' کراچی اس وقت تک تڑپتا اور مرتا رہے گا جب تک ہمارے سیاستدان اس کی مسیحائی نہیں کرتے اور مسیحائی ایک بڑی اے پی سی کی متقاضی ہے۔

ایران کے قالین باف دنیا بھر میں مشہور ہیں‘ یہ لوگ ہزاروں برس سے اس فن سے وابستہ ہیں‘ حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش سے قبل ایران میں ایسے ایسے قالین باف ہوتے تھے جو اپنی انگلیوں سے دھاگوں کی برف‘ بادل‘ بارش اور دریا بنا دیتے تھے اور یہ دریا اتنے مکمل ہوتے تھے کہ لوگ قالین پر پاؤں رکھنے سے قبل اپنے تہبند گھٹنوں تک اٹھا لیتے تھے‘ یہ لوگ دھاگوں سے ایسی برف بناتے تھے کہ لوگوں کو ان قالینوں پر بیٹھ کر باقاعدہ سردی لگتی تھی‘ یہ قالین عموماً بادشاہوں‘ ملکاؤں‘ شہزادوں اور شہزادیوں کیلئے بنائے جاتے تھے اور یہ لوگ ان کے عوض سونے کی ہزاروں اشرفیاں پاتے تھے‘ یہ قالین باف قالین بننے کے بعد اسے شہر کی مرکزی گلی میں ٹانگ دیتے تھے‘ لوگ آتے تھے‘ قالین دیکھتے تھے اور فن کار کی فنکاری کی تعریف کرتے تھے‘ جب پورا شہر اس قالین کی تعریف کر چکتا تو یہ لوگ کوئی تیز نوکیلا اوزار لیتے اور قالین کا کوئی کونا‘ کوئی مورت اور کوئی منظر کاٹ دیتے‘ قالین تھوڑا سا بدصورت یا بدشکل ہو جاتا تھا‘ لوگ ہمیشہ اس حرکت پر انہیں لعنت ملامت کرتے تھے لیکن قالین بافوں کا خیال تھا کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل اور پرفیکٹ ہے اور اگر ان کا قالین مکمل اور پرفیکٹ ہو گا تو یہ اللہ کی ذات میں شرک ہو گا اور اللہ تعالیٰ اس شرک پر ان کے ساتھ ناراض ہو جائے گا چنانچہ وہ ہمیشہ شرک کے گناہ سے بچنے کیلئے اپنے مکمل اور خوبصورت قالین کو بدصورت اور نامکمل بنا دیتے تھے‘ مؤرخین نے قالین بافوں کی اس روایت کو ”پرشین فالٹ“ کا نام دیا‘ مؤرخین کا خیال تھا جس طرح ایران کے قالین باف جان بوجھ کر قالین میں کوئی کمی یا فالٹ چھوڑ دیتے تھے بالکل اسی طرح دنیا کے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمی‘ کوئی فالٹ موجود ہوتا ہے اور یہ فالٹ بعد ازاں اس شخص کے زوال‘ خاتمے اور انجام کا باعث بن جاتا ہے اور دنیا میں صرف وہی شخص عقل مند اور سمجھ دار ہوتا ہے جو نہ صرف اپنے فالٹ کو سمجھ لے بلکہ اس کے نقصان سے بچنے کی کوشش کرے‘ جو شخص اس کوشش میں کامیاب ہو جائے وہ دنیا میں کامران ہو جاتا ہے اور جو اس کوشش میں ناکام ہو جائے وہ خسارے میں رہتا ہے۔

مجھے یہ حقیقت پاکستان کے ایک نامور صحافی اور دانشور خلیل ملک نے بتائی تھی‘ یہ 1997ء کی بات تھی‘ میں روزنامہ پاکستان میں میگزین ایڈیٹر تھا‘ میں کبھی کبھار کالم بھی لکھتا تھا‘ مجھے ایک دن خلیل ملک صاحب کا فون آیا‘ یہ میاں نواز شریف کی حکومت تھی‘ خلیل ملک 1993ء سے 1996ء تک پاکستان مسلم لیگ کے میڈیا سیل میں سید مشاہد حسین کے ساتھ کام کرتے رہے تھے‘ 1996ء کے آخر میں جب میاں نواز شریف کی حکومت آئی تو میاں صاحب نے خلیل ملک کو پی ٹی سی ایل کا میڈیا ایڈوائزر بنا دیا‘ ملک صاحب کو ایک وسیع اور خوبصورت دفتر‘ چار پانچ ٹیلی فون اور دو گاڑیاں دے دی گئیں‘ ملک صاحب ان نوازشات پر بہت خوش تھے‘ ملک صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور انہوں نے مجھے بتایا تم بنیادی طور پر کالم نگار ہو چنانچہ تمہیں فوری طور پر کالم لکھنا چاہیے‘ مجھے ان کی آبزرویشن سے اتفاق نہیں تھا کیونکہ میں ایک نیم دیہاتی شخص تھا جسے اردو لکھنی آتی تھی اور نہ ہی بولنی لیکن ملک صاحب کا اصرار تھا میرے اندر ایک بہت بڑا کالم نگار چھپا ہوا ہے‘ میری اس کے بعد ان سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور انہی ملاقاتوں کے دوران میں کالم نگار بن گیا‘ خلیل ملک صاحب نے ”خبریں“ اخبار میں میرا کالم شروع کرا دیا جس کے بعد میری ان کے ساتھ روزانہ ملاقات ہونے لگی‘ میں خلیل ملک کے ٹیلنٹ‘ شخصیت اور مطالعے پر حیران تھا‘ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں بڑی جاذبیت رکھی تھی‘ وہ بات کرنے‘ بات سمجھانے اور دوسرے شخص کو قائل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے‘ وہ بے تحاشہ خوبصورت لکھتے تھے اور اس سے کہیں زیادہ اچھا بولتے تھے‘ میں نے ان کی بے شمار کتابیں چوری کیں‘ وہ مجھے اپنا ”بچہ جمہورا“ کہتے تھے لیکن پھر 1999ء آیا اور میرے ان کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے اور یہ اختلافات 30 اپریل 2008ء ان کے قتل تک جاری رہے‘ میں ان اختلافات کا ذکر تو اگلی سطروں میں کروں گا لیکن سردست میں آپ کو بتاتا چلوں یہ اختلافات محض اختلافات تھے دشمنی نہیں‘ میں تین چار ماہ بعد انہیں فون کرتا تھا اور ”باباجی“ کا نعرہ لگا کر پوچھتا تھا ”سکور کتنا ہوا ہے؟“ اور وہ اس کے جواب میں ایک لمبا سا قہقہہ لگاتے تھے اور کبھی وہ مجھے فون کرتے تھے اور کہتے تھے ”بچے جمہورے میں برا انسان ہوں لیکن دس کروڑ برے انسانوں سے برا نہیں“ اور میں بھی ایک قہقہہ لگاتا تھا

میں اب آتا ہوں اختلافات کی طرف‘ خلیل ملک صاحب حقیقتاً ایک باصلاحیت اور ٹیلنٹڈ شخص تھے لیکن ان کی ذات میں دو بہت بڑے ”پرشین فالٹ“ تھے‘ پہلا پرشین فالٹ حکمران تھے‘ وہ 1999ء میں ایوان اقتدار میں

داخل ہوئے تھے' انہوں نے وزیراعظم' وزراء اور سیکرٹریوں کے ساتھ ملاقاتیں شروع کیں اور وہ وزیراعظم اور صدر کے طیارے میں بیٹھنے لگے جس کے بعد انہیں حکمرانوں کے کروفر' اختیارات اور طاقت کا اندازہ ہوا

اختیارات نے ان کی آنکھیں خیرا کر دیں اور وہ صحافی سے حکمرانوں کے "منشی" بن کر رہ گئے' 1999ء میں میاں نواز شریف کی حکومت برطرف ہوئی تو حکومت کے ساتھ شامل لوگ بھی "برطرف" ہو گئے' خلیل ملک صاحب کا عہدہ' دفتر اور مراعات چھن گئیں' وہ اس وقت تک ان تمام مراعات کے عادی ہو چکے تھے چنانچہ ان کیلئے اپنا لیونگ سٹینڈرڈ نبھانا مشکل ہو گیا' ان کی اس مجبوری نے انہیں نئے حکمرانوں سے سمجھوتے پر مجبور کر دیا' وہ پہلے چودھری شجاعت کے خفیہ میڈیا ایڈوائزر بنے' میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت آئی تو وہ ان کے لئے خدمات سرانجام دینے لگے' شوکت عزیز وزیراعظم بنے تو وہ اس کے "قلمی ساتھی" بن گئے اور جب آصف علی زرداری نے پیپلز پارٹی کی عنان سنبھالی تو ملک صاحب زرداری ہاؤس شفٹ ہو گئے' یہ ملک صاحب کا پہلا پرشین فالٹ تھا اور اس فالٹ نے پاکستان کے ایک بہترین صحافی' کالم نگار اور دانشور کو حکمرانوں کا منشی بنا دیا' ملک صاحب کا دوسرا پرشین فالٹ "خواتین" تھیں' ملک صاحب ایک شدید نفسیاتی اور روحانی بحران کا شکار تھے اور وہ اس بحران کو "خواتین" کے ذریعے پر کرنے کی کوشش کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مقناطیسی کشش دے رکھی تھی' وہ گفتگو کرنے اور لبھانے کے فن کے ماہر تھے چنانچہ وہ بہت جلد خواتین کو متاثر کر لیتے تھے' ملک صاحب کے اس فن کا شکار عموماً نوجوان لڑکیاں بنتی تھیں' ملک صاحب کی عمر جوں جوں زیادہ ہو رہی تھی ان کا یہ شوق جنون کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا' میں ان کے ساتھ وابستہ تھا' میں نے ان کے دونوں "پرشین فالٹس" کی نشاندہی کی اور انہیں سنبھلنے کا مشورہ دیا لیکن ملک صاحب نے میرے مشورے کو ایک "بچے جمہورے" کا مشورہ سمجھا چنانچہ میں ان سے دور ہوتا چلا گیا کیونکہ مجھے خطرہ تھا اگر میں ان کے مقناطیسی حلقے میں رہا تو شاید میں ان کا اثر لے لوں' خلیل ملک صاحب کے ساتھ میری آخری گفتگو فروری میں ہوئی تھی' انہوں نے فون کر کے فرمایا "تم میرے لئے شوکت عزیز کے حق میں ایک کالم لکھ سکتے ہو" میں نے جوں ہی ان کا یہ مطالبہ سنا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے ان سے عرض کیا "ملک صاحب میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا آپ کی کمزوری آپ کو اس سطح پر لے آئے گی" میں نے ان سے عرض کیا "ملک صاحب آپ مجھے درخواست کرتے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے' آپ میرے سمیت اس ملک کے بے شمار صحافیوں کے استاد ہیں اور استاد کو ہمیشہ اپنے وقار اور عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے" خلیل ملک صاحب خاموشی سے میری بات سنتے رہے' میں خاموش ہوا تو بولے "جاوید تمہاری بات درست ہے لیکن میں سمجھوتوں کی ہیروئن کا شکار ہو چکا ہوں' جس طرح ہیروئن کا عادی تیسرا سگریٹ پینے کے بعد زندگی بھر اسے چھوڑ نہیں سکتا بالکل اسی طرح جو شخص دوسرا یا تیسرا سمجھوتہ کر لیتا ہے تو وہ سمجھوتوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جب کوئی شخص سمجھوتوں کا عادی ہو جاتا ہے تو اس میں اور بھکاری میں کوئی فرق نہیں رہتا اور میں بھکاری بن چکا ہوں" میں نے خلیل ملک صاحب کے منہ سے یہ بات سنی تو میں رو پڑا' مجھے یقین تھا دوسری طرف خلیل ملک صاحب بھی رو رہے ہوں گے۔

یہ خلیل ملک 30 اپریل کو ایک 22 سالہ خاتون کے ہاتھوں قتل ہو گئے' یہ خاتون ان کی تیسری بیوی تھی اور اس نے ملک صاحب کو قتل کرنے کے بعد خودکشی کر لی تھی' مجھے ایک دوست نے اس سانحے کی اطلاع دی تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا "خلیل ملک کو سائرہ خان نے نہیں بلکہ سمجھوتوں نے مارا ہے کہ دنیاداری کے سمجھوتوں کے آخر میں ایک قبرستان ہے اور خلیل ملک جیسے نابغہ روزگار' باصلاحیت اور شاندار لوگ ہمیشہ اس قبرستان تک جا پہنچتے ہیں' خلیل ملک صاحب ایک ایسے شخص تھے جو اپنے پرشین فالٹ کو سمجھ تو گئے لیکن یہ ان سے لڑ نہ سکے' یہ اپنی خامیوں کو شکست نہ دے سکے۔

کمرے سے باہر سائے گرم تھے لیکن اندر کا ماحول ٹھنڈا تھا' عمران خان میرے سامنے صوفے پر بیٹھے تھے 'ہم دونوں میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کے مابین ہونے والے دوبئ مذاکرات کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے' میں نے عمران خان کے ساتھ پروگرام کرنا تھا اور ظاہر ہے جب تک مذاکرات کا نتیجہ نہ آتا ہم اس وقت تک پروگرام شروع نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ہم یہ وقت گپ شپ میں ''خرچ'' کرنے لگے 'میں نے اس دوران عمران خان سے پوچھا ''اگر آصف علی زرداری معطل ججوں کو بحال نہیں کرتے تو آپ کا لائحہ عمل کیا ہوگا'' عمران خان نے فوراً جواب دیا ''ہم ملک گیر تحریک چلائیں گے اور جب تک افتخار محمد چودھری کی عدلیہ بحال نہیں ہوتی 'ہم یہ تحریک جاری رکھیں گے'' میں نے پوچھا ''کیا آپ میاں نواز شریف کو اس تحریک کا حصہ بننے کی دعوت دیں گے'' خان صاحب نے جواب دیا ''اگر میاں نواز شریف مکمل طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کا ساتھ چھوڑ دیں تو ہم انہیں اے پی ڈی ایم میں شامل ہونے کی دعوت دیں گے''۔ میں نے پوچھا ''اگر میاں صاحب صرف وزارتیں چھوڑتے ہیں اور پارلیمنٹ اور جمہوریت بچانے کیلئے پاکستان پیپلز پارٹی کو ایوان میں سپورٹ دیتے رہتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے'' عمران خان نے جواب دیا ''میاں صاحب صرف جمہوریت کیلئے یہ سمجھوتہ نہیں کریں گے' اس کمپرومائز کے پیچھے پنجاب حکومت ہوگی۔ میاں صاحب پنجاب حکومت بچانے کیلئے آصف علی زرداری کو مرکز میں سپورٹ دیں گے اور ہمیں یہ منظور نہیں ہوگا' میاں صاحب کو ادھر یا اُدھر کا فیصلہ کرنا ہوگا''۔ میں نے آصف علی زرداری کے تازہ ترین انٹرویو کا حوالہ دیا اور عرض کیا ''آصف علی زرداری کا فرمانا ہے عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کو ججوں کے نام پر ووٹ نہیں دیئے تھے' عوام نے ان کی پارٹی کو روٹی 'کپڑا اور مکان کے لئے منتخب کیا تھا'' عمران خان نے قہقہہ لگایا اور کرسی کے بازو پر ہاتھ مار کر بولے ''آصف علی زرداری نے جج بحال نہ کئے تو میں آج اعلان کرتا ہوں آصف علی زرداری جس حلقے سے الیکشن لڑیں گے' میں اس حلقے میں آصف علی زرداری کے مقابلے میں کھڑا ہوں گا۔ آصف علی زرداری روٹی 'کپڑے اور مکان کے نام پر ووٹ مانگیں اور میں ججوں کے نام پر عوام سے ووٹ مانگوں گا اور دیکھتے ہیں کون کامیاب ہوتا ہے 'اگر آصف علی زرداری جیت گئے تو وہ سچے ہوں گے اور اگر میں جیت گیا تو ثابت ہو جائے گا عوام ججوں کی بحالی چاہتے ہیں''۔ میں نے قہقہہ لگایا اور ان سے پوچھا ''آپ یہ چیلنج کب دیں گے'' وہ بولے ''میں دوبئ مذاکرات کے نتیجے کا انتظار کروں گا 'اگر ان مذاکرات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو میں آصف علی زرداری کے خلاف الیکشن لڑنے کا اعلان کر دوں گا'' میں نے عمران خان سے عرض کیا ''میرا خیال ہے وہ وقت جلد آنے والا ہے کیونکہ آصف علی زرداری ججوں کو دو نومبر کی پوزیشن پر بحال کرتے نظر نہیں آ رہے'' عمران خان نے میری بات سے اتفاق کیا۔

یہ دو نومبر 2007ء کی پوزیشن کیا تھی؟ سپریم کورٹ میں دو نومبر تک 17 ججز تھے 'افتخار محمد چودھری اس کورٹ کے چیف جسٹس تھے' آئین کے مطابق انہوں نے 2013ء تک سپریم کورٹ کا سربراہ رہنا تھا اور وہ اپنا سوموٹو ایکشن کا اختیار بلا خوف استعمال کر رہے تھے' پاکستان کے آئین نے عدلیہ کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ چیف جسٹس معاشرے میں جہاں ناانصافی 'ظلم اور زیادتی دیکھیں وہ پٹیشن 'رٹ اور مقدمے کے بغیر فریقین کو عدالت میں طلب کر سکتے ہیں اور قانون کے مطابق فیصلہ دے سکتے ہیں' چیف جسٹس کا یہ اختیار ساٹھ برس سے صندوق میں پڑا تھا' افتخار محمد چودھری نے یہ اختیار صندوق سے نکالا اور اس کا استعمال شروع کر دیا' وہ ڈاک سے ملنے والے خطوط' اخبارات کے اندرونی صفحات میں چھپنے والی خبروں' ٹیلی ویژن کی نیوز رپورٹس اور رسائل اور میگزینز میں شائع ہونے والے مضامین تک پر سوموٹو ایکشن لے لیتے تھے اور مظلوموں کو مفت انصاف فراہم کرتے تھے' افتخار محمد چودھری نے دو برسوں میں سات ہزار سوموٹو ایکشن لئے تھے اور ان کے سوموٹو ایکشن نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا' دو نومبر کی عدلیہ نے 9 مارچ اور دو نومبر 2007ء کو صدر پرویز مشرف کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ عوام اس عدلیہ کی واپسی چاہتے ہیں جو کسی کے سامنے جھکتی ہے' دبتی ہے اور نہ ہی کسی سے سمجھوتہ کرتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے سیاستدان عوام کو وہ عدلیہ واپس نہیں کرنا چاہتے' پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت ایک ایسی عدلیہ کی متمنی ہے جس کی سربراہی افتخار محمد چودھری کے پاس نہ ہو چنانچہ حکومت آئینی پیکیج میں چیف جسٹس کی مدت ملازمت تین سال طے کرنا چاہتی ہے' حکومت کی کوشش ہے مذاکرات' قرارداد کے مسودے کی تیاری اور قرارداد پر ایوان میں بحث جون تک چلتی رہے اور جونہی افتخار محمد چودھری کے تین سال پورے ہو جائیں' قرارداد کا مسودہ منظور ہو اور افتخار محمد چودھری گھر بیٹھے بیٹھے ریٹائر ہو جائیں' یوں ججز کی

بحالی کی حجت بھی پوری ہو جائے اور افتخار محمد چودھری کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے' آصف علی زرداری نے پچھلے دنوں اپنے ایک دوست سے کہا تھا "میرے پاس ایک ایسا حل ہے جس سے عدلیہ کا بحران مکھن کے بال کی طرح نکل جائے گا" یوں محسوس ہوتا ہے مکھن کا وہ بال 3 سالہ مدت ہے۔

آصف علی زرداری سپریم کورٹ کے معطل ججوں کے ساتھ ساتھ موجودہ ججوں کو بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں' اس وقت سپریم کورٹ کے 11 جج معطل ہیں جبکہ کورٹ میں 16 جج کام کر رہے ہیں' معطل ججوں کی بحالی کے بعد سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد 27 ہو جائے گی' آصف علی زرداری اتنی بڑی سپریم کورٹ کے بارے میں یہ جواز پیش کر رہے ہیں کہ ملک کی آبادی بڑھ چکی ہے چنانچہ 27 ججوں کی کورٹ بڑی نہیں' یہاں آپ یہ دلچسپ حقیقت ملاحظہ کیجئے بھارت کی آبادی ایک ارب 10 کروڑ ہے اور یہ رقبے کے لحاظ سے پاکستان سے پانچ گنا بڑا ملک ہے لیکن اس کی سپریم کورٹ میں 24 جج ہیں جبکہ پاکستان کی قیادت یہ سمجھ رہی ہے ہمارے 16 کروڑ لوگوں کو 27 ججوں کی سپریم کورٹ چاہیے' آپ یہاں ایک اور حقیقت بھی دیکھئے' چودھری صاحب نے جب حلف اٹھایا تھا تو اس وقت سپریم کورٹ میں چالیس ہزار مقدمے زیر التواء تھے' چودھری صاحب نے 17 ججوں کی مدد سے دو سال میں 30 ہزار زیر التواء مقدمے نبٹا دیئے تھے' اگر انہیں چند ماہ مزید مل جاتے تو باقی کیس بھی ختم ہو جاتے گویا اگر کورٹ فنکشنل ہو اور ججوں کا ضمیر زندہ ہو تو 17 ججوں کی سپریم کورٹ بھی 30 ہزار زیر التواء اور 7 ہزار سوموٹو ایکشن نبٹا سکتی ہے لیکن اگر جج اور کورٹ بااختیار اور باضمیر نہ ہو تو ججوں کی تعداد خواہ 27 ہو یا 127 عوام کو انصاف نہیں ملتا۔ حکومت چیف جسٹس کے سوموٹو ایکشن کے اختیار کو بھی محدود کرنا چاہتی ہے تاکہ مستقبل کا کوئی چیف جسٹس عوام کو براہ راست انصاف اور ریلیف نہ دے سکے۔ حکومت ججوں کی تقرری کا طریقہ کار بھی بدلنا چاہتی ہے' یہ اختیار اس سے قبل 2 نومبر کی عدلیہ کے پاس تھا' حکومت چیف جسٹس کی رضامندی کے بغیر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں کوئی جج مقرر نہیں کر سکتی تھی لیکن اب حکومت یہ اختیار بھی سیاستدانوں یا سیاستدانوں کے نامزد نمائندوں کے حوالے کرنا چاہتی ہے گویا ہماری جمہوری حکومت ہر لحاظ سے عدلیہ کو اپنا پابند اور ماتحت بنانا چاہتی ہے اور حکومت کا یہ منصوبہ کسی بھی طرح عوام کے حق میں نہیں' پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی ادارے نے اسٹیبلشمنٹ کے سامنے سر اٹھانے کی جرات کی ہے اور اس جرات کے نتیجے میں نہ صرف فوج بیرکوں میں واپس گئی بلکہ محترمہ اور زرداری واپس آئے' میاں نواز شریف کو پاکستان آنے کی اجازت ملی اور پورے معاشرے میں بیداری کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ حقیقت ہے اگر یہ سلسلہ آگے نہ بڑھا تو یہ معاشرہ اور یہ ملک ختم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے ہمارے حکمرانوں کو اس ملک اور اس معاشرے کی ضرورت نہ ہو لیکن اس ملک کے عوام کو اس ملک اور اس معاشرے کی ضرورت ہے چنانچہ یہ لوگ سیاستدانوں کے حملے سے قبل اپنا اور اپنے ججوں کا دفاع ضرور کریں گے اور یہ لوگ عدلیہ کو نقصان پہنچانے والے سیاستدانوں خواہ وہ آصف علی زرداری ہی کیوں نہ ہوں' ان کے سامنے ایک بار ضرور سر اٹھائیں گے' یہ لوگ ججوں کی بحالی کے وعدے سے پھرنے والے لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انہوں نے 18 فروری کو صدر پرویز مشرف کے فلسفے اور ان کی جماعت مسلم لیگ ق کے ساتھ کیا تھا' میرا خیال ہے ہماری حکومت کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب واقعی عمران خان آصف علی زرداری کے خلاف الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیں اور ان کا انجام بھی وہی ہو جو مسلم لیگ ق اور اس کے امیدواروں کا ہوا تھا۔

یہ قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کا واقعہ تھا' قائداعظم مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کیلئے جا رہے تھے' قائد نے انگریزی سوٹ پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر ہیٹ تھا' وہ گھر سے نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے گاڑی کی چھت نیچی تھی چنانچہ آپ نے ہیٹ اتار کر گود میں رکھ لیا' آپ کے ساتھی نے راستے میں عرض کیا" جناب آپ مسلمانوں کے لیڈر ہیں لہٰذا آپ اب دیسی لباس پہننا سیکھ لیں" قائد نے فرمایا" دیسی لباس سے کیا مراد ہے" ساتھی نے عرض کیا" ہندوستان کے مسلمان شلوار قمیض' پائجامہ قمیض یا کرتے اور پائجامے کے ساتھ شیروانی یا اچکن پہنتے ہیں اور سر پر دیسی ٹوپی رکھتے ہیں" آپ نے پوچھا" لیکن میں یہ لباس کیوں پہنوں" ساتھی نے عرض کیا" جناب آپ مسلمانوں کے لیڈر ہیں چنانچہ جب آپ یہ لباس پہنیں گے تو آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا" قائداعظم نے گھور کر ساتھی کو دیکھا' گود میں پڑا ہیٹ اٹھایا' سر پر رکھا اور مضبوط لہجے میں بولے" میں منافق نہیں ہوں" اور اس کے بعد قیام پاکستان تک قائداعظم محمد علی جناح انگریزی لباس پہنتے رہے' پاکستان کے قیام کے بعد جب سرکاری لباس کا فیصلہ ہوا تو آپ نے شلوار قمیض' شیروانی اور جناح کیپ پہنی اور اس کے بعد انتقال تک دوبارہ انگریزی لباس نہیں پہنا' یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس واقعے میں آپ کو لیڈروں کا وژن' لیڈروں کی کمٹمنٹ' لیڈروں کا اخلاص اور لیڈروں کی شفافیت دکھائی دیتی ہے اور یہ واقعہ ثابت کرتا ہے قوموں کو بنانے اور چلانے والے لوگ کس قسم کے ہونے چاہئیں؟ لیڈروں کو کتنا واضح' شفاف اور اٹل ہونا چاہیے؟ انہیں منافقت' سمجھوتے اور لچک سے کتنا پاک ہونا چاہیے اور انہیں وعدے اور عہد کا کتنا پکا ہونا چاہیے؟ قائداعظم کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ کیجئے' وہ 1946ء میں دورے پر نکلے تو ان کی ملاقات ایک ہندو بنیے سے ہوئی' یہ کئی نسلوں سے بنیا تھا اور یہ قیمتی اشیاء گروی رکھ کر لوگوں کو قرض دیتا تھا' قائد اعظم سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے قائد سے کہا" محمد علی جناح میں خاندانی بنیا ہوں' میری کئی نسلیں یہ کام کر رہی ہیں' آج تک ہماری نسل کا کوئی شخص اپنی زبان سے نہیں پھرا' لوگ اپنے زیور گہنے لے کر ہمارے پاس آتے ہیں' ہمارے پاس گروی رکھتے ہیں اور ان کی رسید تک نہیں لیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں وہ اپنی چیز کے بارے میں بھول سکتے ہیں لیکن ہم نہیں' میرے والد نے لوگوں سے جو امانتیں لی تھیں' وہ میرے پاس محفوظ ہیں اور میں لوگوں کی جو امانتیں جمع کر رہا ہوں' وہ میرا بیٹا لوٹائے گا" قائداعظم خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے' بنیا بولا" محمد علی تم ایک لیڈر ہو لہٰذا تم میں بنیے سے ہزار گنا زیادہ ایماندار' اٹل اور قول کا پکا ہونا چاہیے' تم اپنی بات سے نہ پھرنا' تم نے مسلمانوں سے آزادی کا وعدہ کیا ہے تو یہ وعدہ پورا کرنا' کہیں ایسا نہ ہو لوگ کل کو یہ کہیں' محمد علی جناح تو بنیوں سے بھی چھوٹا نکلا" قائداعظم نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور مسکرا کر فرمایا" میں سیاستدان ہوں دکاندار نہیں' تم فکر نہ کرو' سورج دائیں سے بائیں ہو سکتا ہے لیکن میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا" یہ ہوتے ہیں لیڈر اور ان لوگوں کو کہتے ہیں سیاستدان' آج 2008ء میں بیٹھ کر ہم جب قائداعظم محمد علی جناح کے وژن اور اخلاص کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کا تقابل آج کے لیڈروں سے کرتے ہیں تو ہمیں شدید خفت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے' کہاں قائداعظم محمد علی جناح جیسے عظیم لوگ اور کہاں صدر پرویز مشرف اور آصف علی زرداری جیسے لوگ؟ کہاں وہ شخصیات اور کہاں آج کے لیڈر صاحبان؟ کہاں وہ لوگ جو خون کے آخری قطرے اور گلے کی آخری سانس تک ڈٹے رہتے تھے اور کہاں یہ لوگ جو ایک مہینے میں اپنے ہاتھ سے لکھے فرمان سے پھر گئے' کہاں وہ لوگ جنہیں پوری برطانوی حکومت' پورے ہندوستان کے کانگریسی لیڈر اور سارے زمانے کے خوف مل کر نہ ڈرا سکے اور کہاں یہ لوگ جو (2B)58 کے خوف سے کلمہ تک نہیں پڑھ رہے' جو اپنے بینک اکاؤنٹس' اپنے مقدموں اور اپنے جائیدادوں کے لالچ میں اونچا سانس نہیں لے رہے اور جو اپنے کہے' اپنے فرمائے اور اپنے لکھے سے منحرف ہو چکے ہیں' کیوں؟ یہ کیوں بھی کم ہوش ربا نہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی دو باتوں سے خوف زدہ ہے' اول جوڈیشری کی آزادی! افتخار محمد چودھری نے جون 2005ء میں عدلیہ کی عنان سنبھالنے کے بعد پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عدلیہ کو وہ مقام دلایا تھا جس کے انتظار میں ملک کے کروڑوں لوگوں کی آنکھیں مدھم پڑ گئی تھیں اور جس کی خواہش میں اس ملک کی تین نسلیں گھل گھل کر ختم ہو گئی تھیں' جس وقت افتخار محمد چودھری نے حلف اٹھایا تھا اس وقت سپریم کورٹ میں 40 ہزار مقدمات زیر التواء تھے' افتخار محمد چودھری نے یہ مقدمات نبٹانے کا فیصلہ کیا' انہوں نے دن رات کام کیا اور 9 مارچ 2007ء تک 30 ہزار مقدمات نبٹا دیئے' چیف جسٹس نے اس کے ساتھ ساتھ چھ سے سات ہزار سو موٹو ایکشن لئے اور

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ان لوگوں کو انصاف ملنا شروع ہوا جو انصاف کے لفظ تک سے واقف نہیں تھے' چیف جسٹس اخبارات اور ٹیلی ویژن کی خبروں میں آنے والے واقعات کانوٹس لے لیا کرتے تھے اور ظالم ہو یا نمرود اسی وقت اسے عدالت میں طلب کر لیتے تھے اور جب تک ظالم مظلوم کی تلافی نہیں کرتا تھا اس وقت تک انصاف کا عمل جاری رہتا تھا' چیف جسٹس کے سوموٹو ایکشن کی صورتحال یہ تھی کہ باغبان پورہ لاہور میں بعض لوگوں نے حوالات میں دو بچوں کو قتل کر دیا' چیف جسٹس نے پولیس کے ذریعہ نہ صرف ملزم گرفتار کرائے بلکہ انہیں سپریم کورٹ بھی طلب کر لیا' یہ لوگ باغبان پورہ کے بہت بڑے بدمعاش تھے' سپریم کورٹ نے مقتول بچوں کے والدین کو ان سے 35 لاکھ روپے خون بہا لے کر دیا' عمر کوٹ کے ایک نالے میں تین ہندو بچے نہاتے ہوئے مر گئے' بچوں کی موت کی وجہ واپڈا اور سیڈا کی وہ تاریں تھیں جو ان اداروں نے نالے میں بچھا رکھی تھیں' یہ خبر کراچی کے انگریزی کے ایک ماہنامہ میں شائع ہوئی' چیف جسٹس نے سیڈا اور حیدر آباد الیکٹرک سپلائی کے ارباب اختیار کو طلب کیا اور مظلوم خاندانوں کو چھ' چھ لاکھ روپے لے کر دیئے' سپریم کورٹ ان دنوں اتنی فعال ہو گئی تھی کہ اس نے سی بی آر کو ٹیکس نادہندگان سے کروڑوں روپے وصول کرا کر دیئے چنانچہ افتخار محمد چودھری کے یہ فیصلے تھے جن کی وجہ سے آج کی حکومت کو خطرہ ہے اگر چیف جسٹس بحال ہو گئے تو وہ اسی طرح سوموٹو ایکشن لیتے رہیں گے' عوام کو انصاف ملتا رہے گا اور لوگ سیاستدانوں کی اطاعت اور فرمانبرداری سے آزاد ہو جائیں گے اور چیف جسٹس کی بحالی کی راہ میں دوسری بڑی رکاوٹ این آر اوز ہیں' آصف علی زرداری نے صدر پرویز مشرف کے ساتھ ''ڈیل'' کر کے اپنے تمام مقدمات ختم کر لئے ہیں' صدر نے ان کے منجمد اکاؤنٹس بھی کھول دیئے ہیں' آصف علی زرداری ججوں سے یہ گارنٹی چاہتے ہیں کہ عدلیہ بحال ہونے کے بعد ان ''این آر اوز'' کو نہیں چھیڑا جائے گا لیکن جج انہیں یہ گارنٹی دینے کیلئے تیار نہیں ہیں چنانچہ حکومت ججوں کی بحالی کو ایک آئینی پیکیج کے ساتھ منسلک کرنا چاہتی ہے' اس پیکیج میں چار چیزیں شامل ہیں' اول معطل ججوں کی بحالی کے بعد سپریم کورٹ کے موجودہ جج بھی برقرار رہیں گے جس سے سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد 27 ہو جائے گی اور یوں ''باغی'' جج تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے حکومت کو ٹف ٹائم نہیں دے سکیں گے' دوم چیف جسٹس کی مدت ملازمت 3 سال طے کر دی جائے گی' یہ پیکیج نافذ العمل ہوتے ہوتے جون تک چلا جائے گا' اس دوران افتخار محمد چودھری کے تین سال پورے ہو جائیں گے اور وہ بحال ہوئے بغیر ریٹائر ہو جائیں گے' سوم صدر کے 3 نومبر کے فیصلے کو قانونی شکل دے دی جائے گی اور چہارم چیف جسٹس کا سوموٹو ایکشن کا اختیار ختم یا محدود کر دیا جائے گا' یہ ہے حکومت کا منصوبہ۔

کیا اس کو سیاست کہتے ہیں؟ کیا یہ سیاستدان ہوتے ہیں اور کیا ان لوگوں کو لیڈر کہلانے کا حق حاصل ہے اگر آج قائداعظم زندہ ہوتے تو سوچئے اس ساری صورتحال پر ان کا کیا ردعمل ہوتا؟ کیا وہ ان تمام سیاسی منافقتوں پر خاموش رہتے' میرا خیال ہے وہ ہرگز خاموش نہ رہتے اور اس جرم کی سزا میں وہ بھی ڈاکٹر عبدالقدیر اور افتخار محمد چودھری جیسے انجام کا شکار ہو جاتے یا پھر صدر پرویز مشرف انہیں بھی گھر سے اٹھا کر گوانتانامو بے بھجوا دیتے اور آصف علی زرداری اس مسئلے پر فرماتے' میں نے تو قائداعظم کو گرفتار نہیں کیا' آپ اس سے پوچھیں جس نے قائداعظم کو امریکہ کے حوالے کیا تھا' ذرا سوچئے ہم کیسے شاندار ملک میں رہ رہے ہیں اور کیسے شاندار لوگ ہمارے حکمران ہیں؟ ہمارا کیا بنے گا؟

یہ 2006ء کے آخری مہینوں کی بات تھی' چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کوئٹہ کے دورے پر تھے' کوئٹہ میں ان کی عدالت میں ایک خاتون کی طلاق کا مقدمہ پیش ہوا' چیف جسٹس نے خاتون سے پوچھا" آپ کا وکیل عدالت میں موجود ہے" خاتون نے احترام سے عرض کیا" جناب میرا کوئی وکیل نہیں' میں اپنا مقدمہ خود لڑ رہی ہوں" چیف جسٹس نے مخالف فریق کے وکیل کو دلائل دینے کی اجازت دے دی' وکیل چیف جسٹس کے سامنے کھڑا ہوا' اس نے قانون کی کتاب سے ایک حوالہ پڑھا اور اس کے بعد عرض کیا" مائی لارڈ یہ مقدمہ چھوٹی عدالت میں چل رہا ہے چنانچہ جب تک چھوٹی عدالت اس کا فیصلہ نہیں کرتی' سپریم کورٹ اس وقت تک یہ مقدمہ سننے کی مجاز نہیں" چیف جسٹس نے ساتھی جج کی طرف دیکھا' ساتھی جج نے بھی اثبات میں گردن ہلا دی' چیف جسٹس نے فائل پر فیصلہ لکھنے کیلئے قلم اٹھایا' وہ خاتون اس وقت اپنی نشست سے اٹھی اور مہذب انداز سے عرض کیا" چیف جسٹس صاحب آپ اگر فیصلہ لکھنے سے قبل مجھے ایک منٹ بولنے کی اجازت دے دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی" چیف جسٹس نے قلم واپس رکھا اور خاتون کو بولنے کی اجازت دے دی' خاتون آگے بڑھی اور کرسی انصاف کے سامنے کھڑی ہو کر کہا" جناب چیف جسٹس صاحب میں قانون نہیں جانتی' مجھے نہیں معلوم میرے مقدمے میں کون کون سی دفعہ اور کون کون سا قانون لاگو ہوتا ہے لیکن میں آپ کی معزز عدالت سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں" خاتون نے بتایا" میری شادی 24 سال کی عمر میں ہوئی تھی' میں اپنے خاوند کے گھر صرف ایک سال بس سکی" میں نے اس کے بعد عدالت میں خلع کا کیس کر دیا' آج اس کیس کو سات برس ہو چکے ہیں لیکن مجھے خلع نہیں ملا' ان سات برسوں میں میرا کیس تین مرتبہ سپریم کورٹ پہنچا اور وہاں سے کوئی نہ کوئی دفعہ' کوئی نہ کوئی قانون لگ کر چھوٹی عدالت میں واپس آ گیا' میں نے جب مقدمہ دائر کیا تھا تو اس وقت میری عمر 25 سال تھی' آج میں 32 برس کی ہو چکی ہوں' اگر مجھے سات برس پہلے انصاف مل جاتا تو میں آج شادی شدہ ہوتی' میرا کوئی گھر اور بال بچے ہوتے' خاتون رکی' اس نے آنکھیں صاف کیں اور دوبارہ گویا ہوئی" جناب چیف جسٹس صاحب آپ آج میری درخواست کو ایک بار پھر چھوٹی عدالت میں بھجوا رہے ہیں' یہ درخواست چوتھی مرتبہ چھوٹی عدالت میں جائے گی اور مجھے انصاف کیلئے پانچ چھ سال مزید انتظار کرنا پڑے گا' ذرا سوچئے اور بتایئے' مجھے اگر چھ سال بعد انصاف ملتا ہے تو کیا میری شادی ہو سکے گی' کیا کوئی شخص میرے ساتھ شادی کرے گا" خاتون خاموش ہوئی اور نیچے بیٹھ گئی' چیف جسٹس کے دل پر ضرب لگی' انہوں نے قلم اٹھایا اور اسی وقت خاتون کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

یہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے اس قسم کے فیصلے تھے جنہوں نے اس "شخص" کو اس نظام کا باغی بنا دیا' وہ سسٹم سے ٹکرا گیا اور سسٹم نے ایک بار اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا' افتخار محمد چودھری کی ذات پر بے شمار الزامات لگائے جاتے ہیں' ان پر پہلا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ اسی نظام کی پیداوار ہیں' وہ اسی عدلیہ کی کوکھ سے نکلے ہیں' وہ اسی نظام کے ساتھ سمجھوتے کر کے اوپر آئے ہیں اور انہوں نے بھی ماضی میں پی سی اوز پر حلف اٹھائے تھے' ان پر دوسرا الزام متوازی نظام ہے' حکومت کا کہنا تھا چیف جسٹس نے سوموٹو نوٹس لے کر سرکاری مشینری کو تباہ و برباد کر دیا تھا جس کی وجہ سے ملک میں کوئی سرکاری افسر حکمرانوں کی بات ماننے کیلئے تیار نہیں تھا لہٰذا حکومت چلانا مشکل ہو گیا اور ان پر تیسرا الزام اسٹیبلشمنٹ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنا تھا' چیف جسٹس نے گھروں سے غائب لوگوں کا مقدمہ اٹھایا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایجنسیوں کو قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جس کے نتیجے میں ایجنسیوں کی "کارکردگی" متاثر ہونے لگی' یہ تینوں الزام محض الزام نہیں تھے بلکہ پاکستان جیسے ممالک میں قابل گردن زنی جرائم ہیں اور ظاہر ہے یہ سسٹم کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو ایسے "جرائم" میں ملوث پایا جاتا ہو لیکن اس کے باوجود افتخار محمد چودھری پر لگائے جانے والے الزامات کا جواب ضرور دیا جا سکتا ہے' اس میں کوئی شک نہیں افتخار محمد چودھری نے اس ملک کے پرانے' بوسیدہ اور ظالمانہ نظام سے جنم لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے دنیا کے تمام باغی' انقلابی اور وہ لوگ جن کے سروں پر وقت نے تبدیلی کا تاج رکھا تھا وہ پرانے' بوسیدہ اور ظالمانہ نظام کے بیٹے تھے' آپ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر چواین لائی اور ٹیپو سلطان سے لے کر قائداعظم محمد علی جناح تک دنیا کے تمام مشاہیر کا پس منظر دیکھ لیجئے' ان تمام لوگوں نے بوسیدہ نظام کی کوکھ ہی سے جنم لیا تھا لیکن بعد ازاں یہ لوگ اسی بوسیدہ نظام سے ٹکرائے اور انہوں نے اسے جڑوں سے ہلا دیا' آپ حضرت عمر فاروقؓ کا پس منظر دیکھ لیجئے' وہ آج دنیا میں اسلامی نظام کا سب سے بڑا حوالہ

ہیں لیکن آپ یاد کیجئے وہ اسلام کے دائرے میں کیسے داخل ہوئے تھے؟' وہ اسلام قبول کرنے سے قبل کہاں کھڑے تھے اور ان کا شمار کن لوگوں میں ہوتا تھا؟ حضرت عمر فاروقؓ سے آخری عمر میں کسی نے پوچھا تھا "آپ کی زندگی کا حیران کن واقعہ کیا تھا؟" آپؓ نے فرمایا "میں آج تک حیران ہوں عمرؓ بدل کیسے گیا" یہ ہے وہ سوال اور وہ جواب جس کے قدموں میں انقلاب اور تبدیلی کے تمام جواز چھپے ہیں' چیف جسٹس کا دوسرا جرم حکومتی نظام کے راستے میں رکاوٹ تھا' ہم نے آج یہ طے کرنا ہے 'کیا یہ نظام ساٹھ برسوں میں عوام کے مسائل حل کر سکا؟ اگر اس کا جواب ہاں ہے تو پھر میرا خیال ہے ہمیں چیف جسٹس کو نشان عبرت بنا دینا چاہیے اور اگر اس کا جواب ناں ہے تو پھر اس سسٹم کو اٹھا کر بحر ہند میں پھینک دینا چاہیے اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک یہ سسٹم زندہ ہے اس وقت تک اس ملک کے 16 کروڑ لوگوں کی سانسوں میں ریت اترتی رہے گی اور چیف جسٹس کا آخری جرم اسٹیبلشمنٹ کے اندھے اختیارات کو للکارنا تھا' ہم نے آج یہ بھی طے کرنا ہے کہ ہم نے معاشرے کو مہذب شکل دینی ہے یا اس ملک کو جنگل بنانا ہے 'اگر ہم نے اس ملک کو جنگل بنانا ہے تو پھر میرا خیال ہے چیف جسٹس کو بحال نہیں ہونا چاہیے اور اگر ہم پاکستان کو تہذیب یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں مسجد سے لے کر ایوان صدر تک اور پولیس سے لے کر فوج تک تمام اداروں اور تمام شخصیات کو قانون کے سامنے جواب دہ بنانا ہوگا تاکہ کل کا سورج اگے تو اس ملک میں کوئی لاٹھی والا آصف علی زرداری کو بلا جرم قید کر سکے 'نواز شریف کو جبراً جلاوطن کر سکے اور نہ ہی نمازیوں کو مسجدوں کی دہلیز سے اٹھا کر اندھے کنوئیں میں پھینک سکے۔

پاکستان کے عوام ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں "جج بحال کیوں نہیں ہو رہے؟" لوگ پوچھتے ہیں "میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری نے 9 مارچ 2008ء کو بھوربن میں خود اعلان کیا تھا 'ہم حکومت بننے کے 30 دن کے اندر معطل ججوں کو 2 نومبر 2007ء کی پوزیشن پر بحال کریں گے لیکن آج 29 اپریل آ گیا اور اعلان مری کی ڈیڈ لائین کے خاتمے کو صرف ایک دن باقی ہے مگر حکمران اتحاد ججز کو بحال نہیں کر پا رہا 'کیوں؟" اس کیوں کے تین جواب ہیں' پہلا جواب صدر پرویز مشرف ہیں 'ایوان صدر کی طرف سے حکومت کو مسلسل یہ سگنل مل رہے ہیں کہ اگر حکومت نے ججز بحال کئے تو صدر اٹھاون ٹو بی استعمال کر دیں گے جس کے نتیجے میں اسمبلیاں اور حکومتیں ختم ہو جائیں گی اور حکومت صدر کے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں نہیں جا سکے گی کیونکہ عدالتوں میں وہ جج بیٹھے ہیں جنہیں حکومتی اتحاد تسلیم نہیں کرتا' دوسرا جواب قانونی پیچیدگی ہے' سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس ارشاد حسن خان نے اپنے دور میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ جب کوئی جج چلا جاتا ہے تو وہ چلا جاتا ہے چنانچہ حکومت کا خیال ہے جب ججوں کو قرارداد اور ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے بحال کیا جائے گا تو یہ آرڈر چند سیکنڈ بعد کورٹ میں چیلنج ہو جائے گا اور کورٹ اس کے خلاف فیصلہ دے دے گی جس کے بعد ایک نیا بحران شروع ہو جائے گا' صدر کے قانونی مشیروں شریف الدین پیرزادہ' حفیظ پیرزادہ اور ملک محمد قیوم نے ایک ایسی رٹ پٹیشن تیار کر لی ہے جو وزیراعظم کے ایگزیکٹو آرڈر کے فوراً بعد کورٹ میں پیش کر دی جائے گی اور تیسرا جواب "این آر اوز" ہیں۔ پیپلز پارٹی کے قانونی مشیروں کا خیال ہے جب عدلیہ 2 نومبر کی پوزیشن پر بحال ہوگی تو این آر اوز کے خلاف سٹے آرڈر بھی زندہ ہو جائے گا چنانچہ آصف علی زرداری کو ایک بار پھر ملک چھوڑنا پڑے گا' ججز کی بحالی کے راستے میں اصل رکاوٹ کیا ہے؟ یہ (58(2B کا خوف ہے' موجودہ سپریم کورٹ کا خوف یا پھر "این آر اوز" کا اندیشہ لیکن ایک بات طے ہے اگر اس ملک نے آگے چلنا ہے تو حکومت کو ججز کو بحال کرنا پڑے گا بصورت دیگر اس ملک کی ہر گلی لال ہو جائے گی اور حکمران کلاس کا ہر نمائندہ ارباب غلام رحیم اور شیر افگن نیازی جیسے انجام کا شکار ہو جائے گا اور حکومت کا کوئی وزیر' کوئی مشیر اور کوئی سپورٹر بلٹ پروف گاڑی کے بغیر گھروں سے نہیں نکل سکے گا چنانچہ عزت یا ذلت' حکومت نے اس کا فیصلہ کرنا ہے اور اس فیصلے میں صرف ایک دن باقی ہے۔

''اچھا تم بتاؤ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے بڑا تحفہ کیا دیا تھا''وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھا'میں سوچ میں پڑ گیا'وہ اس دوران میری طرف دیکھتے رہے'میں نے تھوڑی دیر سوچا اور عرض کیا''شعور''۔انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا'میں نے عرض کیا''عقل''وہ فوراً بولے''شعور اور عقل دونوں ایک ہی چیز ہیں''میں نے مزید سوچا اور عرض کیا''آکسیجن'سورج کی روشنی'پانی'خوراک اور جمالیاتی حس''انہوں نے ناں میں گردن ہلا دی'میں نے عرض کیا''تعمیر کا فن'انسان کائنات کی واحد مخلوق ہے جو پتھروں کو ہیرے کی شکل دے سکتی ہے'جو مٹی کا محل بنا سکتا ہے اور جو ریت کے ذروں کو شیشے میں ڈھال سکتا ہے''وہ مسکرائے اور انکار میں سر ہلا دیا'میں نے اس کے بعد انسان کی تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کا نام لینا شروع کر دیا لیکن وہ انکار میں سر ہلاتے رہے یہاں تک کہ میں تھک گیا اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگا'وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے''آپ نے انسان کی جن خوبیوں اور صلاحیتوں کا ذکر کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کی دین ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے یہ خوبیاں قائم اور دائم رہتی ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے تو انسان فرعون ہو یا نمرود یا بش اس کی خوبیاں اس کی خامیاں بن جاتی ہیں اور وہ دنیا میں زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے''۔میں خاموشی سے سننے لگا'وہ بولے''میں آپ کو اب اس سب سے بڑے تحفے کے بارے میں بتاتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا''میں ہمہ تن گوش ہو گیا'وہ بولے''قدرت نے انسان کو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے'دنیا کی کوئی دوسری مخلوق'کوئی خاکی یا نوری پیکر اس خوبی کی مالک نہیں''۔میں نے حیرت سے پوچھا''جناب میں آپ کی بات نہیں سمجھا''۔وہ بولے''مثلاً تم چاند کو لے لو'اللہ تعالیٰ نے جب کائنات بنائی تو اس نے چاند میں ایک پروگرام فیڈ کر دیا اور چاند اب تک اس پروگرام کے تحت چمک رہا ہے اور جب تک قدرت پروگرام نہیں بدلے گی یہ چاند اسی طرح چمکتا رہے گا'آپ سورج'ستاروں اور سیاروں کو لے لیجئے'زمین کی حرکت کو لیجئے'ہواؤں'فضاؤں'ندیوں اور نالوں کو لے لیجئے'دریاؤں'سمندروں اور پہاڑوں کو لے لیجئے'زلزلوں'طوفانوں اور سیلابوں کو لے لیجئے'یہ تمام ایک پروگرام کے تحت چل رہے ہیں اور قدرت یہ پروگرام فیڈ کر کے ان سے لاتعلق ہو گئی''وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا''جناب میں اب بھی آپ کا نقطہ نہیں سمجھ سکا''وہ بولے''دنیا کا کوئی پہاڑ'کوئی درخت'کوئی جانور'کوئی ستارہ اور کوئی سیارہ اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتا لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس خوبی سے نواز رکھا ہے کہ وہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے'وہ اسے راضی کر سکتا ہے''میں نے عرض کیا''جناب میں یہی تو آپ سے پوچھ رہا ہوں''وہ مسکرائے اور بولے''لیکن اس نقطے کو سمجھنے کیلئے مجھے پیچھے تاریخ میں جانا پڑے گا''میں خاموشی سے سننے لگا'وہ بولے''آپ شیطان اور حضرت آدمؑ کا واقعہ دیکھئے'اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا وہ انسان کو سجدہ کرے'شیطان نے حکم عدولی کی'اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوئے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ کر دیا'شیطان آسمانوں سے اترا اور کروڑوں سال سے زمین پر خوار ہو رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو گندم کا دانہ چکھنے سے منع فرمایا'حضرت آدمؑ نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی'اللہ تعالیٰ ان سے بھی ناراض ہوئے اور انہیں بھی آسمان سے زمین پر بھیج دیا لیکن حضرت آدمؑ کے رویے اور شیطان کے رویے میں بڑا فرق تھا''وہ دم لینے کیلئے رکے اور دوبارہ گویا ہوئے''شیطان زمین پر آنے کے باوجود اپنی بات پر اڑا رہا جبکہ حضرت آدمؑ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے لگے'وہ سجدے میں پڑے رہتے تھے'روتے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہی'اپنی غلطی'اپنے جرم اور اپنے گناہ کی معافی مانگتے جاتے تھے'حضرت آدمؑ کی توبہ کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول نہ کر لی اور مشیت ایزدی ان سے راضی نہ ہو گئی''وہ خاموش ہو گئے'ہمارے درمیان خاموشی کے بے شمار پل گزر گئے'جب یہ وقفہ طویل ہو گیا تو میں نے عرض کیا''جناب میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا''وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے''اللہ تعالیٰ کا انسان کیلئے سب سے بڑا انعام توبہ ہے'انسان اس انعام'اس تحفے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کر سکتا ہے اور وہ اللہ جو اپنے بندے کی کسی خطا'کسی جرم'کسی کوتاہی اور کسی گناہ سے ناراض ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے مان جاتا ہے اور اس بندے پر اپنے رحم'اپنے کرم اور اپنی محبت کے دروازے کھول دیتا ہے اور یوں انسان سکون میں چلا جاتا ہے''۔

وہ رکے اور دوبارہ بولے''جب تک انسان کو اللہ کی محبت'کرم اور رحم نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک انسان کو سکون'آرام'چین'خوشی اور مسرت حاصل نہیں ہوتی'خوشی'خوشحالی اور سکون اللہ کی رضامندی سے منسلک ہے

اور جو شخص‘ جو قوم اور جو طبقہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے محروم ہو جاتا ہے اس کا سکون‘ خوشی اور خوشحالی چھن جاتی ہے چنانچہ جب بھی انسان کا رزق تنگ ہو جائے‘ اس کا دل مسرت اور خوشی سے خالی ہو جائے‘ وہ چین اور سکون سے محروم ہو جائے اور اسے زندگی میں ایک تپش‘ ڈپریشن اور ٹینشن کا احساس ہو تو اسے چاہیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جائے‘ وہ کثرت سے توبہ کرے اور وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرے‘‘ میں خاموش رہا‘ وہ بولے ’’یہ سکون کا ایک نسخہ ہے‘ سکون کا دوسرا نسخہ معافی ہے‘ ہم لوگ دن میں اوسطاً سو سے تین سو تک غلطیاں کرتے ہیں‘ اگر ہم ہر غلطی پر معذرت کو اپنی روٹین بنا لیں‘ ہم نے جلد بازی‘ بے پروائی‘ نفرت‘ غصے‘ تکبر اور ہٹ دھرمی میں جس شخص کا حق مارا‘ ہم نے جس کو نقصان پہنچایا اور ہم نے جس کو ڈسٹرب کیا ہم اگر فوراً اس شخص سے معافی مانگ لیں تو بھی ہماری زندگی میں سکون‘ آرام اور خوشی آ سکتی ہے‘ ہمیں معافی مانگنے میں کبھی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے کیونکہ معافی وہ چٹان ہے جس کے نیچے سکون‘ خوشی اور خوشحالی کے چشمے چھپے ہیں اور جب تک ہم یہ چٹان نہیں سرکائیں گے‘ ہم خوشی‘ خوشحالی اور سکون کا ٹھنڈا پانی نہیں پی سکیں گے‘‘ وہ رکے اور دوبارہ بولے ’’یاد رکھو دنیا میں صرف اور صرف شیطان توبہ اور معافی سے دور رہتا ہے جبکہ اللہ کے بندے ان دونوں چیزوں کو اپنی روٹین بنا لیتے ہیں‘ ہٹ دھرمی‘ تکبر‘ ظلم‘ ضد‘ نفرت اور غصہ شیطان کی خامیاں ہیں اور جن لوگوں کی ذات میں یہ ساری خامیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں‘ تم کبھی ان کے منہ سے توبہ اور معافی کا لفظ نہیں سنو گے چنانچہ تم کبھی ان لوگوں کو پر سکون‘ خوش اور خوشحال نہیں پاؤ گے‘ یہ دولت مند ہو سکتے ہیں لیکن یہ دولت انہیں خوشی اور سکون فراہم نہیں کرتی‘ تم ان لوگوں کا انجام بھی اچھا ہوتا نہیں دیکھو گے جبکہ معافی اور توبہ کرنے والے لوگوں میں تمہیں غصہ‘ نفرت‘ ضد‘ ظلم‘ تکبر اور ہٹ دھرمی نہیں ملے گی اور تمہیں یہ لوگ کبھی پریشان‘ ڈپریس اور ٹینس نہیں ملیں گے چنانچہ ہر لمحہ لوگوں سے معافی مانگتے رہو اور اللہ سے توبہ کرتے رہو‘ تمہاری زندگی سے کبھی سکون‘ خوشی اور خوشحالی کم نہیں ہو گی‘‘ وہ خاموش ہو گئے‘ میں نے ان کے گھٹنے چھوئے اور باہر آ گیا۔

مجھے کالم میں خطوط شائع کرنے سے شدید "نفرت" ہے' میں اسے بے ایمانی' سستی اور کام چوری سمجھتا ہوں چنانچہ میں نے پچھلے پندرہ برسوں میں صرف پانچ خطوط شائع کئے ہیں لیکن وہ خطوط بھی محض خطوط نہیں تھے' وہ بنے بنائے کالم تھے اور ان میں اتنی توانائی' طاقت اور سنگینی تھی کہ مجھے محسوس ہوا اگر میں نے یہ خط شائع نہ کیا تو یہ قارئین کے ساتھ زیادتی ہو گی چنانچہ میں اپنا اصول توڑنے پر مجبور ہو گیا' آج میں اس کالم میں چھٹا خط شائع کرنے لگا ہوں' یہ خط مجھے کسی فیڈرل سیکرٹری نے لکھا تھا' خط کے لفافے پر اور اندر کسی جگہ "صاحبِ خط" کا نام یا نشانی موجود نہیں تھی' خط ٹائپ شدہ تھا چنانچہ ہینڈ رائیٹنگ سے بھی "مجرم" کی شناخت ممکن نہیں تھی لیکن بات کیونکہ دلچسپ بھی ہے' حقیقت بھی اور سنگین بھی چنانچہ میں ایک بار پھر اپنا اصول توڑنے پر مجبور ہو رہا ہوں' آپ اس خط سے اندازہ لگا سکتے ہیں ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریٹس کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں اور جب حکمران اعلیٰ سرکاری افسروں کو نوازنے پر آتے ہیں تو وہ کسی حد' کسی ضابطے اور کسی قانون کی پروا نہیں کرتے' :میرے نامعلوم اور خفیہ فیڈرل سیکرٹری نے لکھا

"میں آپ کا اس وقت سے قاری ہوں جب آپ نے کالم لکھنے کا آغاز کیا تھا' میں جن تین صحافیوں کی تحریر کو آوازِ حق سمجھتا ہوں آپ ان میں سے ایک ہیں' اگرچہ ان تین میں سے اب صرف دو رہ گئے ہیں جبکہ تیسرے امتدادِ زمانہ کے نرغے میں آ چکے ہیں' شاعر نے کہا تھا "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" اس مصرعے کے مصداق اس ملک میں مسائل اور ظلم تو بے شمار ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانی لازم ہے لیکن اس مکتوب کے ذریعے میں آپ کو ایک ایسا اندھیر دکھانا چاہتا ہوں جو نگران حکومت نے مچایا تھا اور موجودہ حکومت بھی اس اندھیر پر آنکھیں بند کئے بیٹھی ہے' آپ کیلئے یہ بات حیران کن ہو گی کہ نگران حکومت نے ریٹائرڈ افسروں کو تھوک کے حساب سے نئی ملازمتیں دیں' اگر یہ کام کسی سسٹم یا معیار کے مطابق کیا جاتا تو شاید ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اس نوازش کا مستحق ایسے لوگوں کو ٹھہرایا گیا جو کسی بھی طرح معیار اور میرٹ پر پورے نہیں اترتے تھے اور ان کی واحد کوالی فکیشن حکمرانوں سے دوستی تھی' ہم سب جانتے ہیں مسلح افواج کے جرنیلوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمتیں دی جاتی ہیں' ملازمتیں دی جانی چاہئیں یا نہیں؟ یہ ایک الگ سوال ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے آج تک کسی جرنیل کو اس رعایت سے محروم نہیں رکھا گیا' پاکستان میں جو بھی جرنیل ریٹائر ہوتا ہے تو سینیارٹی کے مطابق اس ریٹائرڈ جرنیل کو متعلقہ ہیڈ کوارٹر ملازمت کی پیش کش کر دیتا ہے' یہ روایت اچھی ہے یا بری لیکن یہ ایک ترتیب اور نظام کے تحت چل رہی ہے اور تمام جرنیل اس سے مستفید ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس سول بیوروکریسی میں حکمران صرف ان سیکرٹریوں کی مدت ملازمت میں توسیع کرتے ہیں جو حکمرانوں کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہوتے ہیں' اس سہولت سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو ایک پتلون اور ایک ٹائی سے ملازمت شروع کرتے ہیں لیکن ریٹائرمنٹ کے وقت کروڑ پتی بن چکے ہوتے ہیں اور حکومت ایک بار پھر انہیں تختِ پر براجمان کر کے ان کی مراعات اور دولت میں اضافہ کر دیتی ہے' نگران حکومت نے اس ضمن میں اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے"۔ اس کے بعد نامعلوم اور خفیہ فیڈرل سیکرٹری نے بے شمار سیکرٹریوں کے نام اور تفصیل لکھی جنہوں نے نگران حکومت کی اس نوازش سے فائدہ اٹھایا' انہوں نے لکھا "مثلاً آپ طارق بخاری کو لے لیجئے' طارق بخاری فیڈرل سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن تھے' حکومت نے ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں تین دفعہ توسیع دی' طارق بخاری نے اپنے زمانے میں سول سروس کے تمام تربیتی ادارے جن میں چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں قائم نیپا' لاہور کا سٹاف کالج اور سول سروس اکیڈمی شامل ہیں ریٹائرڈ جرنیلوں کی تحویل میں دے دیئے' طارق بخاری کی مہربانی سے سول سروس کے تمام ارکان خواہ وہ سول سروس اکیڈمی میں ابتدائی تربیت لے رہے ہوں یا وہ گریڈ 19' 20 اور 21 میں پروموشن لینے کیلئے نیپا لاہور' نیپا کراچی' نیپا کوئٹہ' نیپا پشاور اور سٹاف کالج لاہور میں زیر تربیت ہوں وہ سارے کے سارے جرنیلوں کے شکنجے میں چلے گئے' طارق بخاری اپنی نجی محفلوں میں ببانگ دہل کہتے ہیں یہ سب ارینجمنٹ ان کی تجویز پر ہوا تھا' طارق بخاری نے جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس میں گواہی بھی دی اور انہیں تین (یا غالباً چار بار) توسیع دینے کے بعد اب فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں تین سال کے لئے جج لگا دیا گیا گویا وہ اب 66 یا 67 سال کی عمر تک ملازمت کریں گے' اسی طرح فیڈرل سیکرٹری اسماعیل حسن نیازی کو ریٹائرمنٹ پر نگران حکومت نے فیڈرل سروسز ٹریبونل میں تین سال کیلئے لگا دیا' کس بنیاد پر؟ کسی کو معلوم نہیں' ممتاز شیخ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہیں' انہیں پہلے

ایک سال کیلئے توسیع دی گئی' بعد ازاں نگران حکومت نے انہیں مزید تین سال کیلئے فیڈرل سروسز ٹربیونل میں ممبر لگا دیا' ممتاز شیخ کو بھی کس بنیاد پر دوسرے ریٹائر افسروں پر ترجیح دی گئی؟ اس کے بارے میں بھی کسی کو معلوم نہیں''۔

میرے نامعلوم اور خفیہ سیکرٹری نے اس کے بعد لکھا ''نگران حکومت نے منظور نظر لوگوں کو نوازنے کیلئے کارپوریشنوں اور اتھارٹیز میں ریٹائرمنٹ کی عمر 65 کر دی' اس قانون کے بعد مشتاق ملک کو پیپرا میں اور خالد سعید کو نیپرا کا چیئرمین لگا دیا گیا۔ مشتاق ملک سیکشن افسر تھے' وہ تلہ گنگ سے صوبائی وزیر سلیم اقبال ملک کے داماد ہیں' وہ مرکز سے پنجاب حکومت میں گئے تھے اور ہمیشہ اچھے عہدوں پر رہے ہیں جس دور میں یونس خان فیڈرل سیکرٹری فنانس تھے' مشتاق ملک اس دور میں واشنگٹن میں تعینات ہوئے' ان دونوں کی شامیں اکٹھی گزرتی تھیں چنانچہ انہیں واشنگٹن سے آتے ہی گریڈ 22 اور اضافی پلاٹ دے دیا گیا اور انہیں ریٹائرمنٹ سے پہلے نگران حکومت کے عہد میں پیپرا کا چیئرمین لگا دیا گیا تاکہ وہ 65 سال کی عمر تک کام کرتے رہیں۔ پیپرا کے سابق چیئرمین افتخار رشید' مشتاق ملک' یونس خان اور کچھ اور اصحاب شام کو ہمیشہ اکٹھے ہوتے ہیں' یہ چند لوگوں کا گروپ ہے جو ایک دوسرے کو نوازتا رہتا ہے اس کے بعد خالد سعید کی باری آتی ہے' خالد سعید' شوکت عزیز کے پرنسپل سیکرٹری تھے' شوکت عزیز نے اقتدار سے جاتے جاتے ان کی تعیناتی ورلڈ بینک واشنگٹن میں کر دی' وہ جون میں واشنگٹن چلے جائیں گے لیکن نگران حکومت نے انہیں ریٹائرمنٹ سے دو ماہ قبل نیپرا کا چیئرمین لگا دیا تاکہ خدانخواستہ اگر وہ واشنگٹن نہیں جا پاتے تو وہ بھی 65 سال تک اتھارٹی (نیپرا) کے چیئرمین رہ سکیں' ان کی اس تقرری نے بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا' مسعود رضوی سیکرٹری کیبنٹ ڈویژن تھے' وہ فروری 2008ء میں ریٹائر ہوئے تو انہیں ایک سال کی توسیع دے دی گئی لیکن پھر انہیں فوراً ہی فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں تین سال کے لئے تعینات کر دیا گیا۔ یہ بھی نگران حکومت کے زمانے میں ہوا'' میرے نامعلوم اور خفیہ سیکرٹری نے اس کے بعد بے شمار دوسرے بیوروکریٹس اور سیکرٹریز کے نام بھی دیئے جنہیں شوکت عزیز اور نگران وزیراعظم محمد میاں سومرو جاتے جاتے نواز گئے لیکن اس مختصر سے کالم میں ان تمام حضرات کے نام نہیں لکھے جا سکتے چنانچہ میں باقی نام کسی اگلے کالم پر اٹھا رکھتا ہوں' اس خط کے آخر میں نامعلوم اور خفیہ سیکرٹری نے لکھا ''ایک طرف یہ لوگ ہیں جن کی گردن اور ہاتھ نے ہمیشہ حکمرانوں کے ہر حکم کی تائید کی اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے ملازمت کے دوران اپنی عزت نفس اور دیانتداری کو مقدم رکھا اور ریاست کو اربوں بلکہ کھربوں روپے کا فائدہ پہنچایا لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد ان لوگوں کے پاس بچوں کو دو وقت کی روٹی دینے اور پڑھانے کے لئے کچھ نہیں تھا اور جن کے پاس سوائے ایک پلاٹ کے کچھ نہیں ہوتا اور وہ پلاٹ بھی ہاؤسنگ فاؤنڈیشن انہیں عین بچتا ریٹائرمنٹ کے وقت دیتی ہے چنانچہ یہ لوگ آخری سانس تک کونے کھدروں میں پڑے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں' کیا وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اس ظلم پر توجہ دیں گے؟ کیا جناب آصف علی زرداری حکم دیں گے کہ آئندہ گریڈ بائیس کے ریٹائرڈ سرکاری ملازموں کو کسی ترتیب' کسی معیار اور کسی نظم و ضبط کے تحت ملازمتیں دی جائیں اور کیا جناب نواز شریف اس بات پر سٹینڈ لیں گے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمتیں دیانتداری' شہرت اور اثاثے دیکھ کر دی جائیں؟''۔

میرے نامعلوم اور خفیہ سیکرٹری کا خط یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے' مجھے نہیں معلوم ان کی بات یا مطالبہ کس حد تک درست ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں جرنیل ہو یا سیکرٹری ریٹائرمنٹ کے بعد نوکری اس کا استحقاق نہیں رہتا اور حکومت کو ریٹائرمنٹ کے بعد توسیع یا ری ایمپلائمنٹ پر پابندی لگا دینی چاہئے تاکہ بانس اور بانسری دونوں ختم ہو جائیں اور ملک آگے بڑھے کیونکہ جو بیوروکریٹ 60 برس میں ملک کے مقدر میں تارے نہیں ٹانک سکا وہ اگلے دو تین برسوں میں کیا توپ چلا لے گا۔

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی پاکستان پیپلز پارٹی‘ مسلم لیگ ن اور اے این پی کے مشترکہ وزیراعظم ہیں‘ وہ پاکستان کی تاریخ کے پہلے ”اتحادی“ وزیراعظم ہیں اور انہیں عوام کا بھرپور مینڈیٹ اور حمایت حاصل تھی‘ وہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اسٹیبلشمنٹ کو شکست دے کر ایوان اقتدار تک پہنچے تھے اور جب انہوں نے وزیراعظم کا حلف اٹھانے کے بعد پارلیمنٹ سے خطاب کیا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا ان کے لہجے میں عوام کی طاقت بول رہی ہے اور یہ طاقت عنقریب عوام اور ترقی کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو اڑا کر رکھ دے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ہمارے وزیراعظم کے منہ سے دلچسپ بیان نکلنا شروع ہو گئے‘ مثلاً 14 اپریل کو وزیراعظم نے ایک روزنامہ کو پینل کو انٹرویو دیا اور اس انٹرویو کے دوران جب وزیراعظم سے ڈاکٹر عبدالقدیر کی رہائی کے بارے میں پوچھا گیا تو وزیراعظم نے جواب دیا ”ڈاکٹر عبدالقدیر انتہائی قابل قدر شخصیت ہیں‘ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی شہید ذوالفقار علی بھٹو کی دعوت پر پاکستان آئے تھے اور انہوں نے نیوکلیئر پروگرام شروع کیا تھا‘ ہم ان کا دل سے احترام کرتے ہیں لیکن جہاں تک ان کی رہائی کا معاملہ ہے تو آپ یہ سوال ان سے پوچھیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر رکھا ہے“ وزیراعظم کا یہ بیان گو بہت سادہ اور سیدھا تھا لیکن اس بیان میں ایک ایسی سچائی چھپی ہوئی ہے جو اس ملک کے مسائل کی اصل جڑ ہے‘ یہ بیان ثابت کرتا ہے پاکستان میں کوئی ایسی طاقت بھی موجود ہے جو بڑے بڑے فیصلے کرتی ہے اور کسی شخص کو ان فیصلوں پر آنکھ اٹھانے‘ انگلی سے اشارہ کرنے اور منہ کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ شخص خواہ ملک کا ”اتحادی“ وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو؟ یہ طاقت کیا ہے؟ یہ ایک ان دیکھی طاقت ہے اور آج تک کوئی جمہوری حکومت اس ان دیکھی طاقت کا ماخذ معلوم نہیں کر سکی‘ دنیا میں قانون‘ ملک اور معاشروں کی تمام تر طاقت اور قوت عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے‘ آپ امریکہ کو لے لیجئے‘ امریکہ کی سی آئی اے کا بجٹ بھارت کے کل بجٹ کے برابر ہے‘ پینٹاگان کا بجٹ براعظم افریقہ کے تمام ممالک کے مجموعی بجٹ کے برابر ہے اور امریکی فوج کا بجٹ 507 بلین ڈالرز ہے‘ یہ کتنا بڑا بجٹ ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے مجموعی بجٹ کے ساتھ تقابل کر کے لگا لیجئے پاکستان کا سالانہ بجٹ 14 سے 15 بلین ڈالر ہوتا ہے لیکن امریکی فوج ہو‘ پینٹاگان ہو‘ سی آئی اے ہو یا ایف بی آئی یہ تمام ادارے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے صدر کے ماتحت ہوتے ہیں‘ ان اداروں کا مقدر امریکی کانگریس اور سینٹ کی قراردادوں سے وابستہ ہوتا ہے اور اگر آج کانگریس عراق اور افغانستان سے فوجیں واپس بلوانے کی قرارداد پاس کر دے تو امریکی فوجیں کل سان فرانسسکو پہنچ جائیں گی جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کے 16 کروڑ لوگ ڈاکٹر عبدالقدیر کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں مگر وہ 1522 دنوں سے کسی مقدمے اور کسی عدالتی کارروائی کے بغیر نظربند ہیں اور پاکستان کا کوئی ادارہ انہیں رہا نہیں کرا سکتا یہاں تک کہ وزیراعظم اور 342 ارکان کی پارلیمنٹ بھی اس معاملے میں بے بس ہیں! کوئی ان دیکھی طاقت ہے جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر کے گھر کے سامنے ایک نہ نظر آنے والا حصار کھینچ رکھا ہے اور یہ حصار اس قدر مضبوط ہے کہ جمہوری نمائندوں کے تمام اختیارات یہاں پہنچ کر دم توڑ جاتے ہیں‘ آپ ججوں کا ایشو بھی لے لیجئے‘ دنیا کے تمام قانونی ماہرین 3 نومبر 2007ء کے فیصلے کو غیر قانونی‘ غیر آئینی اور غیر اخلاقی قرار دے چکے ہیں‘ پاکستان کے عوام نے 18 فروری 2008ء کو پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کو معطل ججوں کے نام پر ووٹ دیئے جس سے ثابت ہو گیا صدر پرویز مشرف کے تمام اقدامات غلط تھے اور عوام ان اقدامات کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں‘ عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والے نمائندے پارلیمنٹ میں آئے‘ انہوں نے تقریریں بھی کیں اور آج قریباً ڈیڑھ ماہ ہو چکے ہیں لیکن ہماری سیاسی قیادت ججوں کو بحال نہیں کر سکی‘ پاکستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے 9 مارچ کو اعلان مری بھی کیا تھا‘ آج اس اعلان کو بھی 42 دن گزر چکے ہیں لیکن اس کی عملی صورت ابھی تک سامنے نہیں آئی‘ آپ عجیب اور دلچسپ بات ملاحظہ کیجئے صدر پرویز مشرف نے بااصول اور سچی عدلیہ کو فارغ کرتے ہوئے دس منٹ لگائے تھے لیکن پورا ملک‘ تمام بااختیار اور برسراقتدار سیاستدان مل کر اس سچی اور بااصول عدلیہ کو بحال نہیں کر سکتے‘ کیوں؟ کیونکہ اس بحالی کے راستے میں بھی کوئی ان دیکھی طاقت رکاوٹ بن کر کھڑی ہے۔

یہ ان دیکھی طاقت کیا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں جو اس ملک کا قبلہ درست نہیں ہونے دے رہے؟ اس کے بارے میں آج تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا لیکن ایک چیز طے ہے اس ملک میں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں‘ آپ طارق عزیزالدین کے مسئلے کو ہی لے لیجئے‘ طارق عزیزالدین افغانستان میں پاکستان کے سفیر ہیں‘ وہ گیارہ فروری کو کابل جاتے ہوئے راستے میں جمرود میں اغواء ہوئے‘ اغواء کرنے والوں نے انہیں آگے بیچ دیا اور دوسری پارٹی نے انہیں افغانستان کے طالبان کے حوالے کر دیا لیکن حکومت نے کسی جگہ مداخلت نہ کی‘ آج ہمارے سفیر کو غائب

انہیں افغانستان کے طالبان کے حوالے کر دیا لیکن حکومت نے کسی جگہ مداخلت نہ کی' آج ہمارے سفیر کو غائب
ہوئے دو ماہ 15 دن ہو چکے ہیں لیکن حکومت انہیں رہا کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی' حکومت سے جب اس
بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ ہاتھ ہلاتی ہے اور کہتی ہے "ان سے پوچھیں جو اس مسئلے کو حل کرانے میں ناکام
ہیں" حکومتی عہدیداروں سے جب پوچھا جاتا ہے "وہ کون ہیں" تو وہ دائیں بائیں دیکھنے لگتے ہیں' مجھے پچھلے دنوں
ایک سابق سیکرٹری خارجہ نے بتایا تھا' انہوں نے موجودہ سیکرٹری خارجہ ریاض محمد خان سے طارق عزیزالدین
کے بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے قسم کھا کر جواب دیا تھا "مجھے نہیں معلوم طارق عزیزالدین کس کی قید میں
ہے اور اس کی رہائی کیلئے کون مذاکرات کر رہا ہے" آپ اس معاملے پر حکومت یا ریاست کی غیر سنجیدگی کا اندازہ
لگائیے وزارت خارجہ یہ مسئلہ وزارت داخلہ کی طرف دھکیل دیتی ہے اور وزارت داخلہ فائل بنا کر کسی ان دیکھے
ہاتھ میں دے دیتی ہے' آپ حکومت کی رٹ کا اندازہ ڈیوڈ ملی بینڈ سے لگا لیجئے' برطانوی وزیر خارجہ اتوار کے دن
پاکستان کے دورے پر آئے' وہ اسلام آباد اترنے کی بجائے سیدھے پشاور گئے' انہوں نے صوبائی حکومت اور
قبائلی عمائدین سے ملاقاتیں کیں اور اس کے بعد اسلام آباد آئے اور وفاقی حکومت سے ملے' کیا دنیا کے کسی ملک
میں ایسا ہوتا ہے؟ کیا ہمارے وزیر خارجہ کابل اترے بغیر' صدر حامد کرزئی اور افغان وزیر خارجہ سے ملے بغیر
ہرات یا قندھار جا سکتے ہیں' کیا پاکستان کے وزیر خارجہ ممبئی' چنائی یا مدراس میں صوبائی حکومت کے عہدیداروں
سے ملاقات کے بعد دہلی آ سکتے ہیں اور کیا بھارتی حکومت انہیں اس جسارت کی اجازت دے گی؟ ہرگز ہرگز نہیں
لیکن کیونکہ پاکستان میں اس وقت کوئی حکومت ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کی کوئی رٹ نہیں چنانچہ باہر کی طاقتیں
بھی اب براہ راست سودے بازی پر اتر آئی ہیں' آپ گھروں سے غائب لوگوں کا کیس دیکھ لیجئے' اس ملک میں اس
وقت 521 لوگ گھروں سے غائب ہیں' پاکستان کی حکومت کے ایک ایک عہدیدار کو معلوم ہے یہ لوگ کہاں
ہیں' میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری ان جیلوں تک سے واقف ہیں جن میں یہ لوگ بند ہیں لیکن
حکومت میں ان لوگوں کو چھڑانے کا دم نہیں' حکومت' پارلیمنٹ اور عدالت ان بے گناہ اور مظلوم لوگوں کو
انصاف نہیں دے سکتی' کیوں؟ کیونکہ ان مظلوم لوگوں کے راستے میں بھی کوئی ان دیکھی طاقت حائل ہے اور اگر
ہم نے اس ان دیکھی طاقت کو قانون اور ضابطے کی شکل نہ دی تو یہ ان دیکھی طاقت اس پورے ملک کو نگل جائے
گی' ملکوں کو قانون اور ضابطوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک انہیں مضبوط ضابطے اور ناقابل شکست قانون
نہیں ملتا اس وقت تک وہ اپنی بقاء کے فیز سے باہر نہیں آتے اور ان دیکھی طاقتیں اس ملک میں قانون اور ضابطے
نہیں بننے دے رہیں۔

مین سوئچ

ایم آر نجمی کا تعلق انصاف اور قانون کے شعبے سے ہے' وہ وفاقی شرعی عدالت میں رجسٹرار ہیں اور پچھلے کئی برسوں سے میرے ساتھ رابطے میں ہیں' نجمی صاحب سے ایک دو ہفتوں میں ملاقات نہ ہو تو ٹیلی فون پر بات چیت ضرور ہو جاتی ہے' وہ قانونی اور سماجی معاملات میں اکثر میری رہنمائی فرماتے رہتے ہیں۔ آپ اگر شاہراہ دستور پر سفر کریں تو آپ کو سپریم کورٹ کی عمارت کے سامنے ایک خوبصورت بلڈنگ دکھائی دیتی ہے' یہ بلڈنگ وفاقی شرعی عدالت ہے اور یہ عمارت نجمی صاحب نے اپنی نگرانی میں بنوائی تھی۔ وفاقی شرعی عدالت میں اس وقت 35 ائیر کنڈیشنر نصب ہیں' یہ ائیر کنڈیشنر جج حضرات کے دفاتر اور ریٹائرنگ رومز کے "اے سیز" کے علاوہ ہیں' یہ ائیر کنڈیشنر ایڈمنسٹریشن' کلریکل سٹاف اور لائبریری میں نصب ہیں اور اوسطاً روزانہ دس گھنٹے چلتے ہیں۔ نجمی صاحب نے تین دن قبل یہ 35 ائیر کنڈیشنر بند کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ نجمی صاحب کا خیال ہے پاکستان توانائی کے شدید بحران کا شکار ہے' اسلام آباد' راولپنڈی' لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں دس دس گھنٹے بجلی بند رہتی ہے جبکہ دور دراز علاقوں' مضافات اور دیہات میں بجلی کی آمد کسی انقلاب سے کم نہیں' لوگ بجلی کے بحران کی وجہ سے خودکشیوں پر مجبور ہیں' لاہور اور ملتان میں لوڈ شیڈنگ کے مسئلے پر فسادات تک ہو چکے ہیں جبکہ اس کے برعکس سرکاری دفاتر اور عمارات میں دس دس' پندرہ پندرہ گھنٹے پچاس پچاس ائیر کنڈیشنر چلتے رہتے ہیں اور دن رات کروڑوں بلب روشن رہتے ہیں' یہ اس ملک کے غریب عوام کے ساتھ سیدھا سادا ظلم ہے چنانچہ نجمی صاحب نے وفاقی شرعی عدالت کے تمام ائیر کنڈیشنر بند کرنے کا حکم دے دیا۔ نجمی صاحب کا خیال ہے وہ انتظامی بلاک میں ائیر کنڈیشنر کی بندش کے بعد اب جج صاحبان سے بھی بجلی کی کفایت شعاری کی درخواست کریں گے' وہ ان سے عرض کریں گے "جناب آپ بھی پنکھے کی ہوا میں فیصلے کر لیا کریں"' نجمی صاحب کا خیال ہے وہ جج صاحبان کو اس بات پر قائل کر لیں گے۔

میں نے نجمی صاحب کے اس فیصلے کے بارے میں سنا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی' پاکستان میں حکومت بجلی کی سب سے بڑی خریدار ہے' ملک کے تمام سرکاری دفاتر اور عمارات میں بجلی خرچ ہوتی ہے اور اس کیلئے کسی قسم کا کوئی ضابطہ اخلاق موجود نہیں' ملک کے 90 فیصد سرکاری دفتروں میں ائیر کنڈیشنر اور بجلی کے ہیٹر نصب ہیں' صاحب حضرات دس بجے دفتر پہنچیں یا ایک بجے آئیں ان کا ائیر کنڈیشنر یا ہیٹر سات یا آٹھ بجے آن ہو جاتا ہے' ہمارے افسروں کی حالت یہ ہے وہ جب دفتر سے اٹھنے لگتے ہیں تو ان کے ڈرائیور آدھ گھنٹہ قبل گاڑی سٹارٹ کرتے ہیں اور گاڑی کا "اے سی" آن کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے صاحب یخ بستہ دفتر سے نکلتے ہیں تو وہ ٹھنڈی ٹھار گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں اور جب صاحب کی گاڑی دفتر سے روانہ ہوتی ہے تو گھر کا ملازم ان کے ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم اور بیڈ روم کا اے سی چلا دیتا ہے لہٰذا جب صاحب گھر میں قدم رکھتے ہیں تو ان کا گھر بھی سائبیریا کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ اس ملک کی 90 فیصد آبادی گرمیوں کی تپتی راتیں مچھر مار مار کر گزارتی ہے جبکہ دس فیصد لوگ جون اور جولائی میں رضائی لے کر سوتے ہیں اور ان دس فیصد لوگوں میں اکثریت ہمارے سرکاری افسروں کی ہوتی ہے' آپ اسمبلیوں' وزراء کے دفاتر' چیف منسٹر ہاؤسز اور گورنر ہاؤسز ہی کو لے لیجئے' پاکستان کے تمام ہاؤسز اور وزراء کے دفاتر میں چوبیس گھنٹے ائیر کنڈیشنر چلتے ہیں' پاکستان کا سب سے بڑا ائیر کنڈیشن پلانٹ پارلیمنٹ ہاؤس میں نصب ہے اور ملک میں سب سے زیادہ بلب بھی اسی عمارت میں لگے ہیں' پارلیمنٹ ہاؤس کے ائیر کنڈیشن کی صورتحال یہ ہے کہ اگر عمارت کے کسی ایک کمیٹی روم میں اجلاس ہو رہا ہو تو پوری عمارت کا ائیر کنڈیشن پلانٹ چلایا جاتا ہے اور ساری عمارت کی روشنیاں جلائی جاتی ہیں' ایوان صدر' وزیراعظم سیکرٹریٹ اور وزیراعظم ہاؤس کے ائیر کنڈیشنر بھی سال کے 8 ماہ چوبیس گھنٹے چلتے ہیں اور ماہانہ کروڑوں روپے کی بجلی پھونکتے ہیں' آپ چاروں صوبائی اسمبلیوں کا جائزہ بھی لے لیں' ان کے اے سی بھی دیکھ لیں' آپ کسی وزیر' سیکرٹری' ایڈیشنل سیکرٹری یا جوائنٹ سیکرٹری کے دفتر میں چلے جائیں' آپ کو اس کا ٹمپریچر دس اور پندرہ ڈگری کے درمیان ملے گا' ملک میں جب سے لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ شروع ہوا ہے' اس وقت سے سرکاری اداروں نے جنریٹر بھی خریدنا شروع کر دیئے ہیں چنانچہ جوں ہی بجلی جاتی ہے تو یہ دفاتر اور ان کے ائیر کنڈیشنر جنریٹر اور یو پی ایس پر شفٹ ہو جاتے ہیں اور یوں صاحب لوگوں کو عوام کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا' یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے ان دفاتر میں کون لوگ بیٹھے ہیں' اسمبلیوں' ایوان صدر' وزیراعظم ہاؤس' چیف منسٹر ہاؤس اور گورنر ہاؤس میں کون متمکن ہے؟ کیا یہ لوگ عوامی نمائندے نہیں ہیں؟ اور اگر یہ عوامی نمائندے ہیں تو کیا ان کا رویہ یہ ہونا چاہیے؟ ایک طرف پورا

ملک لوڈ شیڈنگ کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے' لوگ ہاتھ کے پنکھے ہلا ہلا کر راتیں گزار رہے ہیں اور دوسری طرف واپڈا سابق وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی کی رہائش گاہ کو لوڈ شیڈنگ فری قرار دیتا ہے اور انہیں مختلف گرڈ سٹیشنوں سے بجلی فراہم کر دی جاتی ہے' پاکستان کے تمام شہر اور قصبے گرمی اور اندھیرے میں پھنسے ہوئے ہیں جبکہ ایوان صدر' وزیراعظم ہاؤس اور پارلیمنٹ ہاؤس کی ساری بتیاں اور ائیر کنڈیشنر آن ہیں اور عوام کے منتخب نمائندے روشنی اور ٹھنڈک میں بیٹھ کر عوام کے مسائل پر کڑھتے رہتے ہیں' کیا حکمرانوں اور بیورو کریٹس کے اس رویے کو مثبت اور انسانی قرار دیا جاسکتا ہے! یہ آج کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے!

میرا خیال ہے ہمارے حکمرانوں' سیاستدانوں اور بیورو کریٹس کو ایک دو برس کیلئے ائیر کنڈیشن اور ہیٹر کی قربانی دینی چاہیے' یہ لوگ اسی ملک میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والدین کا تعلق بھی چوہڑ کانے' میانوالی یا ڈونگا بونگا سے تھا' یہ لوگ سکاٹ لینڈ یا مانٹریال میں پیدا نہیں ہوئے' ان کے والد صاحب اور ان کا بچپن کسی نہ کسی بیری کے نیچے لیٹ کر ہاتھ کا پنکھا ہلاتے گزرا ہے اور جب یہ لوگ آج سے دس بیس تیس برس قبل اے سی کے بغیر زندگی گزار سکتے تھے تو آج کیا قیامت آگئی ہے؟ یہ لوگ ووٹ حاصل کرنے کیلئے جیکب آباد تک جاسکتے ہیں اور تپتی دوپہروں میں گاؤں گاؤں دھکے کھا سکتے ہیں تو یہ اے سی کے بغیر اپنے دفتر میں کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ یہ اے سی کے بغیر اسمبلیوں میں قراردادیں پیش کیوں نہیں کر سکتے' یہ لوگ طالب علمی کا دور' اپنی ملازمتوں کے ابتدائی ایام اور اپنی جوانی گرمیوں کی گرم دوپہروں میں جھلس کر گزار سکتے ہیں تو آج کیا قیامت آگئی؟' یہ لوگ آج ائیر کنڈیشن کے بغیر گزارہ کیوں نہیں کر سکتے؟ میرا خیال ہے پوری حکومت کو ایم آر نجمی کی روایت کا پاس کرنا چاہیے اور سرکاری سطح پر ایک دو برسوں کیلئے اے سی کے استعمال پر پابندی لگا دینی چاہیے' تمام عدالتوں' تمام سرکاری دفاتر' وزراء کے دفاتر' سرکاری رہائش گاہوں' اسمبلیوں' سیکرٹریٹ' چیف منسٹر ہاؤسز' گورنر ہاؤسز' وزیراعظم ہاؤس' ایوان صدر اور پارلیمنٹ ہاؤس کے اے سی بند کر دینے چاہئیں اور جب تک ملک بجلی کے بحران سے باہر نہیں نکلتا اس وقت تک کفایت شعاری کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے' حکومت کو پرائیویٹ سطح پر بھی ائیر کنڈیشنر کے استعمال کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے؟ حکومت دو سال کیلئے قانون بنا دے جو شہری اے سی استعمال کرنا چاہے وہ اس کیلئے جنریٹر کا بندوبست کرے اور واپڈا کی عام لائنوں پر اے سی کا لوڈ نہ ڈالا جائے' اسی طرح اگر سردیوں میں بھی بجلی کے ہیٹر کا استعمال دو تین برسوں کیلئے ممنوع کر دیا جائے تو یقیناً اس سے بجلی کے بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے' حکومت سرکاری دفاتر میں غیر ضروری روشنی پر بھی پابندی لگا دے' دفتروں اور سرکاری رہائش گاہوں میں صرف ضرورت کے مطابق بلب جلائے جائیں' اس سلسلے میں سرکاری دفتروں کیلئے بجلی کا کوٹہ بھی طے کیا جاسکتا ہے اور جونہی کسی دفتر کی بجلی کا بل مقررہ کوٹہ سے اوپر جائے تو اس کی بجلی کٹ جائے اور ذمہ دار افسروں یا اہلکاروں کے خلاف کارروائی کی جائے۔

مجھے یقین ہے افتخار محمد چودھری اور ان کے ساتھی جج آئندہ چند دنوں میں بحال ہونے والے ہیں' اگر افتخار محمد چودھری عوامی بہبود کو سامنے رکھتے ہوئے سرکاری دفتروں میں اے سی کے استعمال پر پابندی لگادیں تو اس سے عوام میں عدلیہ کا وقار بھی بلند ہوگا اور لوگوں کو ریلیف بھی مل جائے گا' بہرحال یہ فیصلہ عدالت کرے یا حکومت یہ اس ملک کی بقاء کیلئے ضروری ہے' بجلی کے معاملے میں کہا جاتا ہے جب بجلی کی تار پر ایک حد سے زائد لوڈ پڑتا ہے تو مین سوئچ کا فیوز اڑ جاتا ہے یا پھر تار جل جاتی ہے اور اس کے بعد پورا محلہ اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے' ہم نے بھی اگر آج بجلی کی بچت کا فیصلہ نہ کیا' اگر ہماری سرکاری مشینری نے بھی اپنی مراعات کی تھوڑی بہت قربانی نہ دی تو ہمارا مین سوئچ بھی اڑ جائے گا اور اس کے بعد ایوان صدر اور بشیرے کی جھگی برابر ہو جائے گی اور وزیراعظم صاحب بھی ہاتھ کا پنکھا لے کر بیری کے نیچے بیٹھے ہوں گے اور عوام بھی کرتا اٹھا اٹھا کر اپنے پیٹ کو ہوا دے رہے ہوں گے چنانچہ بہتر یہی ہے ہماری حکومت تھوڑی سی توجہ دے کر اس ملک کا مین سوئچ اڑنے سے بچالے۔

ہم اب آتے ہیں عوام کی طرف' دنیا کی سب سے بڑی طاقت عوام ہوتے ہیں' یہ ایک ایسی طاقت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے "زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھیں" شاید یہی وجہ تھی دنیا کے تمام مذاہب' تمام نظریات اور تمام انقلابات عوام سے اٹھے اور آہستہ آہستہ طبقہ اشرافیہ یا حکمران کلاس تک پہنچے' دنیا میں سچ وہ ہوتا ہے جسے عوام سچ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کسی بھی معاشرے میں تبدیلی کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ عوام ہوتے ہیں اور جب تک عوام متحرک نہیں ہوتے اس وقت تک معاشرے میں "چینج" نہیں آتی اور ہماری بدقسمتیوں میں سب سے بڑی بدقسمتی عوام کی بے حسی ہے' ہمارے عوام کا بہت بڑا طبقہ بے حس بھی ہے' نکما بھی اور خوش فہم بھی' آپ المیہ ملاحظہ کیجئے ہمارے لوگ تبدیلی' خوشحالی اور ترقی کیلئے پچھلے ساٹھ برس سے حکومت کی طرف دیکھ رہے ہیں' ملک میں جب بھی کوئی نئی حکومت بنتی ہے تو لوگ اس کے ساتھ اپنی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں' سال چھ ماہ تک ان کی توقعات کی فصل لہلہاتی رہتی ہے لیکن پھر اچانک انہیں محسوس ہوتا ہے اس حکومت اور پچھلی حکومت میں کوئی فرق نہیں تھا چنانچہ یہ لوگ حکومت کو گالیاں دیتے ہیں' اس کے خلاف نعرے لگاتے ہیں' جلوس نکالتے ہیں اور سجدوں میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے "حکمرانوں سے جان چھڑا" کی دعائیں کرتے ہیں' حکومت اس دوران اپنی طبعی اور غیر طبعی عمر پوری کر لیتی ہے اور ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان' ذوالفقار علی بھٹو کی جگہ جنرل ضیاء الحق' بے نظیر بھٹو کی جگہ نواز شریف اور صدر پرویز مشرف کی جگہ یوسف رضا گیلانی آ جاتے ہیں اور لوگوں کی توقعات ایک کوٹ سے نکل کر دوسری شیروانی میں چلی جاتی ہیں لیکن ان کے مسائل اسی جگہ قائم رہتے ہیں۔

آپ پاکستان کے مسائل کی تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے' پاکستان میں مہنگائی ایوب خان کے دور میں بھی تھی' مہنگائی آج یوسف رضا گیلانی کی حکومت میں بھی ہے' بے روزگاری' جہالت' لوڈ شیڈنگ' بدامنی' بے انصافی اور لاقانونیت ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی تھی اور یہ مسائل آج بھی ہیں' آٹا' دالیں' چاول' گھی اور پٹرول سابق ادوار میں بھی ناپید تھا اور یہ آج بھی نہیں مل رہا چنانچہ اگر دیکھا جائے تو پچھلے ادوار اور آج کے دور میں کوئی فرق نہیں' کل بھی کوئی تبدیلی نہیں تھی اور آج بھی معاشرے میں کوئی فرق نہیں آیا' ہم ہمیشہ اس معاملے میں حکومت اور حکمرانوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھول جاتے ہیں اگر صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ایک ہزار ارکان' چار ہزار 9 سو گیارہ سیاستدان' ایک سو اکیس وزیر اور تین ہزار اعلیٰ سرکاری افسر اس ملک کا مقدر نہیں بدل سکے تو اس ملک کے 16 کروڑ عوام نے بھی بے روزگاری' مہنگائی' غربت' تعلیم' صحت' صفائی' انصاف اور امن وامان کیلئے کچھ نہیں کیا؟ ہمارے عوام نے تو آج تک اپنے سر کی جوئیں تک نکالنے کی ہمت نہیں کی' یہ 16 کروڑ لوگ تو منہ دھلانے' مسواک کرنے اور دروازے پر پڑی کچرے کی ٹوکری تک اٹھانے کیلئے حکومت کا انتظار کرتے ہیں' دنیا میں حقوق اور فرائض میں فرض قانون کا درجہ رکھتا ہے اور جو شخص اپنا فرض ادا نہیں کرتا اسے حق مانگنے کا "حق" حاصل نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے ہمارے 16 کروڑ عوام اپنے فرائض تو ادا کر نہیں رہے اور حق مانگنے میں پیش پیش ہیں' ہمارے 16 کروڑ لوگ خاموشی سے گھر بیٹھے ہیں' خودکشیاں کرنے والوں کے جنازے پڑھ رہے ہیں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ ہمارے حالات تبدیل کیوں نہیں ہو رہے؟ ہم یہ بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس قوم (یعنی پورا ملک) کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت نہیں بدلتی۔

ہمارے عوام کیا کر سکتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب میں ہماری خوشحالی' ترقی اور تبدیلی چھپی ہے! میرے مہربانو! اس ملک میں 16 کروڑ لوگ ہیں' ان 16 کروڑ لوگوں میں 8 کروڑ خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جبکہ باقی 8 کروڑ لوئر مڈل کلاس' مڈل کلاس اور اپر کلاس میں شمار ہوتے ہیں' ہم اگر ان 8 کروڑ لوگوں میں سے لوئر مڈل کلاس کے تین کروڑ لوگوں کو نکال دیں تو پیچھے مڈل کلاس اور اپر کلاس کے 5 کروڑ لوگ رہ جاتے ہیں' یہ پانچ کروڑ لوگ خوشحال بھی ہیں' خود مختار بھی' تعلیم یافتہ بھی اور وژنری بھی لہٰذا اگر یہ لوگ متحرک ہو جائیں' یہ لوگ اپنی ذمہ داری قبول کر لیں تو یہ پانچ کروڑ لوگ اس ملک میں خوشحالی' ترقی اور تبدیلی میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں اور دس سال میں یہ ملک کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے' یہ پانچ کروڑ کتنی بڑی طاقت ہیں اس کا اندازہ آپ 80 ہزار وکلاء سے لگا لیجئے' اس ملک میں 80 ہزار وکلاء ہیں' ان میں سے نصف وکلاء 9 مارچ 2007ء کو گھروں اور چیمبرز سے نکلے اور انہوں نے نہ صرف فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا بلکہ ملک کا سارا سیاسی نقشہ ہی تبدیل کر دیا' اگر یہ 40 ہزار وکلاء اتنی بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں تو ذرا سوچئے ملک کے 5 کروڑ خود مختار اور خوشحال عوام کیا

نہیں کر سکتے؟ اس ملک میں لگ بھگ دو کروڑ ریٹائرڈ اور بزرگ شہری ہیں' ان لوگوں کے پاس بچوں کو ڈرانے' دھمکانے' ڈانٹنے' فحاشی عریانی اور بداخلاقیوں کے شکوے کرنے اور اپنی جوانی کے قصے سنانے کے سوا کوئی کام نہیں' اگر یہ لوگ دس دس' پندرہ پندرہ کا گروپ بنائیں اور یہ گروپ کچی آبادیوں میں ایک ایک کمرے کا سکول بنا لیں اور بچوں کو مفت تعلیم دینا شروع کر دیں' ملک کے وہ تمام لوگ جن کی آمدنی چالیس ہزار روپے سے زائد ہے اگر وہ دس دس لوگوں کا گروپ بنائیں' یہ لوگ چار چار ہزار روپے ماہانہ ''کنٹری بیوٹ'' کریں اور ان چالیس ہزار روپوں سے یہ لوگ اپنے محلے میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری بنا لیں' دس اساتذہ ایک گروپ بنا لیں' ایک کمرہ کرائے پر لیں اور یہ اساتذہ شام کے وقت معاشرے کے ان بچوں کو مفت پڑھانا شروع کر دیں جو اچھی اور اعلیٰ تعلیم افورڈ نہیں کر سکتے' دس ڈاکٹر اپنا گروپ بنائیں اور شام کو روز کسی کچی آبادی' کسی گاؤں اور غریبوں کی کسی بستی میں جائیں اور لوگوں کا مفت معائنہ کریں' دس کھلاڑی گروپ بنائیں' یہ خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے طبقوں میں جائیں اور ان بچوں کو کھیلنے کا طریقہ سکھائیں' انجینئرز اپنے اپنے گروپ بنائیں اور محروم طبقوں کے بچوں کو فنی تربیت دیں' بیگمات گروپس بنائیں' صابن اور ٹوتھ پیسٹ خریدیں اور کچی بستیوں میں جا کر بچوں کو منہ دھونے اور پیسٹ کرنے کا طریقہ سکھائیں' کپڑے بیچنے والے تھان لیں' درزی لیں' کچی آبادیوں میں جائیں اور بچوں کو کپڑے سی دیں' زرعی ماہرین کے گروپس بنیں اور یہ گروپس چھوٹے کسانوں اور کچی آبادیوں کے لوگوں کو اپنی ضرورت کی سبزیاں اور پھل اگانے اور مرغیاں اور بکریاں پالنے کا طریقہ بتائیں' صنعت کاروں کے گروپس بنیں اور یہ گروپس کچی آبادیوں میں جاکر لوگوں کو چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگانے کی ترغیب دیں' ماہرین نفسیات گروپس بنائیں اور یہ گروپس کچی آبادیوں میں جاکر لوگوں کو آگے بڑھنے' ہمت جوان رکھنے اور زندگی کی خوبصورتیوں کے بارے میں لیکچر دیں' علماء کے گروپس بنیں' یہ گروپس کچی آبادیوں میں اپنے ڈیرے اور حجرے بنائیں اور وہاں بیٹھ کر لوگوں میں زندگی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور طالب علم اپنے گروپس بنائیں اور یہ گروپس غریب بستیوں میں جاکر بچوں کو پڑھائیں یا ان طالب علموں کو تعلیم دیں جو پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس وسائل نہیں ہیں تو ذرا سوچئے اس ملک میں کتنا بڑا انقلاب آ سکتا ہے' مجھے یقین ہے اگر ہماری سول سوسائٹی اس طرح متحرک ہو جائے' یہ لوگوں میں تحریک پیدا کرے تو شاید اس ملک میں کسی شخص کو خودکشی نہ کرنا پڑے' شاید لوگوں کے اندر زندگی کے رنگ اٹھنے اور دوڑنے لگیں اور یہ ملک ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچ جائے' مجھے رہ رہ کر محسوس ہوتا ہے اگر ہمارے ملک کے پانچ کروڑ لوگوں نے 11 کروڑ لوگوں کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھا' اگر پانچ کروڑ لوگوں نے آگے بڑھ کر ان گیارہ کروڑ لوگوں کا ہاتھ نہ تھاما تو اس ملک میں گیارہ کروڑ بچیں گے اور نہ ہی پانچ کروڑ۔

دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی حکومت ملک کو بنا سکی اور نہ ہی بچا سکی' یہ لوگ ہوتے ہیں' یہ عوام ہوتے ہیں جو ملکوں کو بناتے بھی ہیں اور بچاتے بھی ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے ملک کے عوام ہی بے حس ہیں' ان میں کوئی جان ہی نہیں چنانچہ ملک کیسے بنے گا' ملک کیسے بچے گا۔

حکومت کیا کرے

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اٹھنے لگے تو مرحومہ بشریٰ کی ساس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ان سے عرض کیا "میری ابھی تین بیٹیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں' ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں' ہمارا خاندان روزانہ سو روپے کماتا ہے' ہم تیس روپے کا گھی خریدتے ہیں اور چالیس روپے کا آٹا۔ آپ بتائیں ہم باقی زندگی کیسے بسر کریں گے" مرحومہ کے خاوند محمد رمضان کی والدہ نے وزیراعظم سے عرض کیا "بڑے صاحب! آپ مہنگائی کو توڑ دو ورنہ ہمارے دوسرے بچے بھی مر جائیں گے" وزیراعظم بوڑھی خاتون کی باتیں سن کر دنگ رہ گئے اور انہوں نے اسی وقت اس خاندان کو مکان فراہم کرنے اور سرکاری خرچ پر بچیوں کی شادی کرانے کا اعلان کر دیا' وزیراعظم نے اس خاندان کو دو لاکھ روپے کا چیک بھی پیش کیا' وزیراعظم اس کے بعد ایک کمرے کے اس مکان سے نکلے تو انہوں نے مکہ کالونی کی سڑک بنوانے اور آبادی کو دیگر سہولیات فراہم کرنے کا حکم بھی دیا۔ وزیراعظم ان تمام احکامات کے بعد مکہ کالونی سے رخصت ہو گئے لیکن وہ جاتے جاتے اپنے پیچھے بے شمار سوالوں کی گرد چھوڑ گئے۔

پاکستان میں اس وقت محمد رمضان اور بشریٰ جیسے 8 کروڑ لوگ ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا کے بڑے بڑے معیشت دان خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والی مخلوق کہتے ہیں لیکن یہ بے چارے ایسے لوگ ہیں جنہیں خط غربت کا پتہ ہے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہے یہ خط شروع کہاں سے ہوتا ہے اور ختم کہاں ہوتا ہے۔ پاکستان ایک ایسا بدقسمت ملک ہے جس میں چار کروڑ بیس لاکھ لوگوں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ کل کیلئے آٹا خرید سکیں' یہ لوگ روز مزدوری کیلئے نکلتے ہیں اور جس دن انہیں دو اڑھائی سو روپے کی دیہاڑی مل جاتی ہے یہ لوگ اس دن کا آٹا خرید لیتے ہیں بصورت دیگر یہ پانی کا پیالہ پی کر سو جاتے ہیں۔ ان چار کروڑ بیس لاکھ اور 8 کروڑ لوگوں میں نہ جانے کتنے لوگ بشریٰ اور محمد رمضان کی نفسیاتی کیفیت سے گزر رہے ہیں' ان میں کتنے لوگ ہوں گے جو سارا سارا دن ٹرین کے سامنے لیٹنے' پل سے چھلانگ لگانے اور زہر کھانے کی ترکیبیں سوچتے ہیں اور شام کو اپنے اس ارادے کو اگلے دن پر ملتوی کر دیتے ہیں۔ ہمارے وزیراعظم کتنے رمضانوں کے گھر جائیں گے' وہ کتنی بشراؤں کی تعزیت کریں گے' وہ کتنے محمد عارفوں کو مکان دیں گے اور وہ کتنے عاشق حسینوں کی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرائیں گے' یہ غربت نہ ختم ہونے والا ایک ایسا صحرا ہے جس پر ایک آدھ دن کی بارش کوئی نخلستان آباد نہیں کر پائے گی' اس کیلئے ہمیں ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے' اس کیلئے ہمیں اپنی ترجیحات کو ری شیپ کرنا ہو گا' ہمیں قومی سطح پر غربت کے ناسور' افلاس کے کینسر اور ناداری کی "ٹی بی" کا مقابلہ کرنا ہو گا اور پھر کہیں جا کر ہمیں منزل ملے گی۔ ہم تمام کالم نویسوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے ہم ایسے ڈاکٹر ہیں جو مرض کی تشخیص تو کر لیتے ہیں لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ یہ الزام بڑی حد تک درست ہے' بلاشبہ ہم ایسے سرجن ہیں جنہیں مریض کا پیٹ پھاڑنا تو آتا ہے لیکن ہم زخموں کو سینے کے ماہر نہیں ہیں چنانچہ ہم اکثر اوقات آپریشن کے بعد مریض کو آپریشن تھیٹر میں چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں لیکن میں آج یہ گلہ بھی دھو دینا چاہتا ہوں۔ میں آج سے ایک ایسی بحث کا آغاز کر رہا ہوں جس میں ہم پاکستان کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کریں گے' میں اپنے تمام قارئین کو دعوت دیتا ہوں اگر ان کے پاس پاکستان سے غربت ختم کرنے کا کوئی فارمولہ موجود ہے اور وہ محدود پیمانے پر یہ فارمولہ ٹیسٹ کر چکے ہیں اور اس ٹیسٹ کے مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں تو وہ اپنا یہ فارمولہ مجھے بھجوا دیں' میں ان کے فارمولے وقتاً فوقتاً اس کالم میں شائع کرتا رہوں گا' ہو سکتا ہے یہ فارمولہ ارباب اختیار تک پہنچ جائے' وہ اسے "پک" کر لیں اور یوں یہ ملک اس "ٹریک" پر آ جائے جس کے آخر میں روشنی کاشت ہوتی ہے۔

میں اس بحث کا آغاز کرتا ہوں' جناب وزیراعظم صاحب دنیا میں معیشت کے دو بڑے نظام ہیں' ایک ویسٹرن اکنامک سسٹم ہے اور دوسرا اسلامی نظام معیشت۔ ویسٹرن اکنامک سسٹم میں حکومتیں ملک میں بڑے بڑے منصوبے شروع کرتی ہیں' وہ موٹرویز بناتی ہیں' ملک میں صنعتوں اور میگا مالز کا جال بچھاتی ہیں' وہ بڑے بڑے بازار اور منڈیاں بناتی ہیں' بینک اور سرمایہ کاری کے ادارے قائم کئے جاتے ہیں اور جب ان اداروں میں معاشی سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں تو یہ سرگرمیاں پہلے ملک کے مراعات یافتہ طبقے تک پہنچتی ہیں اس کے بعد مڈل کلاس کے پاس آتی ہیں اور اس کے بعد خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ شوکت عزیز جیسے معیشت دان اس عمل کو "ٹریکل ڈاؤن" کہتے ہیں' معیشت کا یہ نظام اس وقت دنیا کے بے شمار ممالک میں کام کر رہا ہے اور کامیاب بھی ہے۔ اس نظام میں بے شمار خوبیاں ہیں لیکن اس میں دو انتہائی مہلک خرابیاں بھی ہیں' اس کی پہلی خرابی ٹریکل ڈاؤن ہے' اس نظام کو ٹریکل ڈاؤن ہونے کیلئے کم از کم تیس برس درکار ہوتے ہیں

اور یہ تیس برس بھی ایسے ہوں جن میں معیشت کا عمل دن رات جاری رہے' اس سسٹم میں ایک دن کا التواء اس کے ٹریکل ڈاؤن ایف کٹ کو چھ ماہ آگے لے جاتا ہے اور اس کی دوسری خرابی اس کی مادیت پرستی ہے' یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے سینے میں دل نہیں' یہ لوگوں کو مشین بنا دیتا ہے اور وہ کریڈٹ کارڈز' سود اور قسطوں کے ایک ایسے جال میں الجھ جاتے ہیں جس سے انہیں موت کے بعد ہی رہائی ملتی ہے لہٰذا یہ سسٹم ہمارے جیسے ملک کو سوٹ نہیں کرتا' اس کی بھی دو وجوہات ہیں' اول ہم مسلمان ہیں اور کوئی سودی نظام کسی مسلمان کو سوٹ نہیں کر سکتا' ہم جب کلمہ پڑھ لیتے ہیں تو ہم پر سود اور سودی نظام حرام ہو جاتا ہے چنانچہ یہ معیشت ہمیں سکون اور برکت نہیں دے پاتی' دنیا کی چودہ سو سال کی تاریخ میں آج تک کسی اسلامی ملک میں یہ نظام کامیاب نہیں ہو سکا اور اگر کبھی کسی اسلامی ملک نے اس نظام کے تحت کامیابی حاصل بھی کی تو یہ کامیابی عارضی تھی' معیشت کا دوسرا نظام اسلامی ہے' اسلامی نظام کے تین بڑے اصول ہیں' پہلا اصول خیرات ہے' اسلام میں مال کا وہ حصہ جو مومن کی ضرورت سے زائد ہوتا ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جاتا ہے گویا ایک گھر' ایک گاڑی' کپڑوں کے چار پانچ جوڑوں اور ماہانہ خرچ کے علاوہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ اور اس کے بندوں کی امانت ہے اور اگر ہم یہ مال ضرورت مندوں تک نہیں پہنچاتے تو ہم خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں' ہم اللہ تعالیٰ کے مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو وہ اپنے مجرموں کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسرا اصول' اصراف سے پرہیز ہے' اسلام فضول خرچی کے خلاف ہے' اگر اسلامی ریاست کا حکمران دوسرا بلب روشن کر دے' دوسری گاڑی استعمال کر لے' دو سو ایکڑ کا ایوان بنا لے یا ساٹھ ارکان کی کابینہ بنا لے تو یہ اسراف ہے اور اگر کوئی مسلمان تاجر' کوئی دکاندار' کوئی سرمایہ کار اور کوئی بیوروکریٹ اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ نمود و نمائش پر خرچ کر دے تو یہ بھی اسراف ہے اور وہ اللہ کا مجرم ہے اور اللہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو وہ امانت میں خیانت کرنے والے مسلمان کے ساتھ کرتا ہے۔ اسلام کا تیسرا اصول ترجیح ہے' یہ وہ اصول ہے جس سے اسلامی معاشروں میں تبدیلی آتی ہے' اسلام دنیا کا واحد نظام ہے جو محروموں' ناداروں' بے بسوں اور بے کسوں کو امراء پر ترجیح دیتا ہے' اسلام میں جو شخص جتنا محروم ہے اس شخص کو اتنی ہی فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے شائد یہی وجہ تھی حضرت عمرؓ اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اٹھا کر راتوں کو بھوکوں کے گھر جاتے تھے۔

اگر ہماری حکومت' اگر ہمارے وزیراعظم اس ملک کے محمد رمضانوں اور بشراؤں کو ترجیح اول بنا لیں' اگر ہم آج سے اپنی معیشت کا آغاز پاکستان کی کچی آبادیوں اور غریبوں سے شروع کریں تو یقین کیجئے چند ماہ میں ہمارے ملک میں برکت بھی آجائے گی اور سکون بھی۔ اللہ تعالیٰ غریب کے دل میں بستا ہے اور جب تک ہم غریب کے دل تک نہیں پہنچتے اس وقت تک ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور جب تک ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچیں گے اس وقت تک ہم پر اس کی برکت کے دروازے نہیں کھلیں گے اور جب تک کسی اسلامی ملک پر اللہ کی برکت کے دروازے نہیں کھلتے اس وقت تک وہ ملک خوشحال نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ فارمولہ اور یہی ہے وہ کام جو ہماری حکومت کو کرنا چاہئے۔

یہ ننھے منے سے ہاتھ ' پاؤں ' سر اور آنتیں تھیں ' لوگ جسموں کے ٹکڑے جمع کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے ' بشریٰ کے جسم کے ٹکڑے فاصلے پر تھے جبکہ زبیر اور صائمہ کے اعضاء پھاٹک کے قریب پڑے تھے ' یہ اعضاء بھی کیا تھے قیمے کا ڈھیر تھے اور لوگ اس قیمے کو ہاتھوں سے سمیٹ کر چادروں میں ڈال رہے تھے ' ان تینوں کے سر پٹڑی کے درمیان پڑے تھے اور ان کی آنکھیں کھلی تھیں ' شاید یہ آنکھیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہوں ' شاید ان آنکھوں میں اس وقت بھی روشنی ' رنگ اور سائے لہراتے ہوں اور یہ بچے ان چادروں اور جسموں کے ٹکڑے جمع کرتے ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہوں ' شاید یہ بچے ان لوگوں کی آوازیں اور ان کی سسکیاں بھی سن سکتے ہوں اور ایک دوسرے سے حیرت سے پوچھتے ہوں " دنیا کے لوگ صرف مُردوں کو سنجیدہ کیوں لیتے ہیں " نعشیں جمع کرنے والے چلتے چلتے " کانٹے " تک پہنچ گئے کانٹے کی دستی کے پاس دو چھوٹے سے سکول بیگ پڑے تھے ' لوگوں نے بیگ اٹھا کر دیکھے ' بیگوں پر تازہ لہو کے چھینٹے اور انسانی جسم کے لوتھڑے چپکے تھے ' ایک نوجوان نے بیگ کھول کر دیکھا ' بیگ سے پکی جماعت کا ایک میلا کچیلا قاعدہ نکلا ' قاعدے کے پہلے صفحے پر کاربن پینسل سے زبیر رمضان لکھا تھا ' نوجوان نے دوسرا بیگ بھی کھول کر دیکھا ' اس بیگ میں بھی ایک بوسیدہ قاعدہ تھا اور اس قاعدہ پر صائمہ کا نام لکھا تھا ' نوجوان نے یہ بیگ نعشوں کی چادر میں رکھ دیئے ' یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہو گئی ! یہ کہانی شروع کہاں سے ہوئی تھی ؟ جی ہاں ! اس کہانی کا پہلا آغاز بشریٰ اور رمضان تھے۔

محمد عارف گھوڑے شاہ باغبان پورہ میں سبزی بیچتا تھا ' وہ صبح سویرے کھوتی ریڑھی پر سبزی لادتا تھا اور سارا دن گلی محلوں میں ٹماٹر لو ' کدو لو کی آوازیں لگاتا تھا ' وہ کوچہ سعید میں دو مرلے کے مکان میں رہتا تھا ' اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ' عارف کے دونوں بیٹے " کاروبار " میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے ' بشریٰ ' محمد عارف کی بڑی بیٹی تھی ' یہ بچی آٹھ جماعت پاس تھی اور محمد عارف کے طبقے میں آٹھ جماعتیں اعلیٰ تعلیم سمجھی جاتی ہیں۔ محمد عارف نے 2000ء میں بشریٰ کی شادی محمد رمضان کے ساتھ کر دی ' محمد رمضان کا والد محمد عاشق دھوبی تھا ' محمد عاشق کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ' اس کا بڑا بیٹا محمد رمضان ویلڈنگ کا کام کرتا تھا ' دوسرے بیٹے محمد شان کی عمر پندرہ سال تھی ' وہ ٹافیوں کی فیکٹری میں کام کرتا تھا ' تیسرے بیٹے محمد آصف علی کی عمر 13 سال تھی اور وہ پلاسٹک کی جوتیاں بنانے کے کارخانے میں کام کرتا تھا ' بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی جبکہ دو بیٹیاں گھر بیٹھی تھیں۔ محمد رمضان اور بشریٰ کی شادی 2000ء میں ہوئی جس کے بعد محمد رمضان نے ٹھوکر نیاز بیگ کے چودھری ٹاؤن میں دو مرلے کا مکان کرائے پر لے لیا ' مکان کا کرایہ ' بجلی کا بل اور پانی کا خرچ ساڑھے تین ہزار روپے تھا ' رمضان کو ویلڈنگ کے کام میں روزانہ اڑھائی سو روپے ملتے تھے ' وہ چودھری ٹاؤن سے روز سیون اپ سٹاپ آتا تھا اور اس سفر کے دوران اس کے ماہانہ تین ساڑھے تین ہزار روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے 2003ء میں انہیں بیٹے کی نعمت سے نوازا ' بشریٰ نے اس کا نام زبیر رکھا ' 2005ء میں ان کے ہاں صائمہ پیدا ہوئی ' بشریٰ نے ایک دن رمضان کو مشورہ دیا " آپ کے آنے جانے میں وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور تین ساڑھے تین ہزار روپے بھی کیوں نہ ہم سیون اپ سٹاپ کے قریب کوئی مکان کرائے پر لے لیں " محمد رمضان کو تجویز اچھی لگی چنانچہ محمد رمضان نے مکہ کالونی میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ' اس کمرے کا کرایہ پندرہ سو روپے تھا ' یہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ 14 مارچ 2008ء کو اس کمرے میں شفٹ ہو گئے ' بشریٰ کے تین بڑے مسئلے تھے ' اول خاندانی غربت ' وہ چوتھی نسل سے غریب تھی ' اس کا والد غریب تھا ' اس کے والد کا والد اور اس کا والد بھی غریب تھا ' وہ جس خاندان میں بیاہ کر آئی تھی ' اس نے بھی کئی پشتوں سے غربت کے سوا کچھ نہیں دیکھا لہٰذا جب بشریٰ اپنے بچوں کو دیکھتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا اس نے اپنی خاندانی غربت کو " ایکس ٹینشن " دے دی ہے۔ دوم وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھی ' اس نے آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں اور آٹھ جماعتیں پاس لوگوں کی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں چنانچہ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کے دماغ میں امارت ' فراوانی اور آسودگی کے خواب تڑپنے لگتے تھے اور سوم وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی ' اس نے اپنے بچوں کیلئے ایک ایک سکول بیگ اور ایک ایک قاعدہ خرید لیا تھا ' وہ اپنے بچوں کو پڑھانے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس کے پاس بچوں کو سکول میں داخل کرانے کے وسائل نہیں تھے ' اس نے اس مسئلے کا بڑا دلچسپ حل تلاش کیا ' اس نے اپنی خالہ کے گھر کو سکول ڈکلیئر کر دیا ' اس کی خالہ دیبا والٹن کی بہار کالونی میں رہتی تھی ' بشریٰ روز صبح اپنے بچوں کو تیار کرتی ' ان کے کندھے پر بیگ رکھتی اور انہیں اپنی خالہ دیبا کے گھر چھوڑ آتی ' بچے خالہ دیبا کے گھر کو سکول

سمجھتے اور ایک دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر پڑھ لیتے اور اس کے بعد بشریٰ انہیں واپس گھر لے آتی' یہ جھوٹ موٹ کا سکول ان بچوں اور بشریٰ کا معمول تھا۔

12 اپریل کا دن بشریٰ کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا' اس دن نہ جانے کیوں بشریٰ کو محسوس ہوا' یہ جھوٹ موٹ کا سکول اس کے بچوں کا مقدر نہیں بدل سکے گا' زبیر ایک دو برس بعد باپ کے ساتھ ویلڈنگ کی دکان پر جا بیٹھے گا اور صائمہ کسی کے گھر میں جھاڑو پھیرنے کی ذمہ داری سنبھال لے گی' اس کے بچے بھی اپنی ماں کی طرح پراٹھے اور دہی کا خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو جائیں گے' بشریٰ کو محسوس ہوا غربت ایک ایسا وسیع سمندر ہے جس میں وہ اور اس کا خاندان تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور یہ تنکا بھی کسی دن سمندر کی تہہ میں بیٹھ جائے گا' اس رات اس کا خاوند واپس آیا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا' بشریٰ نے خاوند کو کھانا کھلایا اور اس کے بعد دیر تک اس کی ٹانگیں دباتی رہی' وہ دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے' صبح دس بجے رمضان کام پر چلا گیا' بشریٰ نے رمضان کیلئے کھانا پکایا' دونوں بچوں کو تیار کیا' ان کے سکول بیگ لئے' کمرے کو تالہ لگایا اور چابی مالک مکان کے حوالے کر کے کہا" رمضان آئے تو اسے کہنا کھانا کھا لے' میں خالہ کے گھر جا رہی ہوں" وہ بچوں کی انگلی پکڑ کر ریلوے پھاٹک پر آئی اور ریل کی پٹڑی پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگی' اس دوران جعفر ایکسپریس سیون اپ پھاٹک کے قریب پہنچ گئی' بشریٰ اٹھی' اس نے بچوں کے کندھوں پر سکول بیگ لٹکائے' انہیں اٹھا کر سینے سے لگایا اور ٹرین کے سامنے کود گئی' ٹرین نے ایک لمحے میں ان تینوں کے چیتھڑے اڑا دیئے' جسم تو ٹریک پر بکھر گئے لیکن سکول بیگ کانٹے کے دستے کے قریب جا گرے' رمضان نے آ کر یہ ٹکڑے دیکھے تو وہ بے ہوش ہو کر گر گیا' لوگ اسے اٹھا کر میو ہسپتال لے گئے' وہ ہوش میں آیا تو اس کے پاس بیوی اور بچوں کے جنازے تک پہنچنے کیلئے کرایہ نہیں تھا' وہ میو ہسپتال کے سامنے کھڑا ہو گیا' ایک رکشے والے نے ترس کھایا اور اسے سیون اپ سٹاپ پر چھوڑ گیا۔

بشریٰ کو خودکشی کئے ہوئے آج پانچ دن ہو چکے ہیں لیکن محمد رمضان کو اس کی خودکشی کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی' وہ اپنے رشتے داروں اور محلے والوں سے پوچھتا ہے "بشریٰ کو کیا غم تھا' اس کو کیا تکلیف تھی" لوگ یہ سن کر آنکھوں پر کپڑا رکھ لیتے ہیں' رمضان اور اس کے رشتے دار بہت بے وقوف ہیں' وہ یہ جانتے ہی نہیں غربت جب انتہا کو چھو لیتی ہے تو اس سے نجات کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ بچتا ہے اور اس طریقے کا نام موت ہے اور بشریٰ کو اس سچائی' اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا' بشریٰ جان گئی تھی یہ دنیا اس کے بچوں کو تعلیم' روٹی اور کپڑے نہیں دے سکتی چنانچہ اس دنیا کو چھوڑ دینے ہی میں اس کی عافیت ہے' بشریٰ اور اس کے بچے چلے گئے لیکن ان بچوں کے سکول بیگ اور مسلے کچلے قاعدے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان قاعدوں اور ان بیگوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہیں اور یہ چھینٹے اپنا قاتل تلاش کر رہے ہیں' بشریٰ اور اس کے بچوں کا قاتل کون ہے؟ یہ آج کے دن کا سب سے بڑا سوال ہے لیکن افسوس اس حکومت کے کسی وزیر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

اور آپ فرض کیجئے' آپ کا نام آصف علی زرداری ہے' آپ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے شریک چیئرمین ہیں اور ملک میں آپ کی حکومت ہے' آپ کو 9 اپریل کی شام معلوم ہوتا ہے کراچی سٹی کورٹ کے طاہر پلازے میں چھ لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا' آپ یہ خبر سنتے ہیں' اپنے میڈیا کو آرڈینیٹر کو اشارہ کرتے ہیں اور آپ کا مذمتی بیان تمام چینلز اور اخبارات میں شائع ہو جاتا ہے' آپ سمجھتے ہیں آپ کی ذمے داری پوری ہو گئی اور آپ فوری طور پر کسی دوسرے اہم کام میں مصروف ہو جاتے ہیں' 9 کے بعد دس اپریل آتی ہے اور دس کے بعد گیارہ' بارہ' تیرہ' چودہ اور پندرہ اپریل آ جاتی ہے اور آپ کی مصروفیات کے انبار میں کہیں یہ چھ نعشیں دفن ہو جاتی ہیں' آپ انہیں فراموش کر دیتے ہیں' فرض کیجئے آپ کا نام صدر پرویز مشرف ہے' آپ کو 9 اپریل کی شام چھ لوگوں کے ''ستی'' ہونے کی اطلاع ملتی ہے' آپ ٹیلی ویژن آن کرتے ہیں' لوگوں کو سڑکوں پر توڑ پھوڑ کرتے' عمارتوں سے دھواں اٹھتے' گاڑیاں جلتے اور لوگوں کو فائرنگ کرتے دیکھتے ہیں' آپ اپنے سٹاف کو مذمتی بیان جاری کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اور چین کے دورے پر چلے جاتے ہیں اور چین کی گارڈ آف آنر ''ری سی پشنز'' پریس بریفنگز اور سیمینارز میں یہ چھ نعشیں آپ کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں' فرض کیجئے آپ کا نام یوسف رضا گیلانی ہے اور آپ پاکستان کے وزیراعظم ہیں' آپ کے سامنے نو اپریل کی شام ایک فائل رکھی جاتی ہے' آپ فائل کھول کر دیکھتے ہیں' آپ کو معلوم ہوتا ہے نو اپریل کو شرپسندوں نے طاہر پلازے میں لوگوں کو کمروں میں بند کر کے آگ لگا دی اور اس واقعے میں چھ لوگ زندہ جل گئے' آپ افسوس سے ''چچ چچ چچ'' کرتے ہیں اور یہ فائل ''موسٹ امپارٹینٹ'' کی ٹرے میں رکھ دیتے ہیں' آپ سوچتے ہیں آپ کل دفتر آتے ہی اس پر ایک انکوائری کمیشن بٹھائیں گے اور مجرم کوئی بھی ہوں آپ انہیں قرار واقعی سزا دیں گے' آپ دوسرے دن دفتر آتے ہیں لیکن یہ آپ کا ایک مصروف ترین دن ہوتا ہے آپ اس دن فائل پر کارروائی کا حکم نہیں دے پاتے' تیسرا دن دوسرے دن سے بھی زیادہ مصروف ہوتا ہے اور اس سے اگلے دن قومی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے اور آپ وزیراعظم ہاؤس سے سیدھا پارلیمنٹ ہاؤس چلے جاتے ہیں' اس سے اگلے دن آپ کی چھٹی ہوتی ہے' آپ دفتر نہیں آتے اور اس سے اگلے دن یہ فائل غیر متعلقہ ہو چکی ہوتی ہے' آپ اسے ''موسٹ امپارٹینٹ'' کی ٹرے سے اٹھاتے ہیں' اس پر ''انٹیریئر منسٹری'' لکھتے ہیں اور ''آؤٹ'' کی ٹرے میں ڈال دیتے ہیں اور یوں آپ کا فرض ادا ہو گیا۔

آپ فرض کیجئے آپ کا نام میاں نواز شریف ہے اور آپ وفاقی حکومت کے سب سے بڑے اتحادی ہیں' آپ کو نو اپریل کی شام کراچی کے سانحے کی اطلاع ملتی ہے' آپ کو دکھ پہنچتا ہے لیکن ساتھ ہی آپ سوچتے ہیں ''اور مفاہمت کرو' ایم کیو ایم کے ساتھ'' آپ سمجھتے ہیں' یہ ایم کیو ایم کی طرف سے پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنی شرائط پر مفاہمت پر مجبور کرنے کی کوشش ہے' آپ اس واقعے کے نتائج کا اندازہ لگا کر خوش ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے میڈیا کو آرڈی نیٹر کو بیان جاری کرنے کی ہدایت کر دیتے ہیں' آپ فرض کیجئے آپ اسفندیار ولی ہیں یا مولانا فضل الرحمٰن ہیں' آپ کو اس واقعے کی اطلاع ملتی ہے' آپ تھوڑی دیر سوچتے ہیں اور اسے سندھ اور وفاق کا مسئلہ قرار دے کر خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' آپ کا نام عمران خان ہے' آپ قاضی حسین احمد اور محمود اچکزئی ہیں' آپ یہ واقعہ سنتے ہیں' دیکھتے ہیں' آپ کو بے انتہا افسوس ہوتا ہے' آپ سوچتے ہیں' آپ کو پریس کانفرنس کرنی چاہیے' آپ کو اس سانحے پر ملک گیر ریلی نکالنی چاہیے لیکن ساتھ ہی آپ یہ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیتے ہیں کہ حکومت کو ابھی محض پندرہ دن ہوئے ہیں اور پندرہ دنوں بعد حکومت کے خلاف ریلی غیر سیاسی محسوس ہو گی اور یوں آپ تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں' آپ کا نام چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی ہے اور ملک کی پوری اپوزیشن کا بوجھ آپ کے نازک کندھوں پر ہے' آپ اسی واقعے کو چھکا سمجھتے ہیں لیکن آپ ساتھ ہی یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ آپ کے احتجاج کی لپیٹ میں ایم کیو ایم آ جائے گی اور آپ سر دست ایم کیو ایم کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتے چنانچہ آپ ایک گول مول بیان جاری کرتے ہیں اور بلٹ پروف گاڑیوں کے بارے میں پریس کانفرنس میں مصروف ہو جاتے ہیں اور فرض کیجئے' آپ اس ملک کے ایک لاکھ وکلاء ہیں' آپ اس ملک کے تین لاکھ تیس ہزار دو سو نو ڈاکٹر ہیں' آپ اس ملک کے پانچ لاکھ بائیس ہزار چار سو بارہ انجینئر ہیں' آپ اس ملک کے ایک کروڑ سرکاری ملازم ہیں' آپ اس ملک کے 25 لاکھ کلرک ہیں' آپ اس ملک کے گیارہ لاکھ سرکاری اور پرائیویٹ استاد ہیں' آپ اس ملک کے ساڑھے چار کروڑ نوجوان ہیں' آپ اس

ملک کے 20 لاکھ تاجر' سوداگر' صنعت کار اور دکاندار ہیں اور آپ اس ملک کے غریب اور نیک عوام ہیں اور آپ کو 9 اپریل کے سانحے کی اطلاع ملی' آپ اس وقت چائے پی رہے تھے اور آپ نے صدمے کے عالم میں چائے زمین پر انڈیل دی اور آپ بڑی دیر تک دکھی رہے لیکن پھر آپ کے گاہک آگئے' آپ کی ٹیوشن کا وقت ہو گیا' آپ فٹ بال' ہاکی یا بیٹ لے کر گراؤنڈ میں چلے گئے' آپ کی کلاس شروع ہو گئی' آپ کو صاحب نے بلا لیا اور آپ فائل اٹھا کر اندر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے' آپ سائیٹ کی انسپکشن کیلئے نکل گئے' آپ مریضوں میں مصروف ہو گئے اور آپ کی بار کا اجلاس شروع ہو گیا چنانچہ آپ مصروف ہوئے اور یہ چھ نعشیں آپ کی مصروفیت تلے دب گئیں اور فرض کیجئے آپ کا تعلق فوج کے ساتھ ہے' آپ فوج کے نان کمیشنڈ افسر ہیں' آپ لیفٹیننٹ' کیپٹن' میجر' کرنل' بریگیڈیئر یا جنرل ہیں' آپ کو نو اپریل کے سانحے کی اطلاع ملی' آپ کے دماغ میں آگ سی لگ گئی اور آپ نے فوراً اعلان کیا "اگر میرا بس چلے تو میں ان سب کو آدھ گھنٹے میں سیدھا کر دوں" آپ اس کے بعد دیر تک "انہیں" سیدھا کرنے کی پلاننگ کرتے رہے لیکن پھر آپ کی چھٹی کا وقت ہو گیا' آپ یونٹ سے نکلے اور بیوی بچوں کے بکھیڑوں میں پڑ گئے اور یوں پندرہ اپریل کا دن آ گیا اور فرض کیجئے آپ اس ملک کی عدلیہ ہیں' آپ کو نو اپریل کی شام اس سانحے کی اطلاع ملی' آپ نے ٹی وی بند کیا اور آپ نے سوچا' ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تو چند دنوں میں فارغ ہونے والے ہیں' آپ نے چینل تبدیل کیا اور غصے سے فرمایا ہم تو معطل ہیں' کاش ہم آج بحال ہوتے تو ہم کراچی کی ساری انتظامیہ کو صبح عدالت میں طلب کر لیتے۔

یہ ہیں ہم اور یہ ہے ہماری انسانیت' ہمارا ضمیر اور ہمارا احساس' آج اس واقعے کو چھ دن گزر چکے ہیں لیکن پاکستان کے کسی طبقے' کسی گروہ اور کسی ادارے کا ضمیر نہیں جاگا' پاکستان کے کسی صاحب نے کراچی کی ان نعشوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا' کراچی میں ارباب غلام رحیم کو ایک جوتا اور ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو لاہور میں دو تھپڑ پڑے تھے اور سیاست اور اقتدار کے سارے ایوان تھپڑوں اور جوتے سے گونج اٹھے تھے' قومی اسمبلی تک میں اس واقعے پر تعزیتی قرارداد پیش ہوئی تھی لیکن کراچی میں نو اپریل کے دن پندرہ لوگ مارے گئے اور ان پندرہ لوگوں میں چھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جنہیں زندہ جلا دیا گیا تھا لیکن ان پندرہ لوگوں کیلئے کسی سیاستدان' کسی حکمران اور معاشرے کے کسی گروپ کے احساس نے آنکھ نہیں کھولی' کیوں؟ کیونکہ یہ معصوم' بے گناہ اور عام لوگ تھے اور اس ملک میں قانون' انصاف اور احساس صرف اور صرف ڈاکٹر شیر افگن نیازی اور ڈاکٹر ارباب غلام رحیم جیسے لوگوں کیلئے مختص ہے' ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے اگر نو اپریل کے واقعے میں کسی جج' کسی جرنیل' کسی سیکرٹری اور کسی بڑے سیاستدان کا بھائی یا بیٹا جل گیا ہوتا تو کیا ہمارے حکمرانوں کا یہی رویہ ہوتا؟ یہ کیا دلچسپ ملک ہے اس میں 12 مئی 2007ء کو کراچی میں 52 لوگ مارے گئے تھے اور اس میں 22 کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ تھا' اس میں 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں پیپلز پارٹی کے ڈیڑھ سو ورکر جاں بحق اور چار سو زخمی ہو گئے لیکن ان کیلئے ایک ایف آئی آر کے سوا کوئی کارروائی نہیں ہوئی جبکہ 27 دسمبر کو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہوئیں تو ان کے قتل کی تحقیقات کیلئے اقوام متحدہ کی ٹیم بلائی جا رہی ہے؟ کیا اس ملک میں تحقیقات کیلئے بینظیر بھٹو ہونا ضروری ہے اور کیا اس ملک میں صرف بے نظیر بھٹو کے لواحقین انصاف کے حق دار ہیں؟ آئیے ہم آج 15 اپریل کے دن میں بیٹھ کر نو اپریل کی معصوم نعشوں کے بارے میں سوچیں اور اپنے ضمیر سے یہ سوال کریں" جس ملک میں انصاف آنکھ کھولنے سے قبل مقتول کا سماجی رتبہ دیکھتا ہو کیا اس ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہونا چاہیے؟ آئیے ہم صوبہ سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستان کا نام بھی بدل دیں' ہم اسے بے حس ستان' ظلم ستان یا بے انصاف ستان قرار دے دیں"۔

لیکن ایک منٹ رکیئے اور ایک لمحے کیلئے فرض کیجئے' آپ بچے ہیں' آپ کی عمر سات سال' نو سال یا چودہ برس ہے اور آپ نو اپریل کی سہ پہر گراؤنڈ میں کھیل رہے ہیں' آپ سکول' کالج یا یونیورسٹی جانے والی بچی ہیں اور نو اپریل کی دوپہر آپ گود میں بیگ رکھ کر یونیورسٹی یا کالج کے لان میں بیٹھی ہیں' آپ ہاؤس وائف ہیں اور نو اپریل کی دوپہر آپ کچن میں کھانا بنا رہی ہیں' آپ پچاس برس کی بزرگ خاتون ہیں اور آپ نو اپریل کو دو بج کر دس منٹ پر اپنے صحن میں سلائی مشین پر کپڑے سی رہی ہیں' آپ 65 برس کے باریش بزرگ ہیں اور آپ نو اپریل کو ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے ہیں اور آپ جی ہاں آپ پچیس چھبیس برس کے نوجوان ہیں اور 9 اپریل کے پچھلے پہر آپ بازار میں چہل قدمی کر رہے ہیں اور فرض کیجئے اچانک آپ کے موبائل کی گھنٹی بجتی ہے' آپ لاپروائی سے فون آن کرتے ہیں اور دوسری طرف سے آپ کے چھوٹے بھائی کی گھبرائی' ڈری اور سہمی ہوئی آواز آتی ہے' وہ روتے ہوئے کہتا ہے "بھائی جان خدا کیلئے مجھے بچالیں' مجھے ان ظالموں نے کمرے میں بند کر کے آگ لگادی ہے' بھائی جان مجھے بچائیں اور آپ اسے مذاق سمجھتے ہیں اور بھائی کو ڈانٹ کر کہتے ہیں "بکواس بند کرو' میں پریشان ہو جاؤں گا" لیکن دوسری طرف سے آپ کے بھائی کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں' آپ کو معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے' آپ کا دل سینے کی بجائے کنپٹی میں دھڑکنے لگتا ہے اور آپ گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھتے ہیں "تم اس وقت کہاں ہو" وہ سسکیاں لیتی آواز میں بولتا ہے "میں سٹی کورٹ کے طاہر پلازے میں ہوں' میں کمرے میں بند ہوں اور پورے پلازے کو آگ لگی ہے' بھائی مجھے بچاؤ" آپ اسے کہتے ہو "تم فون بند نہ کرنا میں آرہا ہوں" اور اس کے بعد آپ پاگلوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

آپ فرض کیجئے آپ کا ایک پاؤں مسجد کے دروازے سے باہر ہے اور دوسرا اندر اچانک آپ کا فون بجتا ہے' آپ دل ہی دل میں کہتے ہیں کم بخت لوگ نماز بھی پڑھنے نہیں دیتے اور ٹھنڈے اور اکھڑے لہجے میں ہیلو کہتے ہیں اور دوسری طرف آپ کا لخت جگر چلا کر کہتا ہے "ابو میں طاہر پلازے میں وکیل کے دفتر میں تھا' لوگوں نے مجھے دفتر میں بند کر کے آگ لگادی ہے' ابو مجھے بچاؤ' میں مرنے لگا ہوں" آپ یہ سن کر مسجد کی دہلیز پر گر جاتے ہیں اور چند لمحوں کیلئے آپ کی تمام سدھ بدھ ختم ہو جاتی ہے' آپ کو ہوش آتا ہے تو آپ دیوانہ وار طاہر پلازے کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' یہ سوچے اور سمجھے بغیر کہ طاہر پلازہ وہاں سے پندرہ کلومیٹر دور ہے اور راستے میں اندھا دھند فائرنگ ہو رہی ہے"۔

فرض کیجئے آپ سلائی مشین کا پیڈل گھماتی ہیں اور مشین کی ٹک ٹک' دھک دھک کے دوران آپ کا فون بجتا ہے' آپ کام کرنے والی لڑکی سے کہتی ہیں "گلزاری مجھے ذرا فون تو لادو" فون بجتا رہتا ہے اور گلزاری فون تلاش کرتی رہتی ہے' اس دوران فون بج بج کر خاموش ہو جاتا ہے' آپ دوبارہ مشین چلانے میں مصروف ہو جاتی ہیں' تھوڑی دیر بعد فون دوبارہ بجتا ہے' آپ گلزاری کو آواز دیتی ہیں لیکن اس وقت تک گلزاری باتھ روم میں گھس چکی ہوتی ہے' آپ اسے گالیاں اور بددعائیں دیتی ہوئی اٹھتی ہیں اور فون کی تلاش شروع کر دیتی ہیں' فون دلان کی چوکی پر بجتا ہوا محسوس ہوتا ہے' آپ چوکی پر پڑی چیزیں دائیں بائیں کرتی ہیں' فون بج رہا ہے' آپ تکیہ اٹھاتی ہیں تو آپ کو موبائل فون تکیے کے نیچے چمکتا اور جلتا ہوا مل جاتا ہے' آپ فون اٹھاتی ہیں لیکن آپ کے ہیلو کہنے سے پہلے ہی فون بند ہو جاتا ہے' آپ مِسڈ کالز دیکھتی ہیں' آپ کو فون پر اپنے اکلوتے بیٹے کی دو مِسڈ کالز ملتی ہیں' آپ سوچتی ہیں' وہ وکیل کے دفتر میں بیٹھا ہے یقیناً اس نے آپ سے کوئی ضروری بات پوچھنی ہوگی' آپ اس کے نمبر پر فون کرتی ہیں لیکن آپ کے فون سے یہ پیغام نشر ہوتا ہے کہ آپ کے پاس مطلوبہ کال کیلئے کریڈٹ نہیں اور مہربانی فرما کر آپ اپنا فون ری چارج کیجئے اور آپ موبائل فون کمپنی کو صلواتیں سنانے لگتی ہیں' اسی دوران آپ کا فون دوبارہ بجتا ہے' آپ اٹھاتی ہیں تو دوسری طرف آپ کی بیٹی ہے وہ آپ سے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھتی ہے "اماں بھائی کہاں ہے" آپ اسے بتاتی ہیں "وہ وکیل کے پاس گیا ہے" آپ کی بیٹی روتے ہوئے کہتی ہے "اماں لوگوں نے سٹی کورٹ میں ہمارے وکیل کے دفتر کو آگ لگادی ہے' بھائی کا پتہ کرو" آپ فون پھینکتی ہیں اور ننگے پاؤں' ننگے سر گلی میں بھاگ کھڑی ہوتی ہیں' اس لمحے آپ کی آنکھوں میں برسات اور گلے میں سیلاب ہے اور آپ دیوانہ وار گلیوں میں بھاگتی چلی جا رہی ہیں۔

آپ فرض کیجئے آپ ہانڈی میں چمچ ہلاتی ہیں' آپ کا فون بجتا ہے' آپ گنگناتے ہوئے فون اٹھاتی ہیں' دوسری طرف آپ کا خاوند ہے' آپ اس کی بات سنے بغیر کہتی ہیں "جانو میں نے کھانا بنالیا ہے تم دو بجے تک گھر پہنچ

جانا" آپ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوتی کہ دوسری طرف سے چلانے کی آوازیں آتی ہیں' آپ کا خاوند چیختے ہوئے کہتا ہے "نیلم میرے پورے جسم کو آگ لگ چکی ہے' خدا کیلئے مجھے بچاؤ" آپ کا سانس اکھڑ جاتا ہے اور آپ اس سے پوچھتی ہیں "آپ کہاں ہو' وہ سسکیاں لیتے ہوئے بتاتا ہے' طاہر پلازے میں" اور آپ ہانڈی چولہے پر چھوڑ کر باہر کی طرف دوڑ پڑتی ہیں' آپ گھر کا دروازہ تک بند کرنا بھول جاتی ہیں۔

آپ فرض کیجئے آپ یونیورسٹی یا کالج کے لان میں بیٹھ کر چاکلیٹ نکالتی ہیں' اس کے ریپر کا کونا پھاڑتی ہیں' چاکلیٹ کے نچلے سرے پر انگوٹھا رکھ کر اسے ذرا سا دباتی ہیں' چاکلیٹ کا ایک کونا باہر نکل آتا ہے اور آپ اس کونے کو دانتوں میں دبا لیتی ہیں' ٹھیک اس لمحے آپ کا موبائل بجتا ہے' آپ ایک ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑتی ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بیگ کی زپ کھولتی ہیں' آپ کے موبائل پر "پاپا" کا لفظ جلتا بجھتا دکھائی دیتا ہے' آپ خوشی سے فون اٹھاتی ہیں اور زور سے بولتی ہیں "پاپا مجھے ٹھیک تین بجے لینا ہے' کوئی بہانہ نہیں" اور دوسری طرف سسکیوں اور چیخوں کی آوازیں آتی ہیں' آپ کے ہاتھ سے چاکلیٹ گر جاتا ہے اور آپ ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھتی ہیں "پاپا کیا ہوا" آپ کے پاپا رکتی' تڑپتی اور جلتی بجھتی آواز میں بولتے ہیں "بیٹا میرے پورے جسم میں آگ لگی ہے' میں مر رہا ہوں' بیٹا میں آخری لمحے میں بس تمہاری آواز سننا چاہتا تھا' بیٹا اگر ممکن ہو تو یہ ملک چھوڑ کر کہیں چلی جانا" اور اس کے ساتھ ہی ایک لمبی سسکی کی آواز آتی ہے اور فون کٹ جاتا ہے' آپ اضطراری انداز میں اپنے بابا کا فون ڈائل کرتی ہیں لیکن دوسری طرف ٹیپ چل رہی ہے' آپ بینچ سے اٹھتی ہیں اور دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگ کھڑی ہوتی ہیں اور آپ جی ہاں آپ ابھی سات' نو یا چودہ برس کے بچے ہیں اور گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے ہیں' آپ کا موبائل پینٹ کی جیب میں ہے' آپ کا موبائل تھرانے لگتا ہے' آپ پاؤں سے فٹ بال کو کک مارتے ہیں' جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالتے اور سکرین دیکھے بغیر فون کان کے ساتھ لگا لیتے ہیں' دوسری طرف آپ کے ابو ہیں' آپ ان کی بات سنے بغیر کہتے ہیں "بابا میں نے چار گول کر دیئے" لیکن دوسری طرف سے کھڑکیاں' توڑنے' میزیں اور کرسیاں گرنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں' آپ کے پاؤں رک جاتے ہیں' آپ گراؤنڈ میں بیٹھ جاتے ہیں اور اونچی آواز میں چلاتے ہیں "بابا کیا ہوا' آپ خیریت سے تو ہیں" اور دوسری طرف سے "بچاؤ' بچاؤ' خدا کیلئے ہمیں بچاؤ' آپ کو اللہ کا واسطہ' آپ کو اپنے ماں باپ اور بچوں کا واسطہ مجھے باہر نکالو' میں جل رہا ہوں' خدا کیلئے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' مجھے باہر نکالوں" کی آوازیں آتی ہیں' آپ ہیلو بابا' ہیلو بابا کی دہائیاں دیتے ہیں لیکن آپ کا فون بند ہو جاتا ہے' آپ فون کو جھٹکتے ہیں لیکن پتہ چلتا ہے آپ کے فون کی بیٹری ڈیڈ ہو چکی ہے اور آپ بھی گراؤنڈ سے اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' آپ ابھی بچے ہیں اور آپ کو معلوم نہیں سٹی کورٹ کس سائیڈ پر ہے اور طاہر پلازہ کہاں ہے لیکن آپ یہ جانے بغیر دوڑ پڑتے ہیں۔

اور پھر دس اپریل کی صبح آتی ہے آپ کے سامنے چھ نعشیں پڑی ہیں' یہ چھ نعشیں جل کر کوئلہ ہو چکی ہیں اور آپ کیلئے ان میں سے اپنا بابا' اپنے ابو' اپنے خاوند' اپنے بیٹے اور اپنے لخت جگر کو پہچاننا ممکن نہیں' آپ اندازے سے ایک نعش اٹھاتے ہیں' آپ جنازہ پڑھتے ہیں اور اس نعش کو دفن کر دیتے ہیں' آپ قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتے ہیں لیکن آپ کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ آپ نے اس قبر میں جس مردے کو دفن کیا ہے وہ واقعی آپ کا بیٹا' خاوند یا والد ہے' اس وقت آپ کے دل سے بد دعا نکلتی ہے' آپ اللہ سے گڑگڑا کر فریاد کرتے ہیں یا باری تعالیٰ تو ہمارے مجرموں کو بھی ایسی ہی موت دے......... مجھے نہیں معلوم ایسی بد دعاؤں پر اللہ تعالیٰ کا کیا رد عمل ہوتا ہے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے ایسی بد دعاؤں پر اللہ تعالیٰ شاید یہی کہتا ہو گا "جو لوگ بے حس ہوں انہیں کسی دوسری موت کی ضرورت نہیں ہوتی" شاید اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہو گا "انسان اس وقت مرتا ہے جب اس کی سانس بند ہوتی ہے لیکن معاشرے اس وقت موت کا شکار ہوتے ہیں جب ان میں احساس مر جاتا ہے اور میں بے حس معاشروں پر موت بھجوا کر اپنی موت کی توہین نہیں کیا کرتا"۔